

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222207

UNIVERSAL
LIBRARY

۱۵۴۴۶
۱۱۱۱۱۱۱۱

۸۹۱۵۴۳۳۴
شش

سات

Rahmossini

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۴۳۴۴ Accession No. ۱۴۴۴۴
Author شمس
Title سات مار

This book should be returned on or before the date
last marked below.

۱۹۵۴ء

طبع دوم

قیمت ۷

مکتبہ اسلامیہ

1975

فہرست مضامین

نمبر شمار	اسانہ	افسانہ نگار	نمبر صفحہ
۱	پیش لفظ ..	جناب شاہد احمد صاحب بی لے (آرزو، مدیر ساقی)	۴
۲	پلاٹ ..	ناشر ..	۶
۳	رام لہائی ..	جناب ایم۔ اسلم ..	۸
۴	فطرت کے دوزادے ..	جناب قیسی رام پوری ..	۱۱
۵	خوابوں کی سنی اور حقیقت کی نینا	جناب شاہد احمد صاحب بی لے (آرزو، مدیر ساقی)	۱۶
۶	خواب اور اس کی تعبیر ..	جناب انصار نامری بی لے ایل ایل بی دہلوی	۱۳۲
۷	حجاب زندگی ..	جناب فضل حق قریشی دہلوی ..	۱۸۱
۸	تسخیر حیات ..	جناب اشرف صبور دہلوی ..	۲۲۷
۹	جسکے ..	جناب میدا بوطا ہر داؤد دہلوی، ایس سی (کشمیر)	۲۲۷

۱۷۷۷۷۷

پیش لفظ

ایک قصبہ میں نیست غمِ عشقِ دایں عجب ۛ از ہر کے کہ می شنوی نامکر راست
سات افسانہ نگاروں نے ایک ہی پلاٹ پر افسانے لکھے ہیں۔ آپ اس
اعلان کو پڑھ کر شاید چونکیں گے اور بعض حضرات اسے مذاق سمجھیں گے اس
لئے یہ امر وضاحت چاہتا ہے یہ پلاٹ جناب فضل حق قریشی نے تجویز کیا ہے
اور کئی لحاظ سے لائقِ تائید ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس
میں سجدہ لوح اور لچک ہے۔ ہر افسانہ نگار اس پلاٹ پر اپنے نظریہ کے مطابق
ایک عمدہ افسانہ لکھ سکتا ہے۔ ذرا دقائق پر ایک سرسری نظر ڈال لیجئے۔
ایک مرد اور ایک عورت میں سلسلہ مراسلت قائم ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں ایک
دوسرے سے نا آشنا ہیں۔ خطوط سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر ایک عورت
سے اس مرد کا واسطہ پڑتا ہے اور اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ شادی کر لیتا ہے
سابقہ خط و کتابت ختم ہو جاتی ہے اور اپنی تامل کی زندگی میں سرور رہتا ہے پھر
کچھ ناچاتی پیدا ہو جاتی ہے اور ناخوش ہو جاتا ہے پہلی خط و کتابت کا سلسلہ پھر
قائم کرتا ہے یہاں تک کہ ایک اتفاقیہ واقعہ سے یہ مجید کھلتا ہے کہ میاں بیوی
ہر ایک دوسرے کو خط لکھ رہے ہیں یہ فنی دشواریاں بیک نظر افسانہ نگار کو نظر
آ جاتی ہیں۔ مگر فن کاروں کے لئے سوانح ہی سوانح بن جاتے ہیں کسی چیز کی

مشکلات ہی اسے ممکن ہیں ٹھہراتی ہیں رباعی کے چار مصرعوں میں ایک پوری بات کہنی آپ کو مشکل نظر آتی ہے مگر آپ رباعی چار مصرعوں سے زیادہ کی نہیں کہہ سکتے۔ اس پلاٹ میں دو آدمی ایسے دکھائے گئے ہیں جو ایک دوسرے کو خطوط لکھتے رہتے ہیں اور جب یہ دونوں یکجا ہوتے ہیں تو انھیں علم نہیں ہوتا کہ ان میں پہلے خط و کتابت ہو چکی ہے۔ کامیاب افسانہ نگار اس ناممکن سی بات کو ممکن کر دکھائے گا۔ ممکن ہی نہیں بلکہ یقینی ثابت کر دے گا اور اس خوبی کے ساتھ کہ پڑھنے والا انھیں حقائق تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے دو لہا دلہن کی زندگی کا مذکور نہیں یہ تو ایک چھوٹا سا رنگین خواب ہوتا ہے میاں بیوی کی زندگی میں اکثر شکر و بختیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کھانے پینے میں سودے سلف میں کہیں آنے جانے میں غصہ بیکاروں باتیں آنے لگیں ایسی ہوتی رہتی ہیں کہ ناگوار خاطر گذریں اور اپنی کے بڑھنے سے کشیدگی کی لہر آجاتی ہے۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے جب انسان خوشگوار باطنی کرب اور کمرے کے عجز رفتہ کو آواز دیتا ہے۔ پلاٹ کی خوبی یہاں نظر آتی ہے۔ ہر اس خط و نکل پر ہیں۔ روان کی سنہری دنیا میں نخل پھر پہنچ جاتا ہے۔ خواب پھر جگائے جاتے ہیں۔ ایک طرف حقیقت کی دنیا ہے اور دوسری طرف خوابوں کی بستی۔ کیا یہ خواب حقیقت کو زائل کر دیں گے؟

جب انکشاف حقیقت ہوتا ہے تو کیا گزری ہوئی بہاریں پھر لوٹا آتی ہیں؟ یا خزاں رسیدہ چمنستان حیات اور بھی اجاڑ ہو جاتا ہے؟ کیا حقیقت خواب کو برباد کر دے گی؟ اور اس بربادی کے نتائج کیا ہوں گے؟ ان سوالات کا جواب ہر افسانہ نگار کے دیلے ہے۔

اس مجموعہ میں بعض افسانے مزاحیہ رنگ لگائے گئے ہیں۔ بعض ہنس

سجیدہ پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ بعض میں شاعرانہ ادب نظر آئیگا اور بعض میں
 آپ زبان کا چننا رہ پائیں گے۔ پلاٹ ایک ہی ہے مگر ہر انسانہ آپ کو نیا
 نظر آئے گا۔ یا یوں سمجھئے کہ روح ایک ہی ہے جو مختلف قالبوں میں داخل
 گئی ہے۔ ہر عمارت میں ایک ہی سا سالہ ہے۔ وہی چوننا، اینٹ، پتھر
 گڑی وغیرہ مگر مہمار کی کاریگری دہروری سے عمارت کچھ سے کچھ بن جاتی
 ہے۔ ہر انسانہ نگار نے چاہک دست مہمار کی طرح ایک ہی پلاٹ کی بنیاد
 پر انسانہ کی عمارت نئی وضع قطع اور نرالے ڈھنگ سے تعمیر کی ہے ۵

یگانگت کا یہ عالم کہ اصل سب کی ایک
 تضاد یہ کہ جدا نشان ہر فسانے کی

شاہد احمد

پلاٹ

- ایک شخص ————— غیر متعارف خاتون سے خط و کتابت —
- رومانی فضا اور دل بستگی — ایک حسینہ سے تعارف — محبت —
- ازدواج ————— سرت دامنہاٹ ————— شکر رنجیاں — کشیدگی —
- بیزاری ————— ایام گزشتہ کی یاد ————— سابقہ مراسلت کی تجدید —
- تحصیل سکون ————— اتفاقیہ طور پر انکشاف حقیقت —————
- مراسلہ بگوار خاتون کی اصل شخصیت ؟ شریک حیات ————— !! —

رام کہانی

سبزے کے فرشِ زمردی پر جہانیاں جہاں گشت بہرام چائے کی پیالی
سلنے رکھے کہنی کے نیچے چمڑے کا ایک بیگ و باہنے خاموش بیٹھا تھا ایک
طرف نوگس اور طاؤس بیٹھے مزے مزے سے چائے پی رہے تھے۔
اور گاہے گاہے ایک دوسرے کی طرف مسکرا سکر کر دیکھ بھی لیتے۔

بہار کا موسم تھا اور ٹلگونے جو بن پر تھے۔ انار کے پھولوں کی لالی پر خون
شہیداں کا دھوکا ہوتا تھا۔ شاخ سبیل پر قمریاں بیٹھی اپنی کوکوسے فضا میں ایک
اداسی کا عالم پیدا کر رہی تھیں۔ جنوب مغرب کی جانب نور شہید غامدی کی چمک
ناپاتی کے پیڑوں میں سے کچھ اس طرح چھن چھن کر آرہی تھی جیسے کسی نے منقش
اور بادلہ کی جھار شاخوں اور پتوں میں ڈال رکھی ہو۔ مشرق کی جانب آم کے درختوں
کے نیچے رستہ چل رہا تھا۔ جس کی آواز کا ہر کیف فیروزہ اور پر سوز ترنم بزمِ آستانِ محبت

کو کسی اور ہی عالم میں لئے جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی کسی پیڑ پر سے پھلے پھر کی کوئل کی کوک سے خواہ مخواہ آنکھیں بھرتی تھیں۔

بڑے بہرام نے ایک لباس لیا اور پیالی منہ سے اٹھا کر لگائی۔ نرگس جس کا حسن و جمال موسم بہار کے پھولوں کو شرماتا تھا۔ ہنس کر بولی: "کس خیال میں میں بہرام جی آپ؟"

بہرام نے پیالی گھاس پر رکھ دی اور بولا: "یہ بہار کا موسم بھی کیا مزے کا موسم ہے؟ طاؤس کی طرت دیکھ کر یہ کیوں طاؤس تمہارا کیا خیال ہے؟" طاؤس نے مسکرا کر جواب دیا: بہرام جی! موسم میں کیا رکھا ہے۔ سچ تو یہ کہ عورت کی محبت خزاں کو بھی بہار بنادیتی ہے۔

"سچ کہتے ہو؟" بڑھا بہرام بولا: "جس کی رفیق حیات نرگس ہو وہ خزاں کے مظالم کیا جانے؟"

تب ہی تو کہتی ہوں! نرگس بولی "آپ شادی کر لیں۔"

"شادی کر لوں؟" بہرام نے سر ہلا کر کہا: "میں موت کی راہ دیکھتا ہوں اور نرگس تم مجھے شادی کرنے کو کہتی ہو۔ شادی کئے بھی دیکھ چکا اور جو سچ پوچھو تو مجھے تو افسوس ہے کہ میں نے شادی کی ہی کیوں۔ نہ شادی ہوتی نہ یہ چرکے گتے۔ نرگس! جینا اسی کا نام ہے جسے آخری وقت میں اپنی رفیق حیات کا سہارا ہو دور کیوں جاؤ۔ مجھے ہی دیکھ لو نا۔ نگہ نہ گھاٹ آج یہاں پڑا ہوں کل کہیں اور جا ڈیرا لگائوں گا۔ موت تو....."

"بس میں نہیں سنتی؟" نرگس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "مجھے یہ خشک زاہدوں کی سی انہیں قلمی پسند نہیں۔"

”ہاں ٹھیک ہے!“ طاؤس نے کہا۔ ”وقت کی راگنی ہی بلی گنتی ہے۔“
اور بوڑھا بہرام ایک آہ بھر کر بولا ”سچ ہے بہار کے موسم میں خزاں کا کیا ذکر؟“



کچھ دیر تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ آخر نرگس بولی ”بہرام جی! عرصہ ہوا کہ آپ نے ایک واقعہ سنایا تھا۔ وہی ”درتوبہ“ والا قصہ یاد ہے نا۔ اب دیکھئے مسکرائے نہیں۔ قسم لے لیجئے جب کبھی وہ واقعہ یاد آتا ہے تو طبیعت پر ایک چرک سا لگتا ہے خیر! وہ تو جگ بیتی تھی آج حسب وعدہ آپ بیتی سنا دیجئے اس ٹیک میں جو خطوط آپ ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں یا تو یہ میرے حوالے کیجئے یا یہ بتائیے کہ یہ کس کے خط ہیں۔“

”نرگس! بہرام بولا۔ ”کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔“

”چلو میں کچھ ہی سہی۔“ نرگس نے کہا۔ ”لیکن سن لیجئے بچے بہت ضدی ہوتے ہیں، تو آج جب تک آپ سے سن نہ لوں گی نہ خود یہاں سے اٹھوں گی اور نہ آپ کو جانے دوں گی۔ سن لیا نا آپ نے؟“

”لیجئے حضرت! طاؤس نے منہ کر کہا۔ ”بس اعلان جنگ ہو گیا۔“

”نرگس تو پاگل ہے۔“ بہرام نے مسکرا کر کہا۔

”جی ہاں! نرگس بولی۔ ”جو ہٹ کا پتا ہو وہ پاگل ہی تو ہوتا ہے۔“

”نوگو یا!“ طاؤس نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تو آج تم یہ سلوم

کر کے ہجرا ہو گی کہ بہرام جی نے بیگ میں کس کے خطرہ جھوڑے میں اور وہ جو سنا چلے کا ارادہ تھا؟“

”جہاز میں جاے سینما۔“ نرگس نے تڑن کر جواب دیا۔ ”بہرام کی طرف

”کچھ کہہ“ ہاں بہرام جی پچھ کیا تھا؟“

”نرگس تم میری سرگزشت سن کر کیا کرو گی۔ کہو تو کوئی اور کہانی سنا دوں۔“
 ”جی نہیں!“ نرگس نے بہرام کی پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے
 جواب دیا۔

پھر طاؤس بولا۔ ”دیکھیں آج کس کی جیت ہوئی ہے۔ نرگس بھی ہسٹ
 کی پکتی ہے اور بہرام جی بھی صند کے پورے ہیں۔“
 ”تم بھی تو صند کے بڑے پچے بنا کرتے ہو۔“ نرگس نے خاوند کی طرف
 دیکھ کر ایک آواز انداز سے پوچھا ”پھر جیت کس کی ہوئی ہے؟“
 پھر بہرام کی طرف دیکھ کر ”جی! پھر کیا ہوا؟“
 بہرام جو قمریوں کی کوکو پر کان لگائے بیٹھا تھا مسکرایا اور نرگس کی طرف
 دیکھ کر بولا ”نرگس! تم اپنے مصرا ب شوق کے تاروں سے میری زندگی کے
 رباب کے ان تاروں کو پھیر رہی ہو جن کے نغموں سے تمہارے انگ بھرے
 دل کو ٹھیس سی لگے گی۔ لو میں تمہیں اپنی شادی کا قصہ سنا تا ہوں۔“

”نرگس! میں تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا۔ اور جوان تھا اور بیشتر وقت
 مختلف رسائل کے لئے مضامین لکھنے میں گذرتا۔ میں فرضی نام سے اپنے
 افسانے شائع کروا کر تا۔ ایک مدت سے میں دیکھ رہا تھا کہ اب جنس لطیف
 بھی مضنون نگاری کے میدان میں اتر رہی ہے۔ لیکن اللہ جانے اکثر لڑکیوں
 کی تحریر سے مجھے آنے لگتی ہے دو ایک چوٹی کے رسالوں میں ’شمشاد‘ کے
 نام سے بھی گاہے گاہے کوئی افسانہ شائع ہوا کرتا تھا اور سچ جانے کہ
 شمشاد کے افسانے پڑھ کر بہت لطف آتا تھا شمشاد کے افسانے کی فضا میں ایک
 رومانیت ہوتی تھی۔ وہ جذبات کا ایک ایسا مدو جز رہا کر دی کہ پڑھنے

دالوں کا دل یا کم از کم میرا دل اس کشتی کی طرح ہچکولے کھانے لگتا جو متلاطم سطح آب پر جاری ہو۔ عشق و محبت کی چاشنی تو شمشاد کے سبھی افسانوں میں ہوا کرتی۔ لیکن تحریک یہی سلجھی ہوئی ہوتی کہ پااں سے پااں مضمون میں بھی لطافت پیدا ہو جاتی اور چونکہ وہ ایک عورت تھی اس لئے قدرتی طور پر اس کے مضامین میں سنوائی جذبات، سنوائی انگلیں اور عورت کے فطرت کے مطابق پلاٹ میں سنوائی کمزوریاں بھی بکثرت موجود ہوتیں۔

لیکن میرے لئے افسانے کے علاوہ جو چیز شاید زیادہ جاذب توجہ تھی وہ اس لکھنے والی کا نام تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا وجہ تھی جو اکثر بیٹھے بیٹھے میں یہی پانچ حروف "س" "م" "ش" اور "د" مختلف طریق سے زبان سے ادا کرتا۔ کبھی ش اور م پر زور دیتا۔ کبھی ش اور الف کو لمبا کر کے زبان پر لاتا بہر کیف جس وقت "شمشاد" زبان پر آتا تو ساتھ ہی اس نام کی لطافت یا میرے زبان سے ادا کرنے کا نرم بھی دل میں ایک چٹنی لے لیتا۔

کسی بار ارادہ کیا کہ ایڈیٹر سے شمشاد کا پتہ معلوم کر دوں۔ لیکن ہمت نہ پڑی کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جذب الفت قائم ہو تو اس کی تاثیر سب عقدے واکردیتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک روز میں مختلف رسائل جو ڈاک پہ بھی لایا تھا، دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک سنوائی رسالہ کی فہرست مضامین میں میری نگاہ پھر اسی "پیارے" نام شمشاد پر پڑی اور صمت نے یاد دہانی کی کہ رسالے کے مدیر یادیرہ نے شمشاد کے مضمون کے شروع میں تعارفی طور پر جو چند سطور بھی تھیں ان میں اس شہر کا نام بھی لکھ دیا تھا جہاں اسکی بود و باش تھی۔

میں اسی وقت اسے خط لکھنے بیٹھ گیا۔ سب سے بڑی مشکل یہ آپری کہ

الغاب کیا لکھوں، مس شمشاد مجھے کچھ پسند نہ تھا " محترمہ " کچھ ثقیل سا لفظ تھا " شمشاد " اس طرح مخاطب کرنے کا بھلا مجھے حق کہاں " شمشاد صاحبہ اس میں کچھ کاروباری بو آتی تھی مگر ڈیر شمشاد " تو یہ ہے! کیا ابھی سے۔ انہیں کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ خیر ارادہ کیا کہ پہلے خط تو لکھوں، الغاب بعد میں دیکھے جائیگے گو میرا رد و کا خط کچھ ایسا اچھا لڑنہ تھا۔ تاہم میں دو تین مختلف طریق سے خط لکھ سکتا تھا اور چونکہ اپنے مضامین بہرام کے فرضی نام سے شائع کرتا تھا اس لئے یہ احتیاط بھی ضرور کرتا کہ کوئی شناسا میرا خط بھی نہ پہچانے لیکن آپ مشہور تو اسی نام سے ہوئے " طاؤس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

نرگس نے خاوند کی طرف تیوری چڑھا کر دیکھا اور کہا " مجھے یہ دخل در معقولات پسند نہیں۔ بس اب بیچ میں نہ بولنا تم " " تو یہ ہے! " طاؤس نے سن کر کہا " ع۔ یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تری محفل میں "۔

" ہاں بہرام جی! " نرگس نے بوڑھے بہرام کی طرف جو ذرا مسکرا کر ان دونوں میاں بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا کہا " پھر آپ نے کیا لکھا؟ " بوڑھے بہرام نے چمڑے کے بیگ میں سے ایک خط دیکھ بھال کر کہا " اور کہا " لو سن لو یہ پہلا خط ہے "۔

" میں اکثر مسائل میں آپ کے مضامین دیکھتا رہتا ہوں اور بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا طرز تحریر بہت دلنہدیر ہے۔ آپ کے اکثر افسانوں کے پلاٹ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے ان میں مغزیت کی جو ایک جھلک سی نظر آتی ہو نہیں

تعلیم سناؤں کے متعلق جو مضمون آپ نے لکھ لیا، یقیناً جانے اسے دیکھ کر تو میں حیران ہی رہ گیا۔ میں آپ کی جرأت کی داد دیتا ہوں۔ واقعی اس قسم کے خیالات کے اظہار کے لئے ہمت اور حوصلہ درکار ہے۔

گو مجھے آپ کے محلے یا کوچے کا نام معلوم نہیں۔ لیکن محض اس خیال سے کہ آپ کا نام ہی کافی ہے۔ یہ خط آپ کا اور آپ کے شہر کا نام لکھ کر ڈال رہا ہوں۔ اگر رسید ملی تو جانوں گا کہ خط منزل مقصود پر جا پہنچا۔

خیر طلب

بہرامؑ

”لیکن آپ نے انقلاب کیا لکھے؟“ نرگس نے پوچھا۔
طاؤس نے کہا: ”شمشاد صاحبہ“ لکھ دیا ہو گا۔ ٹھیک ہے نا بہرام جی“
نرگس تیوری چڑھا کر بولی: ”چپ نہیں رہو گے تم؟“
طاؤس نے ہنس کر کہا: ”جو تم بولو گی تو میں بھی بولوں گا۔ ٹھیک ہے نا بہرام جی؟“

”بھئی!“ بوڑھے بہرام نے کہا ”تم آپس ہی میں سپٹ لو۔“
نرگس نے گرم گرم چائے ایک پیالی میں ڈالی اور خاندان کی طرف دیکھ کر کہا: ”لو اب بولن تم۔ جو یہ گرم گرم چائے نہ ڈال دی ہو تم پر۔“
طاؤس نے بناوٹ سے اکیڑاؤ بھر کر کہا: ”تو یہ ہے۔ عہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زبان میری۔“
نرگس نے طاؤس کی کلائی میں زور سے چٹکی لی اور کہا: ”باز نہیں

آؤ گئے تم؟

”ارے چوڑو“ طاؤس نے کہا ”اب نہ بولوں گا“
 بوڑھا بہرام زیر لب مسکرا رہا تھا۔

”اب آپ بھی بولیں گے یا نہیں؟“ نرگس نے پوچھا۔
 ”نرگس!“ بہرام کہنے لگا ”اقاب کے انتخاب میں واقعی بڑی دقت
 پڑی۔ بہر کیف مس شمشاد سے بہتر اور کوئی اقباب نہ سوچا۔ اب میں جواب
 کا انتظار کرنے لگا۔ سارا سارا دن ڈاکہ کی راہ دیکھتا۔ آخر خدا خدا
 کر کے جواب آیا۔“

اتنا کہہ کر بہرام نے پھر اس بیگ میں سے ایک خط نکالا اور کہا۔
 ”سو سنو یہ جواب ہے۔“

”ستر بہرام!“

آپ کے گرامی نامہ کا شکریہ!

میں تو اس سر زمین میں بالکل نوازد
 ہوں ہاں اگر آپ جیسے ادیب نے سید ہی راہ پر ڈال دیا تو شائد
 کبھی منزل تک جا ہی پہنچوں۔
 میں اپنی قسمت پر نازاں ہوں کہ ملک کا مشہور انشا پرداز میرے
 مضامین پسند کرتا ہے۔ میں کیا اور میری بساط کیا۔ میں تو آپ کی
 ہی خوشہ چیں ہوں۔ بہر کیف آپ کے حوصلہ افزا الفاظ
 کے لئے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

طالب توجہ
 شمشاد

سن یا زنگست! بہرام نے خط بگ میں رکھتے ہوئے کہا: "یہ تھا میرے خط کا جواب میں نے اس خط کو کسی ہار پڑھا۔ شوق سے کہہ لو یا محض اس لئے کہ مزید خط بکسے کی بجائے اس میں کوئی راہ نظر آئے۔ ایک اشارہ نہ ضرور تھا خیر! کئی روز گزر گئے۔ نہ میں نے خط لکھا نہ ادھر سے کوئی خط آیا۔ اسی اثنا میں میرا ایک انسانہ ایک مشہور رسالے میں شائع ہوا۔ اس کے شائع ہونے کے پانچ سات روز بعد مجھے "نمشاد" کا دوسرا خط ملا۔ القاب دہی سٹر بہرام تھا۔ کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انسانے کے متعلق جو لکھا تھا وہ تھیں پڑھ کر سناتا ہوں۔

بہرام نے قیصے میں سے ایک اور خط نکالا اور پڑھنے لگا۔
 معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے عورت کی فطرت کا جو مطالعہ کیا ہے۔ لیکن میں ایک بات نہیں سمجھ سکی۔ عورت خواہ عصمت فروش ہی کیوں نہ ہو۔ آخر اس کے پہلو میں بھی تو ایک تڑپنے تڑپانے والا دل ہوتا ہے۔ لیکن آپ کے افسانے سے تو میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ ایک پیشہ ور عورت اس جوہر سے محروم ہوتی ہے۔ دل تو اس کے پاس بھی ہوتا ہے۔ لیکن ڈھی بھول آپ کے "پتھر کا ٹکڑا"!

سوال یہ ہے کہ اگر کسی عورت کو کسی مرد سے تھوڑی سی بھی محبت ہو پھر اس کا دل یوں کیسے کورا ہو سکتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ درجنت کی کلید محبت ہے۔ اس سے پہلے آپ لکھ چکے کہ محبت کو زوال نہیں۔ تو پھر میں حیران ہوں کہ عورت "عصمت فروش" ہی تھی۔ لیکن وہ ایک مرد سے جس سے

اس کا چند روزہ تعلق رہ چکا ہوا تھی بے مروتی کیسے کر سکتی ہو
کیسے آنکھیں پھیر سکتی ہے۔ ہاں! جب آپ کا یہ مطلب ہو کہ
جب عورت عصمت فردوسی کا پیشہ اختیار کر لیتی ہے تو پھر وہ
”عورت“ ہی نہیں رہتی۔ بہر کیف آپ کا یہ انسانہ اس قدر
پر لطف ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی میری طبیعت ابھی تک
سیر نہیں ہوئی۔“

بہرام نے خط پھر بیگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تمنا دے جو بحث
چھیڑ دی تھی۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک اور صورت اختیار کر لی
اب دونوں جانب سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ”تمنا دے“ کے
خط زیادہ طویل ہوتے ہیں وہ ایسی باتیں بھی لکھ دیتی جن کے کہنے کا بے
حوصلہ نہ پڑتا۔ بعض باتوں میں اس کا استدلال اتنا قوی ہوتا کہ مجھ پر
کچھ جواب نہ بن پڑتا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا خط و کتابت میں کچھ بے تکلفی
کا عنصر بھی موجود ہو گیا اور وہ رسمی حجاب جو ابھی تک قائم تھا بالکل مفقود ہو
گیا۔ اس کے ایک خط کے جواب میں میں نے لکھا :-

بہرام نے بیگ میں سے ایک اور خط نکالا اور پڑھنے لگا :-
تمنا دے!

شباب کی مثال تو گرمیوں کے اس دن کی طرح ہے جب
آسمان پر ہلکا ہلکا ابر چھایا ہو اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو۔ جب
بادل پھٹے اور سورج نکلا تو وہ کیف بھی جاتا رہا۔
محبت کی مملکت میں ”امتیاز“ نہیں ہوتا۔ نہ رنگ و بو، نہ ”ماؤ تو“
کا۔ محبت کی غذا بھی محبت ہے اور یہ آنکھیں ملنے سے پیدا ہوتی ہے۔ تم جس

قدرِ محبت کو چھپاؤ وہ اسی قدر عریاں اور نمایاں ہوگی۔ محبت کی
ترجمان بھی آنہیں ہی ہوا کرتی ہیں۔ لیکن محبت آنکھ سے نہیں
دیکھتی بلکہ دل سے۔ یعنی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ زندگی
کی مثال تو ایک جام کی سی ہے اور محبت اس میں بادِ ناز
کی طرح مستور۔ محبت کا خواب اس قدر شیریں اور سہانا ہوتا ہے
کہ اس کی یاد بھلائے سے نہیں بھولتی۔ اس کا نقش اگر دل پر ہو
جائے تو پھر مٹائے نہیں مٹتا۔

طاؤس نے نرگس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا "نرگس یہ ہے فلسفہ محبت
اب بھولناست"

پھر بہرام کی طرف دیکھ کر۔ "بہرام جی! یہ تو آج ہی معلوم ہوا کہ آپ کا دل
بھی چوٹ کھایا ہوا ہے"

اور نرگس جھٹکا کر بولی "اے خدا کے لئے چپ بھی رہو تم" پھر بہرام سے
"اور تمنا دے اس کا جواب کیا دیا؟"

"لو وہ بھی سنو" بوڑھے بہرام نے یہ کہہ کر بیگ میں سے تلاش
کر کے ایک اور خط بھلا لا :-

مستر بہرام !
فلسفہ محبت جس طرح آپ نے بیان کیا میں اس
سے بالکل نا آشنا نہ تھی میں اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے
تیار نہ تھی کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے لیکن اب اس حقیقت
سے آگاہ ہو چکی ہوں۔

آپ نے شباب کی مثال جس لطیف پیرایہ میں دی ہے

یقین جانے میری طبیعت پر اس کا بہت اثر ہوا۔ آپ کے خط کا وہ حصہ جس میں آپ نے فلسفہ محبت بیان فرمایا ہے میں نے کئی بار پڑھا اور بہت عوز کیا۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے اسی طرح یاد کروں جس طرح کبھی سبقت یاد کرتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ جس کی طبیعت دوسروں سے زیادہ حساس ہو وہ محبت کے جذبات سے اوروں کی نسبت زیادہ آشنا ہوتا ہے اور شاید زندگی کا لطف بھی کچھ اسے ہی حاصل ہو جو اس رمز سے آشنا ہو۔

بہرام تو خط بیگ میں ڈال رہا تھا۔ لیکن طاؤس اور نرگس دونوں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ہاں قمریوں کی کوکو اور رہٹ کی پر سونڈ آواز کچھ زندگی کا احساس پیدا کر رہی تھی اور مولے مولے آنسو پڑھ رہے بہرام کی آنکھوں سے ڈھلک کر اس کی برف سی سفید ریش پر گر کر چمک رہے تھے وہ ایک دو بار پھر کھانسا اور گھلا صاف کر کے کہنے لگا :-

نرگس! جاڑے جاچکے تھے اور بارشیں نہ ہونے کے باعث موسم کافی گرم ہو چلا تھا۔ جب کانچ میں تھا تو چھٹیوں کے دن کسی پہاڑ پر جا گزرتا۔ اب چونکہ فارغ تھا۔ اس لئے اپریل کے آخری ایام میں پہاڑ پر چلا گیا۔ جانے سے چند روز پہلے میں نے "ششاد" کو بھی اپنے ارادے کی اطلاع کر دی۔ لیکن میرے خط کا جواب کسی قدر مایوس کن تھا۔ کیونکہ اس نے لکھا تھا کہ وہ بھی عنقریب کسی پہاڑ پر جانے والی ہے اور چونکہ کہنے کے اکثر لوگ ہمراہ ہوں گے اس لئے خط و کتابت کا یہ سلسلہ عینہ دوہینے کے لئے مجبوراً بند رہے گا۔ کچھ احباب اس قسم کی باتوں کے تحت خلاف ہیں۔

خیر! مجھے پہاڑ پر آئے بہت روز ہو چکے تھے۔ یہاں سوائے سیر کے اور کام ہی کیا تھا۔ ایک پہاڑی کے گرد گرد کوئی تین میل لمبی سڑک تھی۔ اکثر لوگ اسی پر سیر کیا کرتے۔ دو چار آدمیوں سے میری شناسائی بھی ہو گئی۔ وقت مزے سے گزرتا تھا اس سڑک پر سب سے زیادہ جاذبِ نظر جو چیز نظر آتی وہ کوئلے بیچنے والی لڑکیاں تھیں۔ قدرت نے کیا حسن و جمال انھیں عطا کیا تھا۔

ایک روز میں سیر کرتا ہوا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں چسٹنٹ کے درخت تھے اور لب سڑک لکڑی کی ایک پنچ سی رکھی تھی۔ ذرا ستانے کو بیٹھ گیا میں آج اپنے تنگلے سے دیر سے نکلا تھا۔ بچے بیٹھے دس پندرہ منٹ ہوئے ہوں مگر کہ ایک بوڑھا آدمی اور ایک جوان لڑکی سیر کرتے ہوئے ادھر آئے۔ ان کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ نو وارد معلوم ہوتے تھے۔ یہ بوڑھا بھی سی پنچ پر بیٹھ گیا اور لڑکی چسٹنٹ کے درختوں کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔

یوڑھا تو خاموش بیٹھا مگر قدرت کا لطف اٹھا رہا تھا۔ لیکن لڑکی پھر مارا کر چسٹنٹ لکڑی کی کوشش کر رہی تھی کئی دنوں سے وہ ادھر سے ادھر لڑکی چسٹنٹوں تک پہنچا ہوا کوئی خطا کرتا تو گناہگار اس لڑکی کی طرف دزدیدہ تنگا ہوں سے دیکھ لیتا۔ کوئی آٹھارہ انیس برس کے قریب سن و سال تھا۔ سر و قد اور رنگی آنکھیں تھیں۔ سیر کے بال اس قدر لمبے کہ کمر سے نیچے لٹک رہے تھے۔ فیروزی رنگ کی ساڑی تھی اور چہرہ کندھ کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ پشندوں کے درختوں کے گرد اگر اس طرح ٹھوم رہی تھی جیسے موسمِ بہار کی تیتیری پھولوں کا طواف کر رہی ہو۔ بوڑھا بولا: "نوشابہ کیوں مفت میں تھک رہی ہو!"

"میں دو ایک تو توڑ کر ہی چھوڑوں گی" نوشابہ اپنی دھن میں لگی ہوئی

ہولی۔ ساتھ ہی سامنے کی جانب سے جو ایک پتھر اٹھا کر پھینکا تو وہ میرے گھٹنے پر آگٹا۔

”اوہو! معاف فرمائیے۔“ بوڑھے نے معذرت کے طور پر کہا۔

”کیا ہوا؟“ نوشاہہ نے وہیں سے کھڑے کھڑے اپنی سینٹی آواز

سے پوچھا۔

”پچھلی!“ بوڑھے نے کہا۔ ”دیکھ تو سہی تو نے ان صاحب کا گھٹنا پھوڑ دیا۔“

یہ سن کر نوشاہہ میرے سامنے آکھڑی ہوئی اور ہولی ”چوٹ تو نہیں

مئی! معاف کیجئے! بہت نادم ہوں!“

میں نے سن کر کہا ”فکر مست کیجئے۔“ میرا گھٹنا اتنا نازک نہیں کہ ایک

سنگریزہ لگنے سے زخمی ہو جائے۔“

”چوٹ تو ضرور آئی ہوگی۔“ اس حینہ نے پھر ایک بار اپنی دلکش آواز

سے کہا۔

”آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں۔“ میں نے کہا ”آپ کو کوئی چٹنٹ

بھی ملی۔“

بوڑھا بولا۔ ”یہ تو پچھلی ہوئی ہے کبھی چٹنٹس یوں بھی ٹوٹا کرتی ہیں۔“

”بھڑیے! میں توڑ دیتا ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں! نہیں!“ بوڑھا اور نوشاہہ دونوں بولے ”آپ تکلیف مت

کیجئے۔“

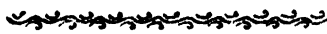
”تکلیف کیسی!“ کہتے ہوئے میں نے ادھر ادھر سے پتھر اٹھا کر پینہ

میں بڑی بڑی چٹنٹس توڑ دیں۔

”شکریہ!“ بوڑھے نے کہا۔

اور نوشاہہ بولی "ات تو بہ! بھلا اتنی میں کیا کروں گی؟"
 "چلو!" بوڑھے نے کہا "اب اٹھاؤ انہیں!"
 نوشاہہ نے رومال زمین پر بچھایا اور کانٹوں سے ہاتھ بچا بچا کر...
 چٹنٹیں اس میں ڈال لیں۔

"آپ کہاں مقیم ہیں؟" بوڑھے نے مجھ سے پوچھا۔
 میں نے اپنی کونٹھ کا پستہ بتایا۔ اسی طرح باتیں کرتے کرتے ہم سڑک
 کے موڑ پر پہنچے۔ یہاں میں ان سے رخصت ہوا۔



بہار پر میرا وقت اکثر مطالعہ میں گذرتا تھا۔ لیکن اس دن مطالعہ
 میں جی نہ لگا اور لگتا بھی کیسے حب ایک شوخ و تنگ اور عرج دار لڑکی کا تصور
 آنکھوں کے سامنے رقص کر رہا ہوا اور کانٹوں میں اس کی دلکش آواز کا ترنم۔
 کہیں چوٹ تو نہیں آئی "متواتر گونج رہا ہو۔ نوشاہہ! کس قدر پیارا نام تھا
 اور یہ نوشاہہ کیا تھی؟ حسن قدرت کی ایک جیتی جاگتی تصویر۔ جس کا حسن و جمال
 اس موتی کی طرح تھا جو صدف کے سینہ سے عیاں ہو کر ساحل پر پڑا چمک
 رہا ہو۔

میرا معمول تھا کہ پہلے پہر کی چائے ٹھیک چار بجے پی لیا کرتا اور پانچ
 بجے کے قریب سیر کے لئے نکل کھڑا ہوتا۔ راستہ میں ٹٹے جلنے والے مل
 جاتے۔ لیکن آج چائے پیتے ہی سیر کو چل بھلا اور گھوسے لگھاتے ان ہی
 چٹنٹوں کے درختوں کے پاس پہنچ کر بیچ پر بیٹھ گیا۔ لیکن جس مقصد اور تمنا
 سے یہاں بیٹھا تھا۔ وہ آج پوری نہ ہوئی۔ دوسرے روز جو میں گھر سے سیر
 کو نکلا تو راستہ ہی میں وہ بوڑھا اور نوشاہہ جس کا خیال مجھے رات بھر پریشان

کر رہا تھا۔ مل گئے۔ بڑے نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "ہم آپ ہی کا ذکر کر رہے تھے۔"

"میرا!" میں نے کہا اور نوشابہ کی طرف دیکھ کر پوچھا "شاید انہیں آج بھی وہی چٹنٹیں تڑوانی ہوں گی؟"

یہ سن کر نوشابہ چٹنے لگی۔ بالکل اسی طرح جیسے موسم بہار میں کوئی گلی خود بخود چٹک جائے۔

بڑا ہا بولا "ہیں افسوس ہے کہ کل آپ ہمارے بنگلے تک تو آئے لیکن ہم آپ کو اندر آنے کی دعوت دینا بھول گئے۔"

میں نے کہا "لیکن میں تو راستے ہی سے الگ ہو گیا تھا۔ آپ کے بنگلے تک کب پہنچا؟"

اب نوشابہ بولی "آپ جہاں سے الگ ہوئے تھے وہیں پاس ہی تو ہمارا بنگلا تھا میں نے سن کر پوچھا "آپ کا ارادہ تو تھا؟"

"ہاں تھا تو ضرور!" نوشابہ نے شباب کی اداؤں سے سر ہلا کر کہا۔

"تو بس شکریہ!" میں نے مسکرا کر کہا "اصل مطلب تو نیت سے ہے۔"

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ہم پھر انہی چٹنٹوں کے پاس جا پہنچے بڑا بچہ پوچھ گیا اور نوشابہ بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا "تو کیا آج چٹنٹیں نہ توڑے گا؟"

"جیسے کل توڑی تھیں" نوشابہ نے مسکرا کر کہا۔

بڑا ہا بولا "کل سارا دن تو اس بچی کا بازو دکھتا رہا۔"

"آپ کہیں تو میں توڑ دوں؟" میں نے نوشابہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں" نوشابہ بولی "آپ تکلیف نہ کریں۔"

میں نے نہیں کر کہا۔ لیکن آپ کے الفاظ سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چٹنٹیں توڑ دلوں اور یہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اس چیز تو نیت ہے۔
 بوڑھا اور نوشاہہ دونوں ہنسنے لگے۔ میں نے کہا، "اگر آپ کو میری تکلیف کا خیال ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ کچھ تکلیف آپ بھی فرمائیں۔"
 "میں! نوشاہہ نے کہا، کیا؟"
 "آپ پتھر اٹھا کر مجھے دے جائیں۔ میں نے جواب دیا۔
 بوڑھا بولا، "ہاں! یہ ٹھیک ہے۔"

چنانچہ نوشاہہ ادھر ادھر سے پتھر اٹھا کر مجھے دیے لگی اور میں چٹنٹیں توڑنے لگا۔ جب پندرہ بیس چٹنٹیں ٹوٹ چکیں تو بوڑھے نے کہا، "نوشاہہ اب چھوڑ دو۔ تم انھیں بھی مفت میں پریشان کر رہی ہو۔"
 نوشاہہ نے رومال بچھا دیا۔ اور ہم دونوں نے ادھر ادھر سے چٹنٹیں اٹھا اس میں ڈالیں اور پھر تینوں آگے چلے۔ باتوں باتوں میں بوڑھے نے کہا، "آپ نے اپنا نام تو ہمیں بتلایا ہی نہیں۔"

مجھے سہرا بکتے ہیں۔ میں نے کہا، "اور آپ کا اسم گرامی؟"
 یہ لوگ مجھے فریدوں بابا کہہ کر پکارتے ہیں۔ بوڑھے نے جواب دیا۔
 میں نے نوشاہہ کی طرف دیکھ کر کہا، آپ بھی اپنا نام بتلا دیجئے۔
 "لو یہ اچھی رہی،" اس نے ہنسنے کہا، میرا نام تو آکیوکل ہی معلوم ہو گیا تھا۔
 کیا؟ میں نے کہا۔ سات فرما لیجئے۔ مجھے تو یاد نہیں ہے۔
 "فریدوں بابا سے پوچھ لیجئے۔"

"نام آپ کا اور پوچھوں فریدوں بابا سے وہ کیوں؟"
 فریدوں بابا بولا، "یاں بتلاؤ نا اس میں ہرج ہی کیا ہے؟"

”کیا تبادلوں؟“ نوشاتہ نے شرارت آمیز نظروں سے فریدوں بابا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”اپنا نام؟“ میں نے کہا ”مجھ سے ہی غلطی ہوئی جو میں نے تبادو دیا“
نوشاتہ ہنسنے لگی۔

”اچھا کل تبادووں گی۔“

حب بھگلے کے قریب پہنچے تو نوشاتہ نے کہا ”کل آپ چائے ہمارے ہی ہاں پیجئے گا۔“

”معاف فرمائیے“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”حب بھے صاحب خانہ کا نام ہی معلوم نہیں تو آ کیسے سکتا ہوں“

”ہاں بھائی“ بوڑھا فریدوں سنیں کر بولا ”یہ تو آپ نے ٹھیک کہا“
”خیر!“ نوشاتہ نے میری طرف دیکھ کر کہا ”کل آپ تشریف تو لائیں“
”میں عرض تو کر چکا“ میں نے کہا کہ ”حب نام میزبان کا نام معلوم نہ ہو کیسے آ سکتا ہوں۔“

”بہت مشکل آ پڑی یہ تو“ نوشاتہ نے لچک کر کہا۔ پھر بوڑھے کی طرف دیکھ کر بولی ”فریدوں بابا آپ ہی تبادو دیجئے نا!“
”اور تم کیوں نہ تبادو؟“

”لیجئے اب مجھے اجازت دیجئے پھر کسی روز ملاقات ہوگی“
”اور کل نہیں؟“ نوشاتہ نے پوچھا۔ کل آپ چائے پر جو تشریف لائیں گے یہاں؟“

”نوشاتہ نے نیم باز ہنکا ہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا“ نوشاتہ کے بھگلے پر۔“

”شکریہ! کل حاضر ہو جاؤں گا“

اگلے روز میں ٹھیک چار بجے نوشاہہ کے بنگلے پر جا پہنچا۔ بنگلے کے عقب میں ایک چھوٹا سا سرسبز میدان تھا۔ اسی جگہ چائے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اوپر اوپر قریب سے تین تپائیاں رکھی تھیں ان پر پھول دار رومال پڑے تھے ہر ایک تپائی پر تین تین پیالیاں رکھی تھیں۔ بوڑھے فریدوں نے میرا گھر کے اور لوگوں سے تعارف کرایا۔ یہاں صرف میں ہی تھا۔ نوشاہہ نے سچ کا سنی رنگ کی ایک کا مدار ساڑھی پہن رکھی تھی۔ فریدوں نوشاہہ اور میں ایک ہی جگہ بیٹھے۔ چائے بہت پر تکلف تھی۔ نظر کے سامنے ایک عینق گھائی تھی۔ دوسری جانب سر بفلک پہاڑ تھے اور پہاڑوں کی سبز ڈھلانوں پر جو کہیں کہیں ڈبلیا کے پھول کھلتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صانع قدرت نے فرودہ پر عینق و مرجان کی مینا کاری کر دی ہے اور فاصلہ پر برف پوش چوٹیاں تھیں۔ جو اس وقت اس طرح چمک رہی تھی جیسے ان پر کسی نے سیلاب کی چادر چڑھا دی ہو چیل اور دیو دار کے ہرے ہرے درخت ایک دوسرے کے دوش بدوش کھڑے تھے اور ان کی ڈالیوں پر سفید ڈارمپوں والے سیاہ لنگڑے بیٹھے ہماری طرف جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے اور دور کسی وادی کے دامن میں پہاڑی ندی کسی عاشق شوریدہ کے سر کی طرح شور و غلب کرتی تھی۔

”نگس! آج جو مجھے اس بوڑھے فریدوں کا خیال آتا ہے اور اپنی حالت پر غور کرتا ہوں تو کچھ پوچھ نہیں جو میرے جی پر گذرتی ہے اس وقت میں جو بہن تھا اور وہ بوڑھا تھا۔ آج میں بوڑھا ہوں اور اسی کی طرح موت کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ کبھی وہ زمانہ تھا کہ موت کے نام سے وحشت

ہوتی تھی۔ لیکن آج موت میں ہی مجھے آرام کی جھلک نظر آ رہی ہے اور.....

”بہرام جی! ”زگرس بولی“ یہ فلسفیانہ باتیں چھوڑے اور مطلب کی بات کیجئے“

بڑھے بہرام نے ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگا۔

”چائے بھی پیتے رہے اور گپ شپ بھی ہوتی رہی۔ فرید دن کبھی کبھی دوسروں پر کوئی ایسا فقرہ چست کرتا کہ سب ہنسنے لگتے۔ کچھ دیر تو وہ ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ پھر یہ کہہ کر ”جوانوں کے پاس بڑھوں کا کیا کام“ اٹھا اور دوڑی جگہ جا بیٹھا۔

نوشابہ کہنے لگی ”آپ نے چائے تو پی ہی نہیں“

”یہ دوسری پیالی تو ہے“ میں نے پیالی ختم کرتے ہوئے کہا۔

”کہاں دوسری ہے“ یہ کہتے ہوئے تیسری بار اس نے میری پیالی

بھردی۔

میں نے پوچھا ”آج آپ کچھ تھکی تھکی سی معلوم ہوتی ہیں“

”آپ نے کیسے جانا؟“

”آپ چپ چپ جو بیٹھی ہیں شاید ناراض ہوں گی؟“

”ناراض! ”نوشابہ بولی“ کس سے؟“

”شاید مجھ سے ہی ہو“

”وہ کیوں؟“

”کل میں نے آپ سے نام پوچھے میں جو اصرار کیا“

”وہ تو آپ محض انتقام لے رہے تھے“

”انتقام!“ میں نے تعجب سے پوچھا۔ کیسا انتقام؟“
 ”وہی اس روز گھٹنے پر چوٹ لگنے کا“ نوشاہہ نے ہنس کر کہا۔ ٹھیک
 کہنا میں نے۔“

”یہ محض آپ کا خیال ہے۔“
 ”جب پتھر لگا تو چوٹ کیسے نہ آتی“ نوشاہہ بولی ”در دیکھے نہ ہوتا“
 ”بے ضروری نہیں“ میں نے جواب دیا کہ ”جس جگہ چوٹ لگے وہاں درد
 بھی ہو۔“

نوشاہہ نے میری طرف دیکھا اور کہا ”اس روز جو پتھر پھینکنے میں میرا بازو
 اکڑ گیا۔ تو درد بھی بازو میں ہی رہا۔“

”آپ کا بازو جو تھا“ میں نے جواب دیا۔
 ”تو کیا آپ کا گھٹنا نہ تھا“ نوشاہہ نے چائے کی پیالی منہ سے لگاتے
 ہوئے پوچھا ”ہاں یہ فرمائیے درد کہاں ہوتا رہا؟“
 میں نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا ”یہاں۔“

اور نوشاہہ ایک مستانہ اداسے سر ہلا کر بولی۔ ”ٹھیک!“
 دل ہی تو ہے۔“ میں نے جواب دیا ”کوئی سنگ وحشت تو ہے نہیں۔“
 ”خیر!“ اس نے کہا ”آپ نے مان تو لیا کہ چوٹ بھی لگی اور درد بھی
 ہوا۔“

برابر کی میزوں والے چائے ختم کر چکے تھے اور ہماری طرف دیکھ
 رہے تھے۔ ناچار ہمیں بھی اٹھنا پڑا۔

اس قدر کہہ چکنے کے بعد بہرام نے چائے کے دو چار گھونٹ پے۔ بزرگ
 نے پوچھا۔ ”بہرام جی چائے تو سرد ہو چکی ہوگی۔“

”نہیں ٹھیک ہے“ بہرام نے جواب دیا۔ پھر اپنی داستان یوں شروع کی :-

”نرگس! فریدون بوڑھا تھا اور نوشابہ جوان۔ نوشابہ چاہتی کہ جب موقع ملے وادیوں میں گھوما کرے پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھا کرے اور فریدون کی یہ حالت کہ دس منٹ چلتا تو پندرہ منٹ بیٹھ کر دم لیتا۔ اس لئے تھوڑے ہی دنوں کی ملاقات کے بعد راہ رسم یہاں تک بڑھی کہ نوشابہ اب میرے ہمراہ سیر کرنے جایا کرتی۔“

نرگس بولی ”اور آپ اس شمشاد غریب کو اتنی جلدی بھول گئے“ پھر خاوند کی طرف دیکھ کر ”بناؤ تم مردوں کا اعتبار کون کرے؟“

”لو اور سنو“ طاووس نے منہس کر کہا ”نرگس تم تو مجھ پر برسے کے لئے بس بہانہ ڈھونڈتی ہو۔ بات بہرام جی کی ہو رہی ہے اور قصور وار میں ٹھہرایا جا رہا ہوں۔ میں تو پہلی ہی نگاہ میں دل و ایمان سب تمہاری نذر کر چکا تھا لیکن تمہاری بناؤٹی بے رخی سے جو میرا جی جلتا وہ میں ہی کچھ جانتا تھا“

”بناؤٹی!“ نرگس نے مسکرا کر کہا ”ٹھیک!“

”ٹھیک نہیں تو اور کیا جھوٹ.....“

لیکن نرگس نے قطع کلام کر کے کہا ”بس اب چپ رہے“ پھر بہرام سے ”تو ہاں بہرام جی! وہ شمشاد غریب دل میں کیا کہتی ہوگی؟“

بوڑھا بہرام بولا۔ نرگس! تم جاؤ کہ مرد کے دل کی نگرانی عورت کی محبت سے آباد ہوتی ہے اور جو عورت بے رخی کرے بے اعتنائی برتے تو پھر جو چر کے دل پر لگتے ہیں وہ دل ہی کچھ جانتا ہے اول تو شمشاد کے روکھے پھیکے خطے بچے ملاں ہوا۔ پہاڑ پر آکر بھی کئی دن طبیعت خراب ہی رہی

دل میں جو شمشاد کا ایک تصور سایا خیال سا بندھا ہوا تھا وہ رہ رہ کر دل کو بے چین کرتا۔ ایک خلش سی تھی جو اکثر بے قرار رکھتی۔ اب نوشاہہ سے جو ملاقات ہوئی تو وہ خلش جاتی رہی۔ نگہت سے عورت اگر محبت کا ایک لفظ بھی کہے تو برسوں کا ناسور بھی مندمل ہونے لگتا ہے اور پھر ہم مرد تو کچھ اس قدر سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ پیار کی چھوٹی باتوں سے بھی محل جاتے ہیں۔ اور

”بس رہے دیجئے“ نگہت نے پھر قطع کلام کرتے ہوئے کہا ”خیر نوشاہہ جو ملی تو غریب شمشاد دل سے اتر گئی۔ پھر کیا ہوا؟“

”لو اور سنو“ بہرام بولا ”یہ میں نے کب کہا کہ شمشاد کو میں بھول گیا؟ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ خلش جو شمشاد کی بے رحمی سے پیدا ہوئی تھی نوشاہہ کی ملاقات سے مٹ گئی۔ رہی یہ بات کہ پہاڑ پر آ کر میں نے اسے خط کیوں نہ لکھا تو اس کی وجہ میں تمہیں پہلے ہی بتلا چکا ہوں“

نوشاہہ سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کے والدین مر چکے ہیں اور فریدون باہا جو اس کا دادا ہے اسی نے اسے پرورش کیا ہے اور وہی اس کا سرپرست ہے۔

~~~~~

اب ستمبر کا مہینہ تھا اور کہار کی فضا میں ایک دلفریبی اور دلکشی نمودار ہو چکی تھی۔ ایک روز ہم اتفاق سے انھیں چشمنٹوں کے پاس بیٹھے تھے۔ نظر کے سامنے وہ سر بفلک پہاڑ تھے جن کی برف پوش چوٹیاں سکوت شام میں کچھ اس طرح نظر آرہی تھیں جیسے ”نیلم پری“ اندر کے اکھاڑے سے نکل کر رہا آکھڑی ہو۔ چشمنٹوں کے اس طرف ایک بہت خوشنما وادی تھی اور کسی کسی جھاڑی کے نیچے سے کبک کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ ہمارے

آس پاس جو چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں ان میں کہیں کہیں عناب لگے تھے کچھ ہرے تھے اور کچھ پاک کر سرخ ہو چکے تھے اتنے میں ایک چھوٹی سی خوب صورت چڑیا کہیں سے آئی اور ایک سرخ عناب توڑ کر اڑ گئی۔ نوشابہ مسکرا کر بولی "کیا تماشا ہے کہ ہر جان دار کو گھر کی ہی لو لگی رہتی ہے" "آئین قدرت یہی ہے" میں نے کہا۔

"قدرت کے آئین بھی عجیب ہیں" نوشابہ بولی "انسان جب شادی کر لیتا ہے تو اسے علیحدہ گھر کی سوچتی ہے۔ پر ندے بھی جب اپنا جوڑا تلاش کر لیتے ہیں تو ماں باپ کا گھونسلہ چھوڑ کر کسی اور جگہ نشین بنا لیتے ہیں پرندوں کو تو کچھ کہہ نہیں سکتی۔ لیکن جو آرام اور اطمینان انسان کو ماں باپ کے گھر میں ملتا ہے وہ اور جگہ مشکل سے میسر آتا ہے"۔

میں نے کہا: "یہ تو عورت پر موقوف ہے وہ چاہے تو شادی کے بعد گھر کو حبت بنا دے چاہے جہنم"۔

"اور جو میاں ہی کو کوئی بگڑے دل ہوں تو؟" نوشابہ نے پوچھا۔  
 "مجھ سے سنئے" میں نے کہا "میاں ہزار بگڑے دل ہوں۔ اگر عورت کو "میاں" سے محبت ہو تو وہ گھر دونوں کے لئے حبت بن جاتا ہے۔"  
 "ہاں" نوشابہ بولی "یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن محبت بازار سے تو مل نہیں لی جاسکتی۔ میرے خیال میں عورت کا دل مرد کے دل سے زیادہ ناز اور لطیف بنا یا گیا ہے ذرا سی ٹھیس مٹی تو بس زندگی حرام"۔  
 "لیکن ٹھیس لگے ہی کیوں؟" میں نے کہا۔

"مرد کے چلن سے؟" نوشابہ نے جواب دیا "منہ دیکھنے کی محبت مرد کو ضرور ہوا کرتی ہے۔"

”اور عورتیں بھی بے مروت ہو ا کرتی ہیں“ میں نے مسکرا کر کہا۔ او بے وفا بھی“

”تو گویا“ نوشاتہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”آپ کو کسی بے وفا اور بے مروت سے بھی واسطہ پڑ چکا ہے؟“  
 ”جی ہاں“ میں نے کہا ”پڑ چکا کیوں“ پڑ رہا ہے“  
 ”اور وہ نیک خصال ہے کون؟“ نوشاتہ نے ایک نگاہ غلط انداز سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

”وہ ستم شعار اس وقت میرے قریب ہی بیٹھی ہے“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”ستم شعار“ نوشاتہ سر ہلا کر بولی ”بجا ارشاد ہوا اس روز آپ کا گھٹنا جو پھوڑ دیا تھا میں نے سمجھ گئی۔ آپ کے سینہ سے ابھی تک وہ کاوش نہیں گئی“

”کاوش جسے کیا ہے؟“ میں نے کہا ”درد جو ہوتا ہے“  
 ”درد؟“ اس نے بناوٹی تعجب سے پوچھا ”کہاں؟ کب سے؟“  
 ”اور میں نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا ”یہاں اور اسی روز سے“  
 ”تو پھر اس کا علاج؟ اس نے پوچھا۔

”میں نے کہا“ جب سچا ہی مائل ستم ہو تو علاج کون کرے؟“  
 ”خدا جانے آپ کیا فرما رہے ہیں!“ نوشاتہ نے منہ پھیر کر کہا: معلوم ہوتا ہے کہ کہسار کی آب دہوا آپ کو اس نہیں آتی؟“  
 ”راس تو تب آتی“ میں نے کہا ”جب کوئی حسینہ کہسار بھی مائل کم ہوتی“

”حسینہ کہسار اور مائل کرم!“ نوشاہہ مسکرا کر بولی۔ ”خوب! لیکن کوئی مانگنے والا بھی ہو۔ کوئی محتاج نظر بھی آئے۔“

میں نے لپک کر اس حسینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر دیوانہ وار ہاتھ چومنے لگا۔

”دھنس کر بولی۔“ دیکھئے کہیں ہونٹ بھی نہ دکھنے لگیں۔“

”ہوا کرے۔“ میں نے کہا۔ اب حسب چارہ گر موجود ہے تو درد کا کیا منکر۔“

”لیکن وہ دل کی غلش کیا ہوئی۔“ نوشاہہ نے میری آنکھوں سے آنکھیں ملانے پوچھا۔ دیکھوں تو درد ہے کہاں؟“

میں نے اس کا خوب صورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دل کے مقام پر رکھ دیا اور کہا۔ ”یہاں۔“

”بھلا سنوں تو آپ کا دل کہتا کیا ہے؟“ پکھتے ہوئے اس نے اپنا خوب صورت سر میرے سینہ پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا سر بھی جھکنے لگا۔ پہلے سر سے سر ملا۔ پھر ہونٹ سے ہونٹ۔ جتنی کی آئری تار یخوں میں پہاڑ پر ہی ہماری شادی ہو گئی۔



فریدون اور دوسرے لوگ جو نوشاہہ کے ساتھ پہاڑ پر مقیم تھے، چند روز بعد واپس چلے گئے۔ میں اور نوشاہہ وسط نومبر تک پہاڑ پر ہی رہے جب ہم لوگ واپس آئے تو سب سے پہلے میں نے شمشاد کے خطوط اس جگہ رکھ دے جہاں نوشاہہ انھیں دیکھ نہ سکے۔ دل تو کئی بار جا بجا کہ شمشاد کے خطوط ایسی جگہ رکھ دے جہاں نوشاہہ انھیں دیکھ نہ سکے۔ دل تو کئی بار جا بجا کہ شمشاد کو خط لکھوں لیکن

اب اس قسم کی خطا و کتابت میں اخلاق سے گری ہوئی بات سمجھتا تھا۔ میری مسرت کی انتہا صرف یہ تھی کہ نوشاہہ میرے پاس بیٹھی رہے دقت مزے سے گزرتا تھا۔ نوشاہہ والٹن بجایا کرتی / میں پاس بیٹھ کر سنا کرتا۔ ایک روز میں نے کہا: "نوشاہہ مجھے بھی والٹن بجانا سکھا دو۔"

"سیکھ لیجئے۔ کچھ مشکل نہیں۔"

"کے روز میں سکھا دو گی۔؟"

"کیا فیس ادا کریں گے آپ؟"

"نوشاہہ! میں نے ہنس کر پوچھا "مجھ سے بھی فیس ہوگی"

"تو اور کیا مفت ہی؟"

"اور یہ جو میں سارا سارا دن تمہارے کاموں میں مارا مارا پھرتا ہوں

میں نے کہا "کبھی میں نے بھی اجرت مانگی۔"

"مزدور کی مرضی ہے" وہ ایک خنک جانا نہ سے سر ہلا کر بولی "انٹے پانے

مانگے۔"

"تو میں مزدور پڑانا؟" میں نے کہا "چلو یوں ہی رہی۔ لائیے پہلے

میرا حساب چکا دیجئے۔"

"کیا میں گئے آپ؟" نوشاہہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا ہر

کوئی حساب کتاب آپ کے پاس؟"

"سرکار سے جو کچھ مل جائے وہی غنیمت ہے۔" میں نے ہنس کر کہا

"وہی مجھ کو عیش و آرام ہے جو کرے تو ایک نظر سے خوش۔"

"تو ادھر آئیے" نوشاہہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولی "اٹھئے

جلدی۔"

نوشاہہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ میں سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ بڑھا کر کہا "لائیے"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ اور پھر دونوں باہیں میری گردن میں ڈال کر اپنا سر میرے سینہ پر رکھ دیا۔

~~~~~

فریڈون گاہے گاہے ہمارے ہاں آ جاتا اور دس پانچ روز رہ کر چلا جاتا۔ سردیوں کا موسم گزر چکا تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ پہلے کچھ دن فریڈون بابا کے پاس جا کر رہیں گے پھر کسی پہاڑ پر چلے جائیں گے۔ اسے محض اتفاق سمجھے کہ جب سفر کی تیاری ہونے لگی تو میں نے شمشاد کے خطوط نکالے اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایک ایک کر کے پڑھنے لگا۔ میرا ارادہ تھا کہ جانے سے پیشتر انھیں تلف کر دوں۔ ابھی دو ایک ہی خط دیکھے تھے کہ اچانک نوشاہہ آگئی۔ میں نے سب خط اٹھا کر جیب میں ڈال لئے لیکن نوشاہہ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "یہ کیسے خط ہیں جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں؟"

"دو ایک دوستوں کے خط ہیں"

"دوستوں کے خط؟ پھر چھپائے کیوں۔ دکھائیے ذرا۔"

"تم دیکھ کر کیا لوگی؟"

"بس ایسے ہی ذرا دیکھوں گی۔"

"تم تو جھجی ہوئی ہو۔"

"خیر بھئی ہی سہی! یہ کہہ کر نوشاہہ زبردستی جیب میں سے جو خط نکالنے

لگی تو میں نے ہنسی ہنسی میں اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس نے غصے سے میری

طرف دیکھا اور کہا -

”سمجھ گئی کسی کشتی کے خط ہیں جو مجھ سے چھپا رہے ہو“

”تمہارے سر کی قسم ہرگز نہیں“

”تو پھر دکھا دیجئے“

”تمہارے دیجئے کے قابل نہیں“

یہ سن کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

میں ابھی بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ نوشاہہ کے خط شمشاد کو دکھاؤں یا تلف کر دوں کہ اتنے میں فرید وں آیا اور چھوٹے ہی مجھے کو سنا شروع کر دیا دنیا بھر کے الزام اس بڈھے نے میرے سر قحط دے۔ پہلے تو میں خاموش بیٹھا رہا۔ آخر مجھے بھی غصہ آیا اور میں نے بھی دو چار سخت الفاظ کہہ دئے پھر میں نوشاہہ کے پاس آیا وہ صوفے پر بیٹھی دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رو رہی تھی۔ میں نے بہت سمجھایا۔ ہزار قسمیں کھائیں، لیکن وہ اپنی ہٹ پہ قائم رہی۔ میرے پیچھے پیچھے فرید وں بھی آگیا جانے یہ بوڑھا کچھ نہ سمجھ گیا تھا جو آنگ پر اور بھی تیل ڈالنے لگا۔ میں نے بھی صدمہ میں آکر صاف کہہ دیا کہ اب جو دوسو روپے لیکن خط قیامت تک بھی نہ دکھاؤں گا۔ یہ کہہ کر میں باہر چلا گیا۔ شام کے بعد جب میں باہر سے آیا تو معلوم ہوا کہ نوشاہہ اور فرید وں شام کی گاڑی میں سوار ہو کر چلے گئے ہیں۔

~~~~~

”تو بہ ہے!“ طاؤس بولا ”ذرا سی بات پر اتنی ناراضگی“

”نرگس بولی، بہرام جی! بات تو آپ نے بڑھائی۔ کیا ہرج تھا جو آپ خط

دکھا دیتے تو“

”دوسرے کے خط کیے دکھلا دیتے۔“ بہرام نے جواب دیا ”عورت کو مرد کی بات کا اعتبار ہونا چاہیے۔“ خیر! نو شاہ کے اس طرح چلے جانے پر مجھے بہت غصہ آیا کئی روز گزر گئے۔ نہ ادھر سے کوئی خط آیا نہ میں نے بھی اپنے دو چار دن میں جانا رہا لیکن طبیعت بہت اچاٹ رہنے لگی۔ اب پھر ہی پرانا مشغلہ شروع کر لے کی ٹھانی۔ اخبار اور رسائل تو آتے ہی تھے ایک روز سب رسالے اکٹھے کر کے بیٹھا اور ایک ایک کی اور اتنی گردانی کر لے لگا لیکن جو چیز میں ڈھونڈتا تھا وہ کہیں نہ ملی۔ رسالے دیکھنے سے جب جی اکتا جاتا تو میں شمشاد کے خط لے بیٹھتا۔ کئی روز اسی طرح گزر گئے آخر ایک روز بیٹھے بیٹھے میں نے شمشاد کو ایک خط لکھا۔

بہرام نے اسی بیگ میں سے ایک خط نکالا اور پڑھنے لگا :-  
 ”میں خانگی معاملات میں اس قدر ابھرا ہوا اور ملوث  
 ایام نے کچھ اس قدر پریشان دکھائی کچھ پوچھے نہیں کہنے کو تو  
 سال بھر ایک طویل عرصہ ہے لیکن جب غور کرتا ہوں تو کل کی  
 بات معلوم ہوتی ہے جانے! وقت کیوں اتنی سرعت سے گزر  
 جاتا ہے اور حالات کس طرح بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن معاف  
 فرمائیے میں اتنا قصور وار نہیں جتنا کہ آپ مجھے خیال کرتی ہوں گی۔  
 آپ کا آخری خط بہت مایوس کن تھا۔ اور پھر اس کے بعد اپنے  
 کچھ ایسی چپ سادھی کہ بس تو ہوا جی بھلی۔ ایک دیر سے تپکے  
 رخصت قلم بھی دیکھنے میں نہیں آئے۔ احوال واضح جو کچھ  
 بھی تھا گوشتش گزار کر دیا ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔“

کئی روز کے انتظار کے بعد اس خط کا جواب منصورؑی پہاڑ سے آیا۔ وہ بھی سن لیجئے :-

بہرام نے پھر ایک اور خط نکالا اور پڑھنے لگا :-  
 "روز کا پنج — منصورؑی

ایک مدت کے بعد آپ نے یاد فرمایا۔ شکریہ۔ بیشک واقعات انسان کو مجبور کر دیتے ہیں۔ آپ کو اہل ایمان سے شکوہ ہے اور بچے قسمت سے شکایت لیکن تعجب ہے کہ جب کوئی بات ہماری مرضی یا امید کے خلاف واقع ہوتی ہے تو ہم قسمت کو کو سے منگتے ہیں۔ حالانکہ ہر بات کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ بے شک میں نے ایک مدت سے کچھ نہیں لکھا دو چار روز ہوئے ایک افسانہ لکھنا شروع کیا تھا دس پانچ سطریں لکھ کر چھوڑ بیٹھی۔ چھوڑ کیوں بیٹھی؟ اس کی وجہ خود مجھے معلوم نہیں۔ خیر! جو کچھ لکھا ہے وہ آپ بھی سن لیجئے :-

"مبل نے جب تک بال و پر نہیں سنبھالے تھے۔ گھولنے میں ہی بیٹھے بیٹھے پھولوں کو دیکھ کر خوش ہوا کرتی۔ وہ منتظر تھی کہ اسے طاقت پر وار عطا ہو اور ہم صیغوں سے مل کر منائی خوشیاں منائے۔ آخر اس کی یہ تمنا برآئی۔ ایک روز وہ گھولنے سے نکل کر شاخ پر آ بیٹھی۔ اس نے ایک پھر پری سی لی پھر پر توں کہ اڑی اور چین میں جا پہنچی۔ لیکن چین کی سیر کا اسے اکیلے کچھ لطف نہ آتا۔ کچھ روز بعد اسے ایک ہمنواں مل گیا۔ دونوں نے مل کر اپنے لئے ایک نشیمن بنایا اور محبت سے رہتے رہتے۔ لیکن یہ زندگی اسے راس نہ آئی اور مبل کو پھر وہی اپنا پرانا آسٹیاں

یاد آسنے لگا اور وہ اداس ہو کر پھر وہیں آ بیٹھی۔ لیکن دل کو جو ایک  
پھانس سی گئی تھی اس نے جینا حرام کر دیا۔ اس کی حالت اس  
پھول کی طرح ہو گئی جسے خزاں کے نفس گرم نے جھلس ڈالا ہو  
اور اب شاخ سے جھڑ کر مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے کا منظر ہو۔  
بس اتنا ہی لکھا ہے۔ ہاں! آپ نے خط بھیج کر ایک پرانی یاد تازہ  
کر دی تو بے اختیار زبان سے نکلا کہ  
اس کو چھ کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی کہ کوئی تو دل کی آگ پہ نکھاسا جھنگیا

ناشا

شمشاد

نرگس! یہ خط پڑھ کر میرے دل پر ایک پتہ کا سا لگا۔ اسی رات میں پہر  
دوار سپنج پر سوار ہو کر دوسرے دن منصوری جا پہنچا اور ایک ہوٹل میں قیام  
کیا۔ اگلے روز کوئی گیارہ بجے کے قریب میں شمشاد کے بنگلے کی جستجو میں نکلا۔  
گر جا کے پاس سے پہاڑ کے ساتھ ساتھ داہنی جانب کو پگ ڈنڈی سی جاتی  
تھی۔ پگڈنڈی پر ایک چھوٹی سی چٹان کے عقب میں سرخ رنگ کی ایک  
خوب صورت عمارت تھی۔ یہی "روز کا بلج" تھی۔ کوٹھی کے جنوب کی جانب  
یعنی اسی طرف جدھر سے میں گیا تھا چیل کے درخت تھے۔ اور ان کے  
آگے گھاس کا ایک چھوٹا سا سرسبز قطعہ تھا۔ یہاں ایک آرام کر سی پر ایک  
عورت بھی کوئی اخبار دیکھ رہی تھی۔ نرگس! یہ تو شادی تھی۔۔۔۔۔

"نوشادہ!" نرگس نے تعجب سے پوچھا۔

"شمشاد کہئے" طاؤس بولا۔

بہرام نے ایک گہرا سانس لے کر کہا: "نوشادہ بھی اور شمشاد بھی۔"

دقت جو میری حالت بھتی بیان نہیں کر سکتا۔ میں دبے پاؤں اس کی کر سی کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ پھر اچانک کر اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ کر اور سنسن کر کہا "تمناؤ!"

وہ بجلی کی طرح تڑپ کر اٹھی اور میری طرف دیکھ کر بولی "بہرام! یہ کہتے ہی وہ میرے سینے سے چمٹ گئی۔"



آفتاب ناسپاتی کے پیڑوں کے عقب میں غروب ہو رہا تھا اور شفق کی پلکی ہلکی سی سرخی فضا کے عالم میں پھیل رہی تھی۔ اب نہ آسمان پر سے کوئل کی آواز آتی تھی اور نہ قمری کی کو کو ہی سنائی دیتی۔ ہاں! کسی بیڑ پر سے کسی وقت "پی کہاں" کی آواز سنائی دی جاتی۔ بوڑھا بہرام سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

ایم اسلم

# فطرت کے دُوزاویے

”بیہوش“

”غش“

”ہش“

”فش“

”کیوں کیا بات ہے؟“ میں نے سرگوشی میں عظیم سے پوچھا۔

”ہش“ اس نے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

”کیا حرکت قلب بند ہو گئی؟“ میں نے اپنے دوست کی دفعتاً بیہوشی

پر رنجیدہ ہو کر اس بارشیم سے دریافت کیا۔

”فش“ اس نے حقارت سے منہ بنا کر جواب دیا۔

”لاحول ولا قوۃ اس ہش اور فش کے علاوہ اور بھی منہ سے کچھ پھوٹو گے

یا نہیں؟ بتاتے کیوں نہیں کہ میرا دوست مر گیا یا زندہ ہے؟" میں نے بیہوش اجمل (جس کا "قلبی نام" ناظر تھا) کے سر ہانے ہو کر شکایتاں سیم و عظیم سے دریافت کیا۔

"یہ لو یہ ہے اس بیہودہ انسان کی بیہوشی کا باعث۔ یہ قسطا س رنگین۔ یہ نہ ہر خوش رنگ" سیم نے میری طرف ایک خط پھینک کر کہا میں نے جو اس کو پڑھا تو یہ سنوالی تحریر تھی۔

اچھے ناظر!

تمہاری پاک محبت کا پیام کس درجہ شیریں ہے۔ لیکن کس قدر رقت انگیز۔ تمہاری تحریر میں زبردست جادو ہے ایسا جادو جس کے موش کیو پڑ اور دانت ہی ہو سکے تیس۔ لیکن تمہارے خط سے مجھے ایسا شبہ ہوتا ہے کہ تم نے محبت اپنے ادب پر خود انجیزی ہے۔ محبت کو اپنا بے خطا موقع نہیں دیا کہ وہ تمہارے گرد و خود قوی حصار قائم کر لیتی۔ میری اس تشکیک کو معاف کرنا۔ میں درس پریم کی باتوں کو اچھی طرح سمجھتی بھی نہیں ہوں۔ تم میری اس عدم نفیم کو "ابا" سے تعبیر کرتے ہو یہ تمہاری غلطی ہے اسے لیکن تم نے یہ کیا لکھ دیا کہ ہم قیامت تک نہیں ملیں گے ملیں گے کیوں نہیں آخر؟ تمہارے اور میرے درمیان ایسی کوئی آگ کی خلیج حاصل ہے مجھے سمجھاؤ بچے بتاؤ۔

دیکھو ناظر! تم ہر روز نکات کے پردے میں لپیٹ کر بات کر نیچے عادی اور میں اس کے برعکس ہوں سیدہ سادی بات سمجھنے والی۔ بھلا اس سوال کو اس طرح ہم طور پر پیش کر نیچی

کیا ضرورت تھی کہ کیا میں تم سے نفرت کرتی ہوں مجھے بظاہر تو تمہارا  
اندر کوئی نفرت انگیز بات نظر آتی نہیں ہے۔ کیا اچھا ہونا نظر  
کہ تم عملاً بھی اپنے اطوار و اخلاق میں اسی قسم کے سرگرم محبت انسان  
ہو جیسے خطوں میں نظر آتے ہو۔ خدا کہے تحریر کی پرکاری تمہارا  
حقیقی جذبات کی آئینہ دار ہو۔ میں تو تمہارے ابتدائی خطوط سے  
ہی تارنگی تھی کہ تمہارا دل مجھ سے کچھ بات کہنے کو چاہتا ہے  
..... تمہارے خط شروع سے "رہو دگی" کی ایک خفیف سی  
لچک اپنے انداز پنہاں رکھتے تھے۔ کیوں جناب مانتے ہیں۔  
آپ یا نہیں؟ میں جانتی تھی کہ اب تمہارے زور گس جذبات  
اس سطح تک پھیل کر آیا چاہتے ہیں جہاں تم ان کے سیلاب  
میں سمٹنا نہ سنبھلو گے۔ دو نا آشنا مرد و عورت کی طویل باہمی  
خط و کتابت کو اگر کوئی وجدانی سرانجام رساں جانچ کر اپنی تفتیش  
مرتب کرے تو اس تفتیش کا متن حاد طور پر آرزو اور شوق ہو گا۔

میں نہ معلوم کیا بہکی بہکی میں کرے بیٹھ گئی۔ مجھے ابھی تمہارے  
اس رندانہ پیام کی پذیرائی کرنی ہے جس کو تم نے اس نا آشنا  
الفت کے پاس پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ لوسو میں راستہ  
طور پر تم سے کہتی ہوں کہ ..... میں تم سے نفرت نہیں کرتی  
کوشش کروں تب بھی نہیں کر سکتی، بس اب تو مطمئن؟

تمہارے اقدام محبت سے متاثر

ناظرہ

عجیب خط تھا۔ راقمہ بابت تو آرزو مودہ کار لوگوں کی سی کر رہی تھی

لیکن کہتی ہے اپنے کو نہایت بھولی بھالی۔ عورت کی یہ ہمہ دانی لئے ہوئے  
سادہ بیانی بھی کس قدر عجیب و غریب ہوتی ہے۔ خیر میں خط پڑھ کر بولا  
اچھا تو میرا دوست اجمل محبوب کے اس محبت نواز خط کو پڑھ کر بے ہوش  
ہو گیا ہے؟ لیکن تم لوگ بڑے بے رحم ہو۔ اس کی بے ہوشی کا مذاق اڑا  
رہے ہو۔ جاؤ جلدی سے ڈاکٹر کو بلا کر لاؤ یہ عظیم بڑ بڑاتا ہوا ڈاکٹر کو لینے  
چل دیا۔

—————

ہو سکتا ہے کہ تم میرا ہاتھ مڑوڑتے مڑوڑتے مجھے اس قدر تکلیف میں  
مبتلا کر دو کہ میں رونے لگوں، مگر میں حتی الوسع ضبط کرنے کی کوشش کروں گا  
تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگر تم اس کو اسی بے رحمی سے موڑتے رہے تو وہ  
ابھی کہنی پر سے جدا ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی تم سے پوشیدہ  
نہ رہے کہ پرسوں میرے شانہ میں ہاکی کھیلے ہوئے سحنت چوٹ آچکی ہے۔  
اجمل نے احساس تکلیف کے باوجود مزا حاکم کہا۔

”جب تک تم مجھے اپنی ناظرہ کے تمام خطوط نہ دکھا دو گے اس وقت  
تاک تمہارا ہاتھ مڑتے مڑتے لٹ جائے گا خطرہ میں ہے اور میں تمہارا  
ممنون ہوں کہ تم نے مجھے اپنی ایک اور کمزوری سے آگاہ کر دیا۔ لاؤ میں  
تمہارے ماؤنٹ شانے کی بھی تو اسخ کروں۔ یہ کہہ کر میں نے اس کے  
خائبہ کو بھونچا ہاکیا لیکن اس نے فوٹو الماری کی چابی میری طرف پھینکی  
میں اطمینان سے ناظرہ کے خطوط پڑھنا رہا اور وہ غریب بیٹھا ہوا اپنا ہاتھ  
کو سنبھالتا رہا۔

اگر آپ کسی کے طرز تحریر سے کاتب کا کیریکٹر لے کر لینے کے مدعی ہیں

تو میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ ادین فرصت میں اپنے اس منالط کی اصلاح کیجئے مضامین و خطوط دراصل کہنے والے کے حقیقی جذبات کے بہت کم تر جہان ہوتے ہیں۔ اگر ہارڈی اپنے اخلاق و کردار میں بھی وہی ہارڈی تھا جیسا کہ کہ وہ اپنے ناول "Jud the obscure" کے اندر نظر آتا ہے تو اہرمن (بشکل انسان) کے وجود کا انکار کرنا سخت حماقت ہے ایک ادیب اپنے مضامین کے اندر ادیب ہوتا ہے۔ اگر وہ گفتگو میں بھی ادیب ہے تو صبر کر لینے کی گنجائش ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے اخلاق و عادات میں بھی ادیب ہے اور میل جول کے طریقوں میں ادیب ہے تو اس شخص کو بہت جلد کسی الماری میں کتابوں کے ساتھ بند کر دینا چاہیے۔ ناظرہ اگر ایسی ہی رومانی سیرت ایسے ہی محبوبانہ اخلاق اور اسی قسم کی "نازشش" ہائے بیکراں کی حامل ہستی تھی جیسی کہ وہ خطوط میں نظر آ رہی تھی تو آج خدا کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرنے کے باوجود موحہ کہلائے کا مستحق تھا!

"ناظم! دیکھو ناظرہ کیسی جذبات نواز! کس قدر اخلاق پرور اور کتنی نیک نفس لڑکی ہے۔ بھی میں اپنی قسمت پر ناز کرتا ہوں" یہ کہہ کر وہ صوفے پر میرے قریب آ بیٹھا "اچھا یہ بتاؤ تم نے اپنے خطوط میں کیا کیا حماقت نگاری کی ہے" میں نے ناظرہ کے خطوط ختم کر کے کہا۔

"دیکھو جی! تم اب تک بزرگوں کی طرح میرے ساتھ پیش آتے رہے ہو اور میں بھی سعادت مندی برقرار رہا ہوں۔ لیکن اب بغاوت کر کے کہتا ہوں کہ تم نے اگر والد کی شان مستعاراً دکھائی تو دست درپیش کے عومن دست و گوش"۔

"فضول! کو اس نہ کرو۔ میری بات کا جواب دو۔ کیا تم اس سے محبت

کرتے ہو؟“

”ناظم! بات یہ ہے کہ ناظرہ ایک نہایت ہی شائستہ و نیک لڑکی ہے  
میں اس امر کا تو مدعی نہیں کہ اس کی پرستش کرتا ہوں کیونکہ میں نے  
اس کو دیکھا بھی نہیں ہے“  
مگر تم کو معلوم ہے :-

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد

بساکیں دولت از گفتار خیزد

”لیکن مجھے تو ابھی موقع گفتار بھی حاصل نہیں ہوا۔ اس کے خطوں کو  
پڑھ کر میں نے یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ محبت مجھ سے ہے“ اجمل نے کہا۔  
محبت کی تجسیم کا قائل ہونے سے قبل میں تمہارے اصلاح خیال  
کی غرض سے کہنا پسند کروں گا اگر محبت کا جسم ہی اختیار کرنا ممکن تصور کر  
لیا جائے تو وہ کم از کم ناظرہ کے جسم میں تو پناہ نہیں لے سکتی۔ ممکن ہے میری  
اس آزاد و بیانی سے تمہارے دل لہانہ جذبات مجروح ہو جائیں لیکن اجمل  
میں تم کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ قیاس کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے قبل خدا  
کی دی ہوئی اس قوت سے ایک بار اور کام لے لینا جس کو عرف عام میں عقل  
کہتے ہیں“ میں نے کہا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میری نصیحت کا اس پر کیا اثر ہوا۔ لیکن اس کی  
ہر حرکت سے مبالغہ کے ساتھ شہریت سرزد ہوتے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا  
کہ شخص اب تک

نیاز شیوہ ما عا جزان محتاج است

کی تعبیر کی پوری پوری کوشش کر رہا ہے۔ کس لئے؟ اس کے جواب

میں اس کے دل کی جملہ آرزو ناظرہ کے سوا اور کس کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ناظرہ اپنے الفاظ کی قوت سے ایک ایسی مدت کے لئے جس کی کوئی میعاد تعین نہیں کی جاسکتی اجل کی دلنشین ہو چکی تھی۔ اس قسم کی دلنشینی میں آپ خود غور کر لیجئے کہاں تک استواری ہو سکتی ہے۔ زمانہ مکاتیب کے بنائے ہوئے محبوبانہ خانہ کے اس وقت تک دلوں میں مرقم رہتے ہیں جب تک کسی جلیتے جاگتے خاکے کی بقی شعا عین روح دل پر نہیں پڑتی ہیں جب ”حسن مقید آب و گل“ سے سامنا ہو جاتا ہے تو پختلی خاک کے نیا منیا ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ حسن و جود ہی لیتا ہے۔

تین روز سے اجل مجھ سے اصرار کر رہا تھا کہ لاہور چلیں۔ میں جانتا تھا کہ اس سفر میں وہ امر تسر قیام کر کے ناظرہ سے بھی ملاقات کرنے کی کوشش کرے گا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس ملاقات میں کامیابی حاصل کرے گی جدوجہد میں وہ کوئی مجزومانہ حرکت نہ کر بیٹھے گا۔ چنانچہ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ امر تسر اس کو نہیں اترنے دوں گا۔

لاہور پہنچ کر ہم اپنے ایک ”قلمی دوست“ کے ہاں ٹھہر گئے۔ سردی کا زمانہ تھا اور لاہور کی سردی۔ رات کو سینا جانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی آخر اجل کے اصرار پر ہم دونوں ایک روز ایک مشہور سینما میں جا چکے۔ آج کل سینما میں لطف دو گونہ حاصل ہوتا ہے۔ تماشا دیکھنے کا اور محو تماشا حسین .... تماشائیوں کو دیکھنے کا لطف! اے! انہیں کس تمنائے ہم دیکھتے ہیں۔

اختتام تماشا پر میں اور اجل کسی ٹیکسی کو پکڑنے کی فکر میں تماشا گاہ کے باہر کھڑے ہوئے تھے ہماری نظروں سے تماشا پر رائے زنی کرتے ہوئے نام نہاد نقادوں کا سیلاب گزر رہا تھا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بے سینما

کی شوقین وہ لطیف ہستیاں گزر رہی تھیں جو اپنے برق پاشی بسک کی صفہ سامانی اور ”نہ نگ نگا ہی“ کا مظاہرہ اس شاہانہ طرز سے کیا کرتی ہیں کہ ”کے خبرے نباشد“ اور ہلاک ہونے والے ہلاک ہو جایا کرتے ہیں۔ ہاکی کھاہوں کے آگے سے ان حسرت پرست سوختہ ساماں بد قسمت نوجوانوں کا گروہ گزر رہا تھا جن کے بے برگ و بار نخل تنہا کو پھر سرسبز کر دینے کا وعدہ کسی بت حیلہ کرنے کو لیا تھا۔ لیکن اب جہاں استغنا منہ موڑ کر چل دیا تھا۔ پھر ہم سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

”ارے یہ کیا؟“ اجمل نے مجمع کی طرف جو دفعتاً اکٹھا ہو گیا تھا اشارہ کرتے ہوئے کہا ”چلو دیکھیں“ ہم دونوں لپک کر پہنچے۔ اف! عجیب نظارہ تھا۔ ایک خاتون کی ساڑھی میں آگ لگ رہی تھی اور وہ بولی کی طرح کھڑی ہوئی جھل رہی تھی۔ لوگوں نے پانی نہ ملنے کے باعث سوڈا واٹر کی بوتلیں اس کے کپڑوں پر خالی کرنا شروع کیں۔ لیکن آگ کے بے رحم شعلے اس کے بالائی حسین حصہ جسم پر اپنے آتشیں لہرے سے ثبت کرنے پر انصرار کئے جا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں سے مٹی مل جائے تو اس خاتون پر جلدی سے ڈول ڈوں۔ مگر تارکوں کی سڑک پر مٹی کہاں! دفعتاً جاننا زاجمل آگے بڑھا اور بہت تیزی سے اپنا اور کوٹ اتار کر خاتون کے تن سونماں کے گرد لپیٹ دیا۔ خاتون تڑپتے تڑپتے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کو صرف اتنا یاد تھا کہ کسی حوصلہ مند مرد نے کسی سے ٹیس لپیٹ کر اس کو گود میں لیا تھا۔

مجمع کے منہ سے داد محبتیں کے نعرے بلند ہونے شروع ہوئے۔ لیکن سر اسیمہ اجمل نے ان کی جانب توجہ نہیں کی۔ ایک بزرگ صورت مغرر

آدمی جو خاتون کے بہت قریب کھڑا تھا اور اس کی آگ بجھانے کی سعی بیکار میں اپنی انگلیاں جلا چکا تھا اس سے متشکرانہ لہجہ میں بولا "بہرہاں میں آپ کا جید ممنون ہوں۔ آپ نے میری بچی کی جان بچالی" یہ کہہ کر اس نے ایک ٹیکسی والے کو اشارہ کیا۔ اہل نے بیہوش خاتون کو اس میں لٹا دیا۔

"کیا عین اب تم چلے جانے کا ارادہ کر رہے ہو؟ کیا تم میرے غریب خانہ تک چلنے کی زحمت نہیں کرو گے؟ آہ کیا خبر میری بچی کی رات کو کیا حالت ہو جائے" بزرگ صورت نے بجاں اندوہ کہا

"اگر آپ مجھے اپنے ہم کاب چلنے کی اجازت دیتے ہیں تو مجھے عذر نہیں۔ ناظم (میں بھی ٹیکسی کے پاس آگیا تھا، کیا تم لپک کر کسی ڈاکٹر کو بلاو گے حضرت! ان میرے دوست کو اپنے مکان کا پتہ بتا دیجئے" اہل نے بڑھے سے کہا۔ میں بڑے میاں سے پتہ معلوم کر کے فوراً ڈاکٹر کو لینے چل دیا۔ راستہ میں مجھے خیال آیا کہ لیڈی ڈاکٹر کو لے چلنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ خاتون کا زیرین حصہ جسم زیادہ ماؤف ہے۔ جس کو برہنہ کرنا اٹا وہ ڈاکٹر کے آگے مناسب نہیں سمجھے گی۔

خدا خدا کر کے ایک قبول صورت (قبول صورت تو وہ اتفاق سے نکل آئی میری تلاش کو اس میں کوئی دخل نہ تھا) لیڈی ڈاکٹر ہاتھ لگی۔ لیکن وہ آہ میں ایک نااستہنا کے ساتھ نکلنے میں کرے، لیکن تکلف میں نے ان کو شہریانہ طور پر کہہ دیا کہ اگر وہ اپنے اطمینان کے لئے شہنشاہ جارج پنجم کے باڈی گارڈ کو ساتھ لینا چاہتی ہیں تو میری طرف سے اجازت ہے وہ بننے بیٹھیں اور اپنے بڑھے چوکیدار کو (جو ان کی حفاظت کے موقع پر شور مچا کر صرف لوگوں کو جمع کرنے کے کام آسکتا تھا) ہمراہ لے لیا۔ ہم گاڑی میں

بیٹھ گئے اور بڑھے کے مکان کا رستہ لیا۔ میں نے مریضہ کی کیفیت ڈاکٹر سے بیان کر ہی دی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس کے متعلق راستہ میں مجھ سے اور کوئی سوال نہیں کیا۔ میں حادثہ کا اور جمل کی صحیح خدمات کا خیال کر رہا تھا کہ لیڈی صاحبہ کے ایک سوال نے مجھے چونکا دیا۔

”کیا آپ شادی شدہ ہیں؟“

”بفضلہ نہیں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”مجھو؟ انہوں نے میرے جواب سے مطمئن نہ ہو کر پوچھا۔

”الحمد للہ!“ میں نے کہا۔

”نواب پھنٹے آپ؟“ خوش مزاج لیڈی صاحبہ نے کہا۔

”کہاں؟“ میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

”وہیں اس مریضہ کے دام..... اس مریضہ کے گھر میں“ انہوں نے کہا۔

”آپ شاید دام گیو فرما رہی تھیں۔ آپ نے ناحق شہریت کو کھنکھی

سے بدل ڈالا ہاں لویہ جس خیال آپ نے کس بنا پر قائم کیا؟“ میں نے پوچھا

”آپ نے ایسے قصے غائبانہ دلوں میں پڑھے ہوں گے، ایک نوجوان

کو حوادث و اتفاقات کسی حسینہ کے جاوہ حیات کے درمیان لے آتے ہیں

لیڈی صاحبہ نے کسی قدر حیا آگیاں لہجہ میں کہا۔

”مگر لیڈی صاحبہ“ یہ عیش آفریں حادثہ“ فی الحقیقت کسی مرد کو کسی حسینہ

سے دوچار کرار ہا ہے تو بد قسمتی سے وہ مرد میں نہیں ہوں، بلکہ میرا ایک دوست

ہے چنانچہ اپنے آزاد رہنے پر مجھے ایک نعرہ مسرت بلند کرنے کی اجازت

دیجئے۔ آہ لیکن نہیں۔ میرے ساتھ بھی ایک واقعہ پیش آگیا ہے.....

اجازت ہو تو عرض کروں !“ میں نے کہا۔

”سنائے سنائے“ انہوں استیقا نہ پوچھا۔

”میں بھی اس رات کو پروان پار ہاؤس وجہ سے... کیا بناؤں زبان یاری نہیں کرتی خیر سنے۔ ادھر میرا دوست حادثاً ایک خاتون کے جادوہ زندگی میں جا کھڑا ہوا ہے۔ ادھر اتفاقاً میں ایک لیڈی کے ساتھ بند گاڑی میں اڑا ہوا جا رہا ہوں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں اس سے قبل میں نے کسی خاتون کے اس قدر قریب بیٹھنے کا خیر حاصل نہیں کیا جس قدر آجناہ کے متصل جگہ ملنے کا آج شرف حاصل ہوا ہے۔ یہ ہے میری زندگی کا ادھورا پروان۔ اب ۵

آپ چاہیں تو مرادیں مری پوری کر دیں، کام اپنا جو فقط عرض تھا کرنا نیاز مند آداب عرض کرتا ہے“ میں نے لیڈی صاحبہ کے سنجیدہ بشرے کی طرف متوجہ کیا جس پر میری نقالانہ حرکات سے تبسم خنی کے آثار پیدا ہو چلے تھے ”آپ عجیب منہ پھٹ انسان ہیں“ لیڈی صاحبہ نے نیچی نظروں سے فرمایا۔

”خطا معاف“ آپ ہی نے پہلے دعوت روان دی آپ ہی نے لطیف جذبات مجھ پر مسلط کئے۔ اگر ارشاد ہو تو میں پھر صحرا کے عرب کی طرح جادو خشک بنا جاتا ہوں۔ لیکن یہ واضح رہے ۵  
ہاتھ ہمارے یا وہ ہیں پھر باتیں ایسی نہ چلے گا۔

کہتے کسی کو سنئے گا تو پہروں سر کو دھسے گا  
اس آفتاب میں مریضہ کا مکان آگیا۔ میں لیڈی ڈاکٹر کو لے کر اندر داخل ہوا تو بیڈ سے اس کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا

یڈی صاحبہ نے مریضہ کی صورت دیکھ کر حیرت سے کہا: "ہیں ماس یوسف میں ان کو خوب جانتی ہوں۔ اچھا تو جناب میں مسٹر یوسف؟ یہ ایک دوبار مجھ سے مل چکی ہیں۔"

"میں اپنے زمان کا واسطہ دے کر آپ سے کہتا ہوں کہ ان کا علاج ذرا توجہ سے کیجئے گا۔" یہ فقرہ میں نے آہستہ سے کہا۔ یڈی صاحبہ نے اہل کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اجل نے جھینپ کر آنجہیں پہنچی کر لیں اچھا جناب ہیر و صاحب اور نیم ہیر و صاحب (یہ میں تھا آپ براہ کرم ذرا کمرہ خالی کر دیں) حسین ڈاکٹر نے کہا۔ ہم اس "نیم ہیر و" کے جرات انسانا لفظ پر سمجھے کہ چھنیں یڈی صاحبہ۔ چنانچہ عاشقانہ اثرات اپنے چہرے پر پیدا کر کے ان کی جانب دیکھتے ہوئے باہر جانے لگے۔ لیکن جو اب انھوں نے ہم کو یہی "عشق آثار" اور "محبت جھڑاؤ" نظر سے دیکھا کہ ہم دل میں سخت خفیہ ہوئے اور سینے پر سرسنگے باہر نکل آئے۔

ناظم اس قدر حسین لڑکی ہے وہ! "اجل نے بیمار عاتق کے متعلق کہا۔ پیشانی اگرچہ زیادہ بلند نہیں ہے لیکن ابروؤں کے قائلانہ خم نے اس کی بہت بڑی حد تک تلائی کر دی ہے۔ کیوں جی! کسی حسین یا غیر حسین انسان کو دیکھنے کے بعد اس کے متعلق جو اثرات اولین پسندیدگی یا نفرت کے پیدا ہو جایا کرتے ہیں وہ عارضی ہوتے ہیں یا مستقل؟ "اجل نے دریافت وہ ہوتے تو ہنگامی ہیں۔ لیکن حب "مشہود" سے تمہارا سابقہ پڑتا ہے اور تم اس کے اخلاق سے بھی متاثر ہوتے ہو تو اس وقت کے ارتکاب "دیرپوند" ہوتے ہیں۔ تم شاید آرزو محسوس کر رہے ہو کہ یہ لڑکی دائمی طور پر تمہارے قبضہ میں رہے اسی "حسین دہم" کا نام محبت ہے۔ خیر تو تم۔۔

اصطلاح عام میں اس پر عاشق ہو چکے ہو" میں نے کہا۔

"عاشق تو بہت وزنی لفظ ہے۔ لیکن میں اس لڑکی کو اپنی روح کی بلند ترین سطح پر متمکن پاتا ہوں۔ اسی خیال کی استواری کا نام محبت ہے، تاکہ تمہارے بیان کردہ یہودہ مقالہ کا" اس نے کہا۔

"آپ لوگ اندر آ سکتے ہیں" آدھ گھنٹہ بعد لیڈی صاحبہ نے اندر سوزاوارہ دے کر ہم کو کہا۔ چنانچہ اجل حریصانہ مجروح خاتون کو اور میں در دیدہ نظروں سے لیڈی صاحبہ کو دیکھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

لیڈی صاحبہ نے سنان رات میں سنبگاری کے اندر مجھے گفتگو کر کے میرے تنگ محبت دل میں گدگدی سی پیدا کر دی تھی۔ اب جو میں ان کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ چتون بدلنے لگیں اور جب چپ چاپ بیٹھ گیا تو سقراط کا شاگرد کہہ کر میرا مذاق اڑانے لگیں عجیب مصیبت تھی۔ مجروح حسینہ کو ہوش آچکا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی غلافی آنکھیں وا کر کے حیرانی سے دیکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد زخموں کی سوزش سے کراہنے لگی کیے بعد دیگرے اس کو تمام واقعات یاد آنے لگے تو اس نے کمرے کی "موجودات" میں اس سہنی کو تلاش کرنا شروع کیا جس نے سر گرمی سے آگ بجھا کر اس کو گود میں اٹھا لیا تھا۔ اس کا باپ آبدیدہ آنکھوں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ لیڈی صاحبہ اس کے قریب آئیں اور بولیں "ہو مس یوسف! تم کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے بڑا رنج ہے۔ اطمینان رکھو خدا کے فضل سے تم کو زیادہ گزند نہیں پہنچی ہے۔ تم کو ان دونوں حضرات کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے بڑی وقت تمہاری مدد کی"

"میں عمر بھر آپ حضرات کا زیر بار منت رہوں گا" حسینہ کے والد

نے اپنی بیٹی کی جانب سے شکریہ ادا کر کے کہا۔

”آپ کے شکریہ کا تمام تر مستحق میرا دوست اجمل ہے“ میں نے کہا۔

”اچھا جناب کا اسم گرامی اجمل ہے؟ آپ شاید یو۔ پی کے باشندہ

میں؟“ یوسف نے کہا۔

”آپ کا قیاس درست ہے۔ دہلی وطن ہے یہاں تفریحا آئے ہیں

میں“ اجمل نے بخروج حیدر کے سر ہانے کرسی سے جاتے ہوئے کہا۔ سب نے

بہت کم ہماری گفتگو کی جانب متوجہ ہوئی صرف کبھی کبھی وہ اجمل کی جانب ایک

نگاہ غلط انداز ڈال لیا کرتی۔

”آپ کو کیا نام ہے؟“ لیڈی صاحبہ نے چپکے سے مجھ سے پوچھا۔

”میرا نام ڈانم ہے“ میں نے اس کو سناٹے سے لے ڈرا زور سے کہا تاکہ

سب سن لیں۔ بغیر سوال کے اس طرح خود بخود اپنا نام یوں نعرہ جنگ کی طرح

ظاہر کرنے سے ہر شخص ہنسنے حیرت سے دیکھنے لگا اور لیڈی صاحبہ نے تو اس

فہر آلود نظروں سے مجھے گھورا کہ میں اگر کسی آئینہ گیرادہ کا بنا ہوا ہوتا تو ان کی

شعلہ ریز آنکھوں کی قوت سے جل کر جسم ہو جاتا۔ یوسف صاحب کے

چہرے پر بھی آثار تبسم تھے وہ بولے۔ ”آپ کا اسم گرامی دریافت نہ کرنے

سے شاید آپ کو تادم آ گیا ہے۔ محاف کیجئے گا۔ میں ممنون ہوں کہ اپنے

اسم گرامی سے بھی آپ نے آگاہ فرما دیا۔“

”کہئے کیسی رہی؟“ میں نے آہستہ سے لیڈی صاحبہ سے کہا جو غصہ

سے اٹھ کر دور جا بیٹھیں۔

”اچھا جناب اب اجازت دیجئے“ میں نے اپنی لٹپی کے لئے ہاتھ

بڑھا کر کہا۔

”توقع ہے کہ آپ حضرات صبح ہی تشریف لائیں گے“ مٹر پوسٹ کہا  
”ضرور! اگر اجازت ہو تو میں آپ کو واپس مکان بھی پہنچا دوں میں  
نے لیڈی صاحبہ سے کہا۔

”شکریہ! اب واپسی میں آپ کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے“  
ناراض لیڈی صاحبہ نے ہنسنے پھلا کر جواب دیا۔ اجمل نے مرینہ کے سر ہانے  
جگا کر پہلی بار اس سے یہ غیر مسلسل فقرے کہے ”آپ زیادہ پریشانی نہ  
ہوں۔۔۔۔۔ انشا اللہ جلد صحت یاب ہو جائیں گی میں دونوں  
دفت مزاج پر سی کو حاضر ہوا کروں گا۔۔۔“ مرینہ نے تشکرانہ نگاہوں  
سے اجمل کی جانب دیکھا اور نحیف آواز میں اس کا شکریہ ادا کر کے چپ  
ہو گئی۔ لیڈی صاحبہ نے بھی صبح آنے کا وعدہ کیا اور اپنی دواؤں کا کچن  
اٹھا کر چلنے لگیں مگر میں نے لپک کر کہیں ان کے ہاتھ سے چھین لیا۔ وہ  
اور ہم مکان سے نکل کر گھاڑی کی طرف چل دئے۔ اجمل کوٹ دنگر پہنچتے  
میں پیچھے رہ گیا تھا۔ لیڈی صاحبہ جب گھاڑی میں بیٹھ گئیں تو میں نے  
منہ زنا کہا۔ ”بجے افسوس ہے کہ میری اس حرکت سے آپ کو صدمہ پہنچا  
کیا آپ مجھے معاف فرمائیں گی“ اس کے جواب میں اس بت فنانے منہ پھیر  
لیا۔ منہ زت کے جو الفاظ شایاں تھے وہ میں صرف کہ چکا تھا۔ اب ”پیش  
دستی“ کا رہا باقی تھا۔ لیکن اتنی جرأت کہاں سے آتا آخر میں نے پھر حلق پھاڑ  
کر کہا۔ دیکھتے آپ خواہ مخواہ بات بڑھا رہی ہیں آپ نے ہم کو نیم میر و کبہ یا تو نیم  
لے چوں تک نہ کی۔ مگر آپ ہیں کہ ہماری اس ذرا سی حرکت پر خفا ہو گئیں۔“  
”نیم میر و کبہ دینے میں کیا مضائقہ تھا“ لیڈی صاحبہ نے تیوری پر بلی ڈاکر

مجھے آپ کے نزدیک کوئی مصافحہ ہی نہیں آپ نے ہمارے دوست کے سامنے ہمدی توہین کر دی۔ اس کو تو پورا سیر دینا یا اور ہم کو نیم ہی رہنے دیا میں نے یہ کچھ ایسی روئی صورت بنا کر کہا کہ لیڈی صاحبہ کو ہنسی آگئی۔ میں نے حجاب کر ایک فرشتی سلام کیا اور منتظر اجل سے آ ملا۔

”یہ لیڈی صاحبہ آپ سے بہت مانوس ہو گئی ہیں“ وہ بولا۔

”نہیں جی مانوس و انوس کچھ نہیں ہوئی ہیں۔ خوش اخلاق عورت ہے۔ ہر ایک سے بات کرنے کی عادی ہے“ میں نے کہا۔

اپنی فرو دگاہ پر آ کر میں تو آرام سے سو گیا۔ کیونکہ جس طرح ”خالی دل“ لے کر گیا تھا اسی طرح اس کو بے داغ داپس لے آیا۔ لیکن اجل اس خاتون کے کپڑوں کی آگ بجھا کر اپنے دل میں آگ لگالایا تھا۔ اس کی انگلیاں جابجا سے مجلس لگتی تھیں لیکن جگر اس سے بھی زیادہ مجلس گیا تھا۔

ہائے اس زخمی شمشیر محبت کا جگر درد کو اپنے جونا چار چسپا رکھتا ہو میرا خیال ہے کہ وہ شب بھر نہ سو سکا تھا۔ کیونکہ صبح اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس نے کپڑے پہنے اور یوسف صاحب کے مکان پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ میرے سر میں سخت درد ہو رہا تھا چنانچہ میں نہیں گیا۔

اجل صبح کا گیا ہوا شام کو لوٹا۔ اس نے صبح کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ میں نے اس طویل غیر حاضری پر اس کی خبر لیلتے ہوئے کہا ”دیکھو جی بیمار پرسی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم وہاں دہرنا ہی دے کر بیٹھ جاؤ۔ اگر تم کل پھر تمام دن غائب رہے تو میں اس خاتون سے کہہ دوں گا کہ یہ شخص تمہارے پاس ازراہ استمرار نہیں آتا ہے بلکہ اپنی حماقت تاب محبت سے مغلوب ہو کر آتا ہے“

”ازیں چہ بہترایہ تو اچھی بات ہوئی کہ میرے جذبات محبت کی تم تر جہانی  
کر دو مجھ سے تو شاید قیامت تنگ بھی اس خاتون کے آگے اظہار محبت نہ ہو گا۔  
ارے میاں وہ تمہاری لیڈی ڈاکٹر پوچھ رہی تھی تم کو“ اس نے یہ فقرہ بطور  
رشوت کے ادا کیا تاکہ میں اپنی چیرہ دستی سے باز آ جاؤں۔

”کیا پوچھا تھا انھوں نے“ میں نے اپنے سوال میں اشتیاق کی حرارت  
پوشیدہ رکھتے ہوئے کہا۔

”پوچھنے لگیں کہ وہ نیم سیر و صاحب نہیں آئے؟“ اجمل نے منہ کر کہا  
”نیم سیر؟“ میں نے غصہ سے کہا۔ ”نیم سیر دکھا تو انھوں نے مجھے بھرا اچھا  
میں نے تہیہ کہ لیا کہ صبح بیمار خاتون کے مکان پر جا کر لیڈی صاحب سے اس  
توہین پر سخت باز پرس کروں گا۔

”مجھے لیڈی صاحبہ نے پوچھا تھا؟“ میں نے رات کو اپنے بستر پر پڑ  
پڑے کئی بار خیال کیا۔ مرد کس قدر جلد فریب توقع کھا جاتا ہے! آخر لیڈی صاحبہ  
کی اس پرسش میں کونسا ایسا سحر تھا کہ جس نے مجھے توقعات کے سراپ میں  
لے جا کر پھنسا دیا۔ اور وہ نیم سیر؟“ میں نے تمام اپنے مفتوحانہ خیالات کی نفی  
کر کے دل میں کہا۔ ”نیم سیر وہ بھی تو کہا تھا انھوں نے مجھے۔ دیکھو کیسی خبر لیتا ہوں  
صبح ان کی“ اپنی خیالات میں سو گیا۔

ناظرہ کی حسین تحریر اور رنگین عبارت سے اجمل محبت کے بخار میں  
متہللا ہو چکا تھا یعنی وہ بے عشق اس کو پہلے سے لگ چکی تھی۔ لیکن اب حسن  
کی سوز کاریوں نے اس قدر مہلک اسباب پیدا کر دیئے تھے کہ وہ ہلاک عشق  
ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بیمار خاتون کی دلفریب ادائیں اس کی مشکرا نہ بنگاہیں  
اور اس کے خاموش کنایات جن کو اگر نطق کی قوت سنجیدی جاتی تو وہ ایک

ایسا حشر جذبہ بات ایک ہنگامہ جراحت رسانی پیدا کر سکتے تھے کہ آج کل تمام عمر پھر آستانہ محبت سے سر نہ اٹھا سکتا تھا ع

حسن ہی کیا نہ و بالا جو نہ عالم کر دے!

صبح ہوتے ہی ہم نے جلد جلد ناشتہ کیا اور بیمار خاتون کے مکان پر پہنچے۔ لیڈی صاحبہ ابھی نہیں آئی تھیں۔ ہم نے بیمار خاتون کی مزاج پر ہی کی جس کا جواب اس نے نہایت مہذبانہ طریقے پر دیا۔ اس کی ساحرانہ سیاہ آنکھیں اپنے اندر اعجاز سامری پہنچا رہی تھیں۔ اس کے دراز و سیاہ کیسو ایک گنہگار کے نامہ اعمال سے بھی زیادہ طویل و سیاہ تھے۔ اس کی آواز میں ایک رس تھا جس کو نقاہت نے کسی قدر چھینکا کر دیا تھا۔

میں اس کے اخلاق کے متعلق صحیح رائے ظاہر کرنے سے معذور ہوں لیکن اگر بات چیت اور چند حرکات سے کسی کے اخلاق کے متعلق ایک قیاسی خاکہ قائم ہو سکتا ہے تو میں بھی اس کے پر غلو رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی ذات کے متعلق ایک بہت بلند رائے رکھتی تھی۔ ایسی رائے جس کا اظہار سادہ اردو میں لفظ ”خود بینی“ سے ہو سکتا ہے۔

ہمارے آنے کے چند منٹ بعد مسٹر یوسف نے مجھے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا ”آپ حیران ہوں گے کہ میں کون ہوں اور اس طرح آزاد زندگی کیوں گزارتا ہوں؟ اجازت دیجئے کہ میں آپ حضرات کی حیرانی رفع کر دوں۔ میں دراصل نو مسلم ہوں اور امت سر میں وکالت کرتا ہوں میرا اسلامی نام محمد یوسف ہے۔ یہ میری لڑکی ہے اور فرسٹ ایئر میں پڑھتی ہے۔“ کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ نے اسلام کی کونسی خوبی سے متاثر ہو کر اس کو قبول کیا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”خوبی؟ آپ کا عجیب سوال ہے۔ اسلام تو ہمہ خوبی ہے۔“ دین دار  
نومسلم نے کہا۔

”میرا مقصد یہ ہے کہ کیا آپ بھی اسلام کے متعلق کسی خاص عقیدہ کے  
موجب ہیں جیسا کہ آج کل چند بر خود غلط مسلم مفکر کر رہے ہیں۔“  
میں کسی اعتقاد کا موجب تو نہیں ہوں۔ ہاں لیکن عقیدہ کے متعلق ایک  
نئے خیال کا مخترع ضرور ہوں۔ قرآن کی پیش کردہ تعلیم تو ہونی چاہیے ہر  
مسلمان کے عقیدے میں داخل اور باقی جتنی مذہبی مونیگا فیاں ہیں ان کو میں  
فلسفہ کی تنقید میں جگہ دیتا ہوں۔ مختلف اسلامی عقائد کے سیاق و سباق کے  
بحث میں مبتلا ہونے کے عوض میں ان کو فلسفہ کے شعبہ میں رکھ کر صرف  
مطالعہ کی چیز سمجھتا ہوں تاکہ عقیدہ کی۔ آپ اعتراض کریں گے کہ فلسفی کا  
کیا کہنی عقیدہ نہیں ہوتا ہے؟ تو معاف فرمائیے میں عرض کر دیا گا کہ اس  
کے عقیدہ کی مثال ایسی ہے جیسی پودے کی۔ جب تاک آپ اس کی آب  
یارائی کرتے رہیں گے وہ ہمہ سبز رہے گا۔ بیکر کر دیں گے تو خشک ہو جائیگا  
اسی طرح فلسفہ جب تاک مولد استدلال و عقل موجود ہیں قائم ہے اور اگر عقل  
اولہ پیدا ہو گئے تو اس کا تار پود بھی بھجھ جاتا۔ . . . .“

”مجھے آپ کے نظریہ سے ذرا اختلاف ہے“ میں نے کہا۔  
”آپا میں اس بحث میں مطلق درجہ نہیں کر رہی ہوں۔“ بیمار خاتون  
نے کہا۔

”اچھا شبیلا! ہم بھی اس کو ختم کرتے ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر اب تک نہیں  
آئی۔“ یوسف صاحب نے کہا۔ ابھی یہ جملہ ان کے منہ سے نکلا ہی  
تھا کہ لیڈی صاحبہ بکس در دست قمری ساڑھی باندھے ہوئے مسکراتی اند

داخل ہوئیں۔

”اللہ عز و جل نے ان کے جمال کو دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ انہوں نے ایک ایسی تیکی چٹون مجھ پر ڈالی کہ میں وہیں تحلیل ہو کر گویا ”آپ ہی کا ذکر جمیں ہو رہا تھا“ میں نے خوشامدانہ کہا اور بڑھ کر ان کے ہاتھ میں سے دوا کا بکس لے لیا۔ چند منٹ بعد ہم پھر مثل سابق کمرہ میں سر نکلے گئے مریہم بی بی ہوئی اور پھر واپس اندر آ گئے۔

”کل کہاں غائب تھے مسٹر نیم پیرو؟“

لا حول ولا قوۃ! میں اس توہین کا انتقام لینے تو آج آیا تھا۔ بالکل بھولا گیا۔ باز پرس سے قبل ہی لیڈی نے پھر ایک بار میری توہین کر دی۔ آخر میں نے غصہ سے کہا ”دیکھئے جنابہ! آپ کئی بار میری اہانت کر چکی ہیں۔ مجھے نیم پیرو کہنے کا آپ کو کیا حق ہے؟“

”حق؟“ یہ لفظ لیڈی صاحبہ نے اس قدر شیریں لہجہ میں کہا اور اس کے بعد اس قدر شیریں نظر سے مجھے دیکھا کہ میں ایسا محسوس کرنے لگا گویا شہید کے تالاب میں غوطے کھا رہا ہوں۔ آخر میں نے حلق پر ٹائی کی گکہ درست کر کے کہا۔

نواں چشمہ قند مکر روزاں لباب

بتواں شنود تلخ مکر شنودہ ما

یوسف صاحب نے اس شعر سے بہت لطف حاصل کیا اور پس منہ سے بولے ”آپ سمجھیں کیا اچھی بات کہہ گئے ہیں یہ حضرت؟“ ہم نے اتنی فارسی نہیں پڑھی ہے ”لیڈی صاحبہ نے جواب دیا۔“ اجازت ہو تو میں عرض کر دوں اس کا ترجمہ ”شیراز بیمار خالوں نے

اس شعر سے خط حاصل کر کے کہا۔

” رہے دو اگر غلط ترجمہ کر دیا تو خواہ مخواہ اتنے آدمیوں کے آگے  
خفت اٹھانی پڑے گی“ لیڈی صاحبہ نے جواب دیا۔ چند منٹ بعد میں  
نے جاننے کے لئے پُر تو لے تو لیڈی صاحبہ نے کہا: آپ کو آخر اس قدر  
جلد بھاگنے کی جلدی کیوں رہتی ہے؟ کیا آپ یہاں کسی شے میں دلچسپی  
محسوس نہیں کرتے؟“

” ان کو تو چند فرسودہ کتابوں اور تاریک گوشہ تنہائی سے دلچسپی ہے“  
اجنس نے کہا۔

” اسی طرح آبارت دن کتابوں میں سرکھپایا کرتے ہیں“ شیلانے کہا۔  
” اور آپ کے خاطر پسند مشاغل کیا ہیں؟“ اجنس نے شیلانے سے دریافت کیا  
” کوئی خاص مشغلہ مرعوب نہیں ہے۔ ہر شے میں دلچسپی لیتی ہوں“ اس نے

جواب دیا۔

” اچھا بھائی اب میں تو عدالت جاتا ہوں۔ ایک ہفتہ سے نہیں گیا  
ہوں۔ مقدمات خراب ہو رہے ہیں“ یوسف صاحب نے کہا۔ اس  
کے بعد وہ ہمارا شکریہ ادا کر کے چل دئے۔ اب ہم چاروں رہ گئے۔ میں  
نے چپکے سے اجنس کو بھی اٹھے کا اشارہ کیا لیکن شیلانے یہ چوری پکڑ لی۔  
بولی ” صاحب! چلے جائے گا۔ ایسی کیا عجلت ہے۔ کھانے کا وقت قریب  
آگیا ہے“

” غلط! آخر میں بھی تو کسی کا نہان ہوں“ میں نے کہا۔

” آپ کن لوگوں میں رہے ہیں؟“ یوں جواب دیا جاتا ہے کسی کی  
مریانا نہ درخواست کا“ لیڈی صاحبہ نے فرمایا۔

”لیڈی صاحبہ! مسٹر ناظم بہت صاف گو اور بے تکلف انسان ہیں اجمل نے کہا۔“

”اس کے برعکس آپ تکلف مجسم ہیں“ شیلڈ نے اجمل سے کہا۔  
 ”مطلق نہیں“ اجمل نے محبت کی نظروں سے شیلڈ کو دیکھ کر جواب دیا۔  
 لیڈی صاحبہ میری آزاد گفتگو اور بے ریا اطوار سے بہت متاثر ہوئیں  
 میں نے ان کی نگاہ میں ایک ارفع جگہ حاصل کر لی تھی۔

”اجمل صاحب آپ کے مرغوب مشاغل کیا ہیں؟“ شیلڈ نے اس کی پُر  
 اشتیاق نظروں کا جواب دے کر پوچھا۔

”کسی خاتون کے کپڑوں کی آگ بھجانا“ میں نے کہا۔ شیلڈ ہنس دی  
 اور لیڈی صاحبہ نے بھی ہنسنے لگا۔

”لیکن دوسروں کی آگ بھجنا کہ اپنے کو سپرد آتش کر دینا یہ بھی تو میرا  
 مشغلہ ہے۔“

اس نے کہا۔

”ہاں اور پھر لیڈی ڈاکٹر کے لئے دوڑنا یہ میرا مشغلہ ہے“ میں نے کہا  
 ”غرض کسی طرح سے نیم میرے رہنے کی کوشش کرنا یہ ہے دراصل  
 آپ کا مشغلہ“ لیڈی صاحبہ نے کہا۔

اور نیم پیرو بن جانے کے بعد ننگاڑی میں رومان پیدا کرنا کیا آپ  
 اس کو میرا مشغلہ نہیں کہیں گی؟“ میں نے کہا۔ اس ملیج پر شیلڈ نے ہنسنے سے  
 دیکھا۔ میں نے اس کی حیران آنکھوں کو لیڈی صاحبہ کی جانب متوجہ  
 کر دیا۔ جس سے وہ کسی قدر بجا کیوں۔

اجمل نے پھر شیلڈ کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ کر دریافت کیا

شیلڈ آپ رومان کو کس حد تک روح انسانی سے قریب سمجھتی ہیں۔  
 "اس حد تک جس حد تک گدھے کی آواز سے وحشت کا ہو جانا" میں  
 نے پھر دخل در معقولات کر کے کہا۔

"آپ بالکل غیر شاعر انسان ہیں۔ ناظم صاحب! شیلڈ نے کہا۔  
 "اچھا بتائیے آپ کو سب سے زیادہ کونسا شعر پسند ہے؟" لیڈی  
 صاحبہ نے مجھ سے دریافت کیا۔

"آں نہ من با شتم کہ روزے جنگ . . . . . الخ" میں نے کہا۔  
 "اردو کا بتائیے" انھوں نے کہا۔

جر جری نے ماما ہو جری کے سینک

تو جری بھی مار جی جری کے سینک

میں نے اردو کا شعر ناکر کہا۔ سب ہنسنے لگے۔

جب ہم چلنے لگے تو شیلڈ نے شام کے کھانے کا اصرار کیا۔ غرض چھ  
 بجے کے قریب شریک طعام ہونے کو پھر اس کے مکان پر پہنچ گئے مگر یوسف  
 بھی موجود تھے میں نے ان سے دریافت کیا کہ وہ اپنی لڑکی کو پردے میں کیوں  
 نہیں رکھتے؟ اس کا وہ کوئی جواب شافی نہ دے سکے۔ صرف یہ کہا کہ وہ شرعاً  
 ہی سے (یعنی ان کے اسلام قبول کرنے سے پہلے ہی سے) بے پردہ رہی ہو  
 اب اس کا پردہ میں رکھنا فضول ہے۔ غرض یہ پر لطف صحبت ۱۰-۱۱ بجے تک  
 قائم رہی جس میں لیڈی صاحبہ کی شوخ گفتاری، شیلڈ کی محبوبانہ اداکاری اور میاں  
 آجمل کی ناز برداری نے مزید لطف کا اضافہ کر دیا تھا۔ بارہ بجے کے قریب ہمس  
 لوگ اٹھ کر چلے آئے تھے۔

لاہور آئے ہم کو بیس دن ہو گئے تھے۔ میں نے آجمل سے کئی بار وطن

چلے کو کہا مگر یہ دل فرورن انسان آج کل آج کل کرتا رہا۔ آخر تنگ آکر میں نے تنبیہ کر لیا کہ وہ چلے یا نہ چلے میں تو صبح دہلی روانہ ہوتا ہوں۔ اپنے اس ارادہ سے جب میں نے اسے آگاہ کیا تو وہ پریشانی سے بولا "ناظم میرا مقصد یہ ہے کہ آج میں شیلہ سے جا کر اپنی محبت کا اظہار کر دوں"

"اجمل! میں تمہارے اس خیال کی مخالفت کرتا ہوں۔ اگر شیلہ کو تم سے محبت نہ ہوئی تو تم کو سخت صدمہ ہوگا۔ اس کے علاوہ محبت جیسی شے کا اگر دنیا میں وجود ہے تو وہ ظاہر کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ ضبط کے رہنے کی چیز ہے۔ محبت دہی ہے جو طوفانِ تمنا سے خالی ہو۔

ہوائے وصل کے می کند کہ بوالہوس است

دراں دے کہ محبت بود منتانیت

اجمل نے میری نصیحت پر توجہ نہیں کی۔ بارہ بجے جب کہ مسٹر یوسف عدالت جا چکے تھے وہ غیر متوقع ان کے مکان پر جا دھکا۔ اس کی اس اجانک مداخلت سے شیلہ پہلے تو متحیر ہوئی لیکن اس کے اپنے دل میں بھی تو اجمل کی پیدا کردہ غلش موجود تھی۔ جس نے اس کی حیرانی کو رنج کر دیا۔ "خیریت اجمل صاحب! اس وقت کیسے آئے؟" اس نے سادگی سے دریافت کیا۔

"میں تم سے ملے آیا ہوں شیلہ" اس نے غیر مستقل لہجہ میں کہا "مجھ سے ملنے؟" اس نے دل ربائی سے پوچھا۔

"ہاں میں کل دہلی جا رہا ہوں۔ خیال ہوا کہ تم سے بھی مل لوں۔ کیا یہ میری مداخلت تم کو ناگوار ہوئی؟"

"نہیں"۔ شیلہ نے مختصر جواب دیا۔

”شیلا! اجمل نے اس کو انتہی قانہ دیکھتے ہوئے کہا۔ شیلا نے جواباً اپنی حسین آنکھیں اس کی جانب متوجہ کر دیں۔

”کیا تم کو میری اس جذباتی کارنج ہوگا؟“ اس نے بیٹا بانہ دریخت کیا۔  
 ”شاید!“ اس نے دھیمے سے کہا۔ چند منٹ بعد پھر پوئی ”آپ اب پھر کب آئیں گے لاہور؟“

”اب کیا کروں گا؟ آکر اس بار تو اتفاقاً آ گیا تھا“ چند منٹ تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد شیلا نے مسکرا کر پوچھا ”آپ نے اس وقت دھوپ میں آنے کی تکلیف کیوں کی؟“

”شیلا تم اس کو تکلیف سے تعبیر کرتی ہو۔ اگر تمہاری اصطلاح میں تکلیف ایسی ہی پر لطف شے کا نام ہے تو میں تمام عمر تمہاری اس عطا کردہ تکلیف میں مبتلا رہے کو تیار ہوں“ ناظر نے نہایت پرسوز لہجہ میں کہا اس کا خیال تھا کہ جو کچھ اس کو کہنا چاہیے وہ کہہ چکا تھا۔ لیکن شیلا بائز استغنا بیٹھی رہی۔ آخر اس نے پھر کہا۔

”خاتون! تم مجھے معاف کر دو گی..... مجھے آج اپنے غیر واضح جذبات کی صراحت کر دینی چاہیے..... میں تم سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہارا حیات بخش خیال فردوسی لطافت کی طرح میری روح پر مسلط ہو گیا ہے..... اور تمہاری مفارقت کا تصور مجھے جہنمی..... صعوبتیں میں مبتلا کر رہا ہے.....“ شیلا! ”

پوشیدہ ملازمت چلا جائے تھا سو آج

بے طاقتی نے دل کی وہ پروہ اٹھا دیا

اس کے بعد وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر گھٹنوں کے بل سٹیلا

کے پیٹنگ کی پٹی پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ شیلے اس سرور انگیز اعلان سے متاثر ہو کر اپنے گوشہ رخسار کو جمل کی پٹی پر رکھی ہوئی کپکپاتی آنکلیوں پر رکھ دیا۔ اس کے بعد کے پرشعریت اقدامات ایسے تھے جنہوں نے دو نشنہ الفت روجوں جس لبوں کی مضرب سے ”لطیف نعمات“ کی روح پرور گونج پیدا کر دی۔ جب ناظر میرے پاس آیا تو اس کے عضو عضو سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ میں نے اس کی محبت کی کامیابی پر اس کو مبارک باد پیش کی اور دوسرے روز صبح دہلی چل دیے یہاں آکر جمل کی وحشت دیدنی تھی۔ ناظرہ نے بذریعہ منطوق اس کے اندر ریش کی حرارت پیدا کر دی تھی۔ لیکن شیلے نے اپنے مسخر کن حسن سے حرارت کو اس درجہ تیز کر دیا تھا کہ حرارت و حرارت زدہ دونوں ایک ہی مادہ کے بنے ہوئے نظر آئے لگے تھے۔

دوسرے ماہ سے میں اس فکر میں مبتلا ہو گیا کہ اگر جمل کے سکون طلب جذبات کا کوئی مداوا حاصل نہ ہوا تو وہ دن دور نہیں کہ وہ اپنی وحشت مزاجی سے حیات و موت میں کوئی حد فاصل نہ رہنے دے۔ کئی روز تک میں پریشان رہا۔ آخر اس کے سوا کوئی تدابیر ذہن میں نہ آئی کہ دونوں کے انفصال کی جلد از جلد کوشش کرنی چاہیے ایک روز میں جمل سے بولا گیا اجمل ذرا دل کو قوی رکھو۔ اس قدر ہراساں نہ ہو میں کل یوسف صاحب کے پاس شیلے کے متعلق تمہارا پیغام بھیجتا ہوں۔ لیکن عزیز آخری بار میری اس نصیحت کو بھرسن لو۔ اگر تم محبت کی نارِ ابراہیمی میں ہمیشہ ہمیشہ جلتے رہنا چاہتے ہو تو شیلے کے خیال مواصلت کو دل سے جلا وطن کر دو۔ معاف قدرت محبت کا آخری باب ہے۔ ایسا باب جس میں ٹریجڈی ہے۔“

یوسف صاحب کے جواب خط میں ناظرہ نے یہ دن تک بھگروں پر

لوٹتا رہا۔ خدا خدا کر کے سولھویں دن جواب آیا۔ قبل اس کے کہ میں اس کو کھول کر پڑھ سکتا ناظر نے حریصانہ اس کو میرے ہاتھوں سے جھپٹ لیا اور بحال کر سچی آنکھوں کی راہ سے اس کے مضمون کو نگلنا شروع کیا ..... اس کے بعد خط کو سینے سے لگا کر کرسی پر گر پڑا۔

میں نے اس کے بے حس ہاتھوں میں سے خط لے کر پڑھا۔ یوسف صاحب نے میری تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ یعنی جبین شیلہ کو دائمی طور پر ناظر کے حوالے کرنے پر راضی ہو گئے تھے۔ چند منٹ بعد جمل کو ہوش آ گیا تو دیوہ دار اس نے کمرے میں رقص کرنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ اس کے پیرشل ہو گئے اور جسم پسینہ پسینہ!

”سمندر کے اندر پانی نہیں ہے بلکہ مسرت رفیق بھری ہوئی دریا شادمانی کی لہریں مارتے ہوئے بہ رہے ہیں۔ بہاڑ ٹھوس انبساط بنے ہوئے زمین پر قائم ہیں“ اس نے بکنا شروع کیا۔

اور یہ ٹھونسنا قضا ئے مبرم بنا ہوا تمہاری کن پٹی کی طرف آ رہا ہے“ اور یہ چاٹنا تمہاری تپسی جھاڑوینے کو بلند ہو چکا ہے“ یہ کہہ کر میں نے اس کی خوب خبر لی۔ حتیٰ کہ اس کے حواس بجا ہو گئے۔

شام کو میں نے اجمل کے چچا سے مل کر (اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا) معاملہ طے کیا اور اس قدامت پسند بزرگ نے میرے انتخاب کی مخالفت کی مین جب میں نے ان کو تمام واقعات کی نزاکت سے آگاہ کیا تو وہ بھی رضامند ہو گئے۔ قصہ مختصر تاریخ سعید مقرر ہوئی اور میاں اجمل دولہا بنے ہوئے ایک بار اور لاہور جا پہنچے اور ہم ان کے ”بعد از چچا بزرگ“ بنے ہوئے اپنے چچا کی دوست کے مکان پر جا دیئے۔

شادی میں، مراسم و تکلفات کو مطلق دخل نہیں دیا گیا۔ شرعی اصولوں پر نہایت خیر و خوبی سے ہونگئی۔ لیڈی صاحبہ کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں نے بھی اجمل اور شگلا کے اقصاں پر اظہارِ مسرت فرمایا۔

مکاح کے دوسرے روز شام کے پانچ بجے کے قریب لیڈی صاحبہ کا ایک رقعہ ملا کہ وہ میرا چالے پر انتظار کر رہی ہیں "چالے" پر انتظار؟ "میں نے حیرت سے دل میں کہا۔" میں چالے پتیا کب ہوں "آخر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس دعوت نامہ سے ایسا حواس باختہ ہوا کہ درمخلف رنگ کی جرابیں پہن ڈالیں۔ جن کا خیال مجھے ان کے مکان پر پہنچنے کے بعد آیا۔ چنانچہ بیٹھتے ہی میں نے پیروں پر نظر پڑ جانے کے خوف سے پاؤں سکڑ گئے اور سمٹ سمٹا کر بیٹھ گیا۔ لیڈی صاحبہ میری مردانہ جھینپ کے علاوہ اس کی حرکت کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ مسکرا کر بولیں۔ "یہ آپ سکڑے سکڑائے کیوں بیٹھے ہیں؟" میں نے پیروں کو اور زیادہ چھپا نیکی کو شش میں گھٹنوں کو بالکل دھرا کر دیا۔

انھوں نے میرے گھٹنے کو انگلی سے چھوا اور بولیں "کیا آپ کے گھٹنے

میں کچھ تکلیف ہے؟"

"نہیں تو ویسے ہی یوں بیٹھا ہوا ہوں۔ آپ فکر نہ کیجئے" یہ کہہ کر میں نے انتہائی خفیدگی تک پیروں کو سکیر لیا۔

"مضر و کچھ بات ہے۔ دیکھنے دیجئے" یہ کہہ کر وہ اپنے نازک ہاتھوں سے میرے متلاشی پناہ پیروں کو کمر سی کے نیچے سے گھسیٹ لیے کی سہی بیکار کرنے لگیں۔ مجھے ان کی اس ریسرچ "پر رحم آ گیا۔ چنانچہ ذرا خفت کے ساتھ کمر سی کے نیچے سے پیر نکال لئے۔

”یہ کیا؟ انہوں نے میرے دورنگے پیردس کی جانب دیکھتے ہوئے سنہل کر کہا۔  
”وہی جس کو میں اب تک چھپانے کی کوشش کر رہا تھا“ میں نے مردہ  
آواز میں کہا۔

”یہ کیا دیوانہ پن ہے آخر؟ انہوں نے اس قدر شوخی سے دریافت کیا۔  
”آپ کا خیال آجانے کے بعد دیوانگی پیدا ہو جانا لازمی بات ہے“ میں  
نے جواب دیا۔

”کیا آپ کو میرا خیال آجایا کرتا ہے؟“ انہوں نے کسی قدر شر مسارانہ پوچھا

”نہیں آتی ہے انہی یاد تو مدت نہیں آتی“

”مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں“

میں نے یہ شعر پڑھنے کو پڑھ دیا۔ لیکن جلدی سے بولا ”معاف کیجئے“

بیڈی صاحبہ یہ تو میں نے ویسے ہی کہا دیا۔ یاد واد کچھ نہیں آتی ہے۔“

”عجیب بے اصولی طبیعت رکھتے ہیں آپ“ انہوں نے کہا۔

”اب جائیں گے“ میں نے روانہ پیدا ہو جانے کے خیال سے خوف

کھا کر کہا

”کہاں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”گھر“ میں نے بچوں کی طرح جواب دیا۔

”یہاں آپ کے کون چنگیاں لے رہے ہیں؟“

”اچھا چل دے“ میں نے کھڑے ہو کر کہا۔

”یہ کیا وحشت ہے۔ بیٹھے۔ آپ کو کبھی انسانیت بھی آئیگی؟“ انہوں نے

میرے ہاتھ سے ٹوپی چھین لی۔ ان کی اس حرکت سے میں اور وحشت زدہ سا

ہو گیا۔ گھر کر۔ روزہ کی طرف دیکھنے لگا۔ جی میں آتی کہ ننگے سر ہی محل جاگوں

لیکن لیڈی صاحبہ نے اٹھ کر چٹخنی لگا دی۔

”اچھا اب آپ کے اس رومان کا کیا حال ہے“ یہ انھوں نے پھر کرسی لیٹے ہوئے کہا۔

”وحشت!“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ لیڈی صاحبہ نے ایک ہر شدت تہمتہ لگایا۔

”جاؤں گا“ میں نے وحشیانہ نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

”نہیں جا سکتے“ انھوں نے ”سکتے“ کو کھینچتے ہوئے ترمیم کے ساتھ کہا۔  
”جائیں گے“ میں نے رونے کے انداز میں گے کے ساتھ کہا۔

”یہ کیا حرکت ہے ناظم! بچوں کی طرح چلے جا رہے ہو“ انھوں نے ڈانٹتے ہوئے دیا سلائی کا جس میرے رسید کر کے کہا۔

”اے وہ خاتون جس کا نام بھی مجھے آج تک معلوم نہیں۔ آخر میں کیوں جاؤں آپ مجھے کیوں قید کر رہی ہیں؟“ میں نے کہا۔ لیڈی صاحبہ میرے قریب آگئیں اور اپنے خوب صورت ہاتھوں سے میرے کوٹ کا کالر درست کر کے بولیں ”ناظم! اب ذرا انسانیت کے جامہ میں آجاؤ میں تم سے ایک کام کی بات کہنا چاہتی ہوں“

”مگر میں جب تک اس طرح مقید ہوں جامہ انسانیت میں پہن سکتا میں نے احتجاج کے طور پر کہا۔

”مقید تم نہیں ہو میں ہوں..... تمہارے ان وحشیانہ اوصاف کا سیر“

”تو کیا تم مجھ پر عاشق ہو سچی خاتون؟ میں نے دیوانوں کی طرح چیخ کر

پوچھا ۔ . . .

”منہش سٹور نہ مچاؤ۔ آہستہ بولو۔ ماں کیا بکنے لگے تھے تم؟ عاشق؟ کیا تم کو یہ بھی مغالطہ ہے کہ کوئی احمق لڑکی تم پر عاشق ہو سکتی ہے؟“ انھوں نے شوخی سے کہا۔

”جانے دیجئے اگر آپ مجھ پر عاشق نہیں ہیں تو کچھ ایسا ہی سمجھا“  
میں نے سادگی سے جواب دیا۔

”کیوں جی اگر میں کبھی ایسی حماقت کر بیٹھوں؟“ لیڈی صاحبہ نے شہزادہ ریزے تبسم سے پوچھا۔

تو میں سب سے پہلے آپ کو آگرہ لے کر پہنچوں گا " میں نے جواب دیا۔  
لیڈی صاحبہ چڑ گئیں اور تھک کر کرسی پر جا بیٹھیں۔ اب میں اٹھا اور ان کے  
قرب جا کر کہنے لگا۔ خاتون اگر تم فی الحقیقت مجھ پر عاشق ہو تو میں تم کو نوید  
سناتا ہوں کہ چند روز بعد تم ایک اچھی شاعرہ بن جاؤ گی۔ لیکن کسی سے شادی  
نہ کر لینا۔ ورنہ تمہارا مستقبل میان تمام تمہارے لطیف احساسات کا خاتمہ  
کر ڈالے گا۔"

”بیٹھ جاؤ ناظم! میں تم سے سخت ناخوش ہوں“ انھوں نے مجھے جھڑک کر کہا لیکن چند منٹ بعد غنجہ کی طرح مسکرا دیں اور بولیں ”کیوں صبا اگر میں..... تم..... تم اور ہم ایک ساتھ زندگی گزاریں؟“

”یعنی آپ کا یہ مطلب ہے کہ میں بھی ڈاکٹری پڑھ کر آپ کے ساتھ پریکٹس کرنے لگوں؟ لیکن اس میں میرے پانچ سال بھی تو برباد ہو جائیں گے میں نے کہا۔ انھوں نے دانت بھینچ کر میز پر رکھا ہوا الہم میرے کھینچ مارا اور ہونٹ کاٹتی ہوئی بولیں۔ ”سادہ لوح انسان!“

”شکر ہے تصویر بچ گئی۔“ میں نے اٹھا کر پھر اس کو ان کی میز پر جا رکھا۔ اس بار انہوں نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولیں۔ ”ناظم! تم کو نسی منی کے بنے ہوئے ہو؟ کیا تم اپنے پسند کرنے والے کو دراکا مستحق بھی نہیں سمجھتے؟“

”خالتن! معاف کرنا میں تمہارے اگلے فقروں کا مطلب بڑی دیر میں سمجھا۔ اگر تمہارا مطلب اس ”اگر تم ہم“ فقرہ سے یہ تھا کہ ہم تم باہمی شادی کر لیں تو دیکھو اچھی لیڈی صاحبہ پہلے تم کو یہ کہنا پڑے گا کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو! اس کے علاوہ یہ بھی وعدہ تم کو کرنا ہو گا کہ میری بیوی بن جانے کے بعد بھی تم محبوب بنے رہنے کی تہنا نہ کرو گی“ میں نے کہا۔

”کیا ناظم! تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے؟“ — مطلق نہیں ہے؟

”لیڈی صاحبہ! شرم سارا نہ پوچھا۔“

”محبت! نہیں میں تم سے محبت نہیں کرتا ہوں“ میں نے کہا۔

”پھر کیا نفرت؟ انہوں نے دریافت کیا۔“

”ہرگز نہیں! نفرت کیوں کرتا۔ میری جگہ اگر کوئی اور ہو تو ف جاذباتی انسان ہوتا تو وہ تم پر سو جان و دل سے فدا ہو جاتا“ میں نے کہا۔

”تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ میرے اندر محبوب بننے کی صلاحیت ہے۔ کوئی مجھ سے محبت کر سکتا ہے؟ انہوں نے دیکھ کر پوچھا۔“

”ہاں وہ شخص تم سے محبت کر سکتا ہے جو تخیلات و تصورات کا عظام ہو۔ محبت دہی لوگ کیا کرتے ہیں جنہوں نے نومان کو مذہبی عقیدہ کی طرح اپنر دل میں جگہ دے رکھی ہے۔“ میں نے کہا۔

”آہ تم کس قدر خشک انسان ہو۔ لیکن اس کے باوجود کتنے اچھے آدمی ہو۔ بے غرر صاف ہن، بے ریا اور بے تصنع ناظم کیا تم کسی کے اوصاف کے

پرستار بن جانے کے بھی روادار نہیں؟“

”خاتون کوئی کسی کے اوصاف کا پرستار کیوں ہو۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ انسان ہونے کی حیثیت سے ہر شخص کو انسانی اوصاف کا حامل ہونا چاہیے۔“

”ہائے پھر ملی نیچر کے انسان! کہاں جا کر اپنا سر پھڑلوں۔ تم تو ناظم... فرشتوں کی بستی میں پیدا ہوئے ہوئے۔ انسانوں میں کیوں جنم لیا تم نے اچھی کیا تم اجازت نہیں دو گے کہ میں ہمیشہ ہمیشہ متہیں پوجتی رہوں؟“

”تم یہ قیمتی الفاظ ادا کر کے مجھے مغرور کئے دے رہی ہو۔ اس سے زیادہ ایک مرد کی کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے کہ وہ چپ چاپ محبت کیا جا رہا ہو لیکن میری پرستار بن کر تم کو مجھ سے دور رہنا چاہیے۔ اور مجھ سے ہرگز ملنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے“ میں نے کہا۔

لیڈی صاحبہ کی حسین آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ انھوں نے بھرائی آواز میں کہا۔ ”میں تم سے دور نہیں رہ سکتی، اب میں تم سے منافقانہ کہتی ہوں کہ تم سے محبت نہیں کروں گی۔ لیکن مجھے اپنے سے جدا مت کرو۔ نہیں ناظم مجھے مت ٹھکراؤ۔ میں عمر بھر تمہارے پیروں دھو کر پیوؤں گی“ یہ کہہ کر ان کی ہنسی بندھ گئی۔

”اور میں تم کو اپنے سرگھٹاج اپنی زندگی کی قیمت اور اپنی حیات کا انمول رتن سمجھتا رہوں گا۔ لیکن اسی وقت جب کہ تم بہ حیثیت زوجہ اپنے فرائض کا مظاہرہ کر دو گی۔ محترم خاتون! میاں بیوی لاکھ طالب و مطلوب بنے رہنے کا حیلہ کر رہی ہیں لیکن شادی کے بعد وہ ہرگز عاشق و معشوق بنے نہیں رہ سکتے ان دونوں کی زندگیوں کی جوڑے اس وقت جان ہوتی ہے وہ باہمی اعتماد و ادائے فرائض ہے اور بس۔“

لیڈی صاحبہ سکیوں کے طوفان کے حد میں نہ بولیں "آہ! میرے کج بخت دل نے کس شخص سے رابطہ الفت قائم کیا ہے وہ عرب کے ریچنان سے زیادہ خشک اور بنجر دل رکھتا ہے۔ آہ لیکن اس خشک ریچنان کے اندر کیسے کیسے شاداب نخلستان بھی ہیں جہاں میری روح ہمیشہ تازگی حاصل کرتی رہے گی۔ ناظم میں تمہاری ہوں اور تمہارے مذہبی طریقے پر تمہارے ساتھ عقد کرنے کو تیار ہوں" یہ کہہ کر لیڈی صاحبہ نے اپنے کو میرے آغوش میں دھکیل دیا۔ میں نے ان کو واپس کر سی پر لٹا دیا۔ دوسرے روز ہمارا بھی عقد ہو گیا۔

اس کے دوسرے روز اجمل اپنی چھیتی دلہن کو وداع کر کر دہلی روانہ ہو گیا۔ اور اس کے ایک مہینہ بعد میں بھی اپنی جو تیا (لیڈی ڈاکٹر جس کو میں رضیہ کہنے لگا تھا) کو مع اپنے تمام ساز و سامان کے دہلی لے آیا اور اس نے اپنی پریکٹس یہاں آ کر جاری کر دی۔

اجمل وینلا عام دولہا دولہن کی طرح شادی کے چند ماہ نہایت محبت و مسرت سے بسر کرتے رہے۔ اجمل شیلڈ کا پرستار تھا اور وہ بھی اس کی محبت کا اعتراف کرتی تھی۔ غرض دونوں سال بھر مک محبت کے زود زوال جنسار سے محروم رہے۔ اس کے بعد تدریج یہ نشہ اثرنا شروع ہوا۔ شادی نہ ہوتی تو شاید تادم واپس کیف محبت میں سرشار رہتے لیکن بعد شادی اس محبت زدہ جوڑے پر فطرت کے ان مقرر کردہ اثرات نے اپنا قبضہ جما کر شروع کیا جو روزانہ اسے انسان پر اندریں صورت مستولی پہنچے آئے ہیں۔

جب محبت کے زود و غسل جذبات ان طالب و مطلوب کو دس سطح پہنچے آئے جہاں کثرت مشاہدہ توافر دید اور اثرات یک جانی سے ہر محبوب کے

محبوب چیز بھی ایک عام شے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو ذرا ذرا سی بے عنوانیوں کو ایک دوسرے کی زندگی پر اثر پڑنا شروع ہوا۔ وجہ عیاں ہے۔ دونوں کی باہمی توقعات کا دائرہ اس قدر وسیع ہو چکا تھا کہ اگر اس کے اندر قرب و بعد میں ایک بھی بکسیدگی کا بھوت آ کو دتا تو دور سے نظر آنے لگتا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں بھی بہت جلد ایک دوسرے سے سیر ہو گئے اور تنوع پسندانہ ذہنیت نے جو ہر انسان کے اندر کار فرما ہے دونوں کی باہمی دلچسپیوں کو سلب کر لیا۔ اجمل محسوس کرنے لگا کہ سسٹیل سے شادی کر کے اس سے کوئی ایسا گناہ سر نہ دہو گیا ہے جس کی کی تلافی کی کوئی امکانی صورت نہ رہی ہو اور ادھر سسٹیل کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ اجمل سے محبت کر کے اس نے اپنے انتخاب کا غلط ترین مظاہرہ کیا ہے۔

محبت کی زندگی شادی کے بعد پر مسرت گزرنی بہت مشکل ہے۔ کیونکہ دونوں اپنی بے محابانہ توقعات میں (بلسلسلہ عشق) بے حد وسعت پیدا کر لیتے ہیں۔ شادی کے بعد اثرات یک جانی جو قاطع ذوق و سرگرمی محبت میں دونوں کو اس قدر حساس بنا دیتے ہیں کہ اگر توقعات کی بے پایاں وسعت میں ذرا بھی ناگوار واقعہ کی دراندازی ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے کے طرز عمل پر تنقید کرنے لگتا ہے۔ محبت کب اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔ ناز و نیاز کا قانون ہی علیحدہ ہے۔ جس میں سپردگی و پاس فراغ کا کیا کام۔ محبت اگر فی الحقیقت کرنے کی کوئی شے ہے (بقول نبض حضرات محبت کی نہیں جانی بلکہ ہو جاتی ہے) تو اس کی ابتدا قبل از شادی نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ بعد شادی کے زوجین محبت کیا کریں۔ یہ طریقہ کار بچہ کا میاب ہے۔ اگرچہ میں اس کے لئے عرض کر چکا ہوں کہ میاں بیوی کے دلوں میں جو حس موجود رہتی ہے مگر نام محبت نہیں ہے۔ بلکہ باہمی طور پر خیال آسائش اعتماد اور پاس فراغ

ہے۔ لیکن آخر وہ کیا شے ہے جو اس پاس فرائض وغیرہ کی محرک ہوتی ہے؟  
 انوس میرے پاس اس جذبہ کے لئے کوئی لفظ نہیں اور میرا خیال ہے کہ اس  
 کے لئے لفظ اب تک وضع بھی نہیں ہوا ہے۔ لیکن جب تک کوئی لفظ وضع  
 نہ ہو آپ کو حق نہیں کہ اس کے لئے غلطی سے لفظ محبت ہی استعمال کرتے ہیں  
 ہماری سٹے! میری رضیہ نے قبل از شادی مجھ سے عاشقانہ نیاز کی  
 توقع ہی نہیں باندھی تھی۔ وہ غریب محض بیوی بنے رہنے کے خیال کے ساتھ  
 مجھ سے منسوب ہوئی تھی چنانچہ ہماری شادی کو ایک سال گزر جانے کے باوجود  
 کوئی بات ایسی نہ گزری کہ جس سے ہمارے باہمی جذبات میں خانگی بے عزتوں  
 کے باعث کوئی زہریلا اثر پڑا ہو۔ اپنی محدود امیدوں کے خلاف رضیہ نے  
 مجھے فرض شناس اور اس کی قربانیوں کی قدر و اعتراف کرنے والا شوہر  
 پایا تو اس کی مسرت کی کوئی انتہاء نہ رہی وہ میرے مردانہ بازوؤں کو تمام دنیا  
 کی دست سے زیادہ پر آسائش و راحت رساں محسوس کرنے لگی ہیں  
 نے بھی اس کی زندگی کے ادنیٰ سے ادنیٰ شبہ پر اپنے فرائض کے سرگرم  
 پاساں بٹھا دئے تھے۔ جو مجھے اس کی ہر ضرورت، رنج و راحت اور مسرت  
 و شادمانی سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح سچے عکسار کی مانند عومن و  
 معاوضہ کے سلسلہ میں نہیں بلکہ محض اس خیال سے کہ مجھ کو راحت پہنچانے  
 میں وہ تفریح محسوس کرتی ہے۔ اس نے اپنی قابل قدر زندگی کو میرے لئے  
 وقف کر دیا تھا۔ اس نے اپنی کسی ضرورت کا اظہار اپنے نازک لبوں سے  
 نہیں کیا اور میں نے خود بھی اس کو اس قسم کی زحمت نہیں دی۔ اس کی فطرت  
 کے غائر فائز مطالعہ کے بعد اس کی پسندیدہ و غیر پسندیدہ چیزیں میری نظر میں  
 تھیں۔ اس کی روح پر میرا تسلط تھا اور وہ میری روح پر مسلط تھی۔ نہیں مت

ایک مٹی جو درجہوں میں جلوہ گرہی - من تو شدم تو من شدی !  
ہم نے بعد شادی کے ایک دوسرے سے محبت کیے نا شروع کی تھی ۔۔۔  
آہ میں پھر وہی لفظ محبت استعمال کر گیا ۔ میری اس کم دانی کو معاف کیجئے  
انسان ہونے کی حیثیت سے تنوع پسندی سے ہم دونوں خالی نہیں ہوتے  
تھے ۔ مگر ہم تنوع کی تلاش میں جاتے کہاں ؟ یہاں تو دونوں ذاتیں متنوع  
تھیں ۔ یہاں تو سنت نئے پیار تھے ۔ روز ایک نئی اور مسخر کن ادا تھی ہر دن  
ایک جدید خوبی کا انکشاف ہوتا رہتا تھا ! انسان خوبیوں کے باب میں اپنے  
پیدا کر کے والے سے کسی طرح کم نہیں سمجھتا کیونکہ یہ بھی اسی دنیا کا ایک  
قطرہ ہے ۔ خوبیاں مستلزم انسانیت ہیں اور انسانیت مزاج اور ہمت !  
” ناظر چہ سے آکر امر تسمل جاؤ یا ڈھائی سال کی مدت کے بعد اجل کو  
ناظرہ کا ایک دن یہ تار موصول ہوا ۔ اس عرصہ میں شیلڈ لڑ لڑا کر لاہور جا چکی تھی  
آہ وہ بھولا سیرا تصور اپنے تمام مردہ اثرات کو چھوڑتا ہوا تیزی سے اس کے  
دماغ میں پھرا کودا ۔ اس کا سر جگر اٹنے لگا ۔ ناظرہ کے خیال سے اس کی روح  
میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ، سرور سے اس کے دامادہ اعصاب میں تشنج خفی سا  
محسوس ہونے لگا ۔ شادی نے اور سرکش شیلڈ نے اس مدت میں جو اضمحلال  
و تکرار اس کی طبیعت پر پایا کر دیا تھا ، اس فرحت بخش پیام نے اس کو مٹا دیا  
بیوی محبوب ہو کر بھی اس صنم خیالی کی برابری نہیں کر سکتی ہے جو عاشق کے  
حریم دل میں اپنا مسکن بنائے ہوئے ہو چند منٹ تک سیر تھامے بیٹھے رہنے  
کے بعد وہ ایک منام طائر کی طرح لڑکھڑاتا ہوا اٹھا ۔ منہ دوچھو کھولا اور اس میں  
سے ہلکے گلابی لافانوں کا نبڈل نکال کر میز پر بچھ دیا ۔ پھر ایک ایک خط کو  
پڑھنا شروع کیا ۔ ایک ایک سطر سے اپنی محبت کو دل کی حرارت سے سپین

پہنچ کر عشق کا پیکر رنگین بنائے لگا۔ اور اس کے حسین خدو خال کو تخیل کی...  
 والہانہ مدد سے ایک ایسے "امثالی خاکہ" سے سجائے لگا جو اس کے شکستہ  
 تصور میں آج تک نہ آیا تھا۔ آؤ محبوب اور بیوی میں کس قدر تفاوت ہے۔  
 بعد ایشرفین!

شیلا اپنے باپ کے پاس جا ہی چکی تھی۔ وہ پھر ایک بار اپنے تخیل کی  
 وسعت کی ملکہ کے جان بخش تصور اور حیات پر ور خط و کتابت کے لئے آزاد  
 تھا۔ کاشش ہر شے ہمیشہ اسی پنج پر اپنی فطرت قائم کر لیا کرے جس پنج پر پہاڑ  
 تخیل اس کا بت بنایا کرتا ہے۔ کاشش ناظرہ سے اس کی شادی ہوئی ہوئی  
 جو اس کی مثال زندگی کو آسودہ کر دیتی کیوں نہیں کر سکتی تھی۔ کیا وہ اپنی خطوط  
 میں شریعت ایک نغمہ فردوسی نظر نہیں آرہی تھی۔ کیا اجمل اس کو اپنے تصور  
 میں کامل و مکمل عورت نہیں سمجھتا تھا؟

شیلا کس قدر تنہا عورت تھی۔ بات بات پر اس کے طرز عمل پر  
 باز پرس کرنے کی عادی، ذرا ذرا سی حرکت پر محاسبہ کرنے کی خوگر۔ ناظرہ بیکر  
 خطا اور تیرا تصور میرے ناکارہ دل کے ساتھ صرف اس قدر احسان کر سکتا ہو  
 کہ حب میں ہزیمت خوردہ سپاہی کی طرح شیدا کی دل آزاریوں سے تنگ آ کر  
 کہیں نکل بھاگوں تو تو میری روح کی گہرائیوں سے نغمہ سکوں بخش ملندہ کر کے  
 بچے آسودہ کر دیا کرے۔ یہ اجمل کے خیالات تھے۔

الغرض میاں اجمل اپنی مدت سے کھوئی ہوئی پچھلی دولت کی بازیافت  
 پر بیحد مسرور تھے۔ فوراً امرت سرچل دیتے۔ مجھے جو معلوم ہوا کہ یہ بے وقوف  
 انسان پھر اسی "خیالی عشق" کا شکار ہو کر امرت سر جبار ہا ہے تو میں بھی ساتھ ہوا  
 ہم تین روز تک امرت سر رہے لیکن ناظرہ اپنی مقررہ جگہ پر ہم کو نہیں

لی۔ میں نے اجمل کو ہوا رکھا اور اس کو لاہور لے کر پہنچا۔ یہاں شیلہ ایک ہفتہ سے بخار میں مبتلا تھی۔ چنانچہ اس کے صحت یاب ہونے تک ہم کو یہاں قیام کرنا پڑا۔ آخر میں نے شیلہ کو بھی سمجھا بھگا کر اجمل کے ساتھ دہلی چلنے کے لئے آمادہ کر لیا۔ الغرض ہم تینوں پھر دہلی آ گئے۔

اس جدائی نے بھی دونوں کے جذبات نفرت کو استیاق ملاقات سے نہ بدلا تھا۔ اجمل کی شیفتگی طالب حقوق شوہر کی صورت اختیار کر چکی تھی اور شیلہ اب بھی اس سے عاشقانہ نیاز کی توقعات باندھے ہوئے شان معشوقانہ کے ساتھ اس سے پیش آتی تھی۔

ایک روز اجمل کو پھر ناظرہ کا خط ملا جو دہلی سے ہی لکھا گیا تھا۔ اور جس میں مرقوم تھا کہ وہ بوجہ علالت مقررہ تاریخ کو اس موعود جگہ پر نہ آ سکی تھی اسکے بعد تحریر تھا کہ وہ بھی آج کل دہلی آئی ہوئی ہے۔ اگر وہ اب بھی اس سر ملاقات کا متمنی ہے تو یہاں کوئی جگہ مقرر کرے۔ اس خط نے پھر اس پر ناظرہ کی دھن سوار کر دی۔ پھر وہی خیال وہی محبت کی رویت رہیں! اجمل و ناظرہ کی خط و کتابت پوسٹ ماسٹر کے توسط سے ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ ناظرہ نے اپنا خط کا جواب بھی پوسٹ ماسٹر کی معرفت طلب کیا تھا۔

شیلہ کی طبیعت دو روز سے خراب ہونے کی وجہ سے اجمل اس مکتوب کا جواب نہ دے سکا۔ آخر تیسرے روز روشن آرا باغ ملاقات کے لئے مقرر کر کے اس نے خط ڈال دیا۔ جواب دوسرے روز آ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن دو روز ناظرہ کی چھٹی نہ آئی۔ آخر بے تابانہ خود ہی ڈاک خانہ جا پہنچا ملازم کی واپسی کا بھی انتظار نہیں کیا۔

جب اس نے گورنمنٹ کی اس عمارت میں قدم رکھا تو ایک عورت جس

کی اس کی جانب پشت تھی، کو پوسٹ ماسٹر سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھی اپنے خط کے متعلق دریافت کرنے کو آگے بڑھا کہ پوسٹ ماسٹر جو اس کا شناسا تھا بولا۔ "ہو ماسٹر ناظر! اپنی چٹنی لے جاؤ" لفظ ناظر پر اس خاتون نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے مڑ کر کیا دیکھا دونوں پر بجلی گر گئی۔ اجمل بھوچکا سا ہو گیا۔ بمشکل یہ کہہ سکا "شیلا! شیلا تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اجمل! ————— نا..... نا..... شیلا نے

ہٹکائے ہوئے ادا کیا۔ اجمل نے اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیکھا۔ اپنا لکھا ہوا لفافہ جس پر ناظرہ کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ اس نے کمرخت لہجہ میں دفعتاً کہا۔ "تم یہ حرکت کرتی ہو..... میرے پرائیویٹ خطوط یہاں سے اڑالے جاتی ہو؟ کیوں؟ شیلا کی نظر بھی اس لفافہ پر پڑی جو پوسٹ ماسٹر نے ابھی ابھی اس کو دیا تھا۔ چنانچہ اس نے بھی حیرت و غصہ کے مخلوط جذبہ کے ماتحت کہا "لیکن اجمل..... تم بھی تو میرے پرائیویٹ خطوط چرائیتے ہو تم کو اس لفافہ پر قبضہ کرنے کا کیا حق ہے؟"

"تمہارے پرائیویٹ خط؟ کیا بکیتی ہو" اجمل نے گرج کر کہا۔  
 "جنٹلمین! یہ پوسٹ آفس ہے۔ باہر جا کر لڑو" پوسٹ ماسٹر نے کہا۔  
 اجمل شیلا کا ہاتھ پکڑ کر باہر لایا۔ رد و قدح کے لئے بازو اڑا دیا۔  
 خاندان جیسی جگہ موزوں نہ تھی۔ چنانچہ غصہ ضبط کرتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔  
 شیلا کو پوسٹ ماسٹر کے الفاظ پر حیرت ہو رہی تھی اجمل کو اس نے..... ناظرہ کہا تھا۔ ضرور کہا تھا۔

مکان پر پہنچ کر دونوں ایک دوسرے کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اس طرح ہال میں آئے گو باب قالمین پر پہنچتے ہی کشتی شروع ہو جائیگی۔

آخر اجل نے دیوانوں کی طرح کوٹ اور ٹوپی ایک کرسی پر پھینک دی پھر میز پر زور سے مکار کر غصہ سے بولا "اب بناؤ تم کب سے اس طرح ڈاک چارہری ہو" "اجل یہی میں بھی تم سے دریافت کر سکتی ہوں" شیلا نے کہا۔

"تم نے دوسری عورت کے نام کے خطوط کیوں پڑھے آخر؟" اس نے سخت لہجہ میں کہا "یہ خط ناظرہ کے نام کا ہے۔ تم کو اس سے کیا کام تھا۔" "اور تمہارے پاس جو خط ہے وہ بھی تمہارے نام کا کب ہے۔ ناظرہ کے نام کا ہے۔"

شیلا نے درشت لہجہ میں جواب دیا۔

"لیکن ناظرہ میں ہی ہوں۔ ادبی دنیا میں اسی نام سے معروف ہوں" اجل نے کہا۔

"تو ناظرہ میں ہوں یہ میرا بھی قلمی نام ہے" شیلا نے کہا۔ "اجل نے حقارت سے ایک قہقہہ لگایا اور بولا "شیلا کیا تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے دم میں آجاؤں گا اور کسی غیر مرد سے خط و کتابت کرنے پر تم سے باز پرس کرنے سے باز رہ جاؤں گا؟"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ تم بھی مجھ سے کوئی چمکے چل سکتے ہو۔ تم اپنے کو ناظرہ ظاہر کرنے کا مجھے فریب دیتے ہو۔ ناظرہ ایک فقید المثال انسان ہے۔" "اور ناظرہ بھی ایک بے مثل ہستی ہے۔ تم اس کی خاک پاکی برابر ہی نہیں کر سکتیں" اجل نے کہا۔

"اور تم ناظرہ کے مقابلہ میں ذرہ بے مقدار بھی نہیں ہو" شیلا نے جواب دیا۔ عجیب لطف تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی تعریف ہی کر رہے تھے اور برائی بھی۔

”شیلا! تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اچھا اگر تمہارا یہ دعویٰ ہو کہ تم ناظرہ ہو تو بتاؤ تم نے اس سے پیشتر کس خط میں کیا لکھا تھا؟“ اجمل نے پوچھا۔

”تم بھی اگر ناظرہ ہو تو بتاؤ تم نے اگلے خط میں کیا تحریر کیا تھا؟“  
 ”میں نے اپنی روح سے زیادہ عزیز ناظرہ کو ایک خط میں ”پریم دیوی“ لکھا تھا جس کا وہ مدتوں لطف لیتی رہی“ اجمل نے کہا۔  
 ”اور میں نے بھی اچھے ناظر کو ایک خط میں ”سروش محبت“ لکھا تھا جس پر وہ عرصہ تک وجد میں سر دھنتے رہے“ شیلا نے جواب دیا۔

دونوں ایک ساکتہ چونکے!  
 ”ناظرہ! اجمل نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔  
 ”ناظرہ!“ شیلا نے دھیمے سے کہا۔

”ارے! تم ہو ناظرہ! وہ ہستی جس سے میری دنیا بے تحیل آباد ہے جو میرے خوجچکاں دل کی جان ہے“ اجمل نے کہا۔  
 ”اور یہ تم ہو ناظرہ! میری روح کا پہلا فاتح“

”لیکن تم اس قدر بری کیوں ثابت ہو میں؟“ اجمل نے کہا۔  
 ”اور تم اس قدر خراب کیسے ثابت ہوئے؟“ شیلا نے پوچھا۔  
 ”آہ ناظرہ! اپنے خطوط کے اندر تم کس قدر معصوم کیسی بھولی بھالی اور کتنی محبت پرور نظر آتی ہو۔ لیکن جسم میں اس کے بالکل برعکس وزج رکھتی ہو“

”اور ناظرہ تم بھی اپنے مکاتیب میں کس قدر پاک ضمیر صاف باطن اور راست باز نظر آتے ہو۔ لیکن جسم میں اہرنے سے کم نہیں ہو۔ تم بیحد

سخت گیر اور اکھڑ مزاج ہو " سٹیلا نے کہا۔  
 " پرسوں ذرا سی بات پر میں نے ہی شیشہ چکنا چور کر دیا ہو گا۔  
 ناظر یا اجمل نے پوچھا۔

" اور اترسوں حلوے کی طفتری میں نے ہی صحن میں اٹھا کر پھینک دی  
 ہو گی ناظر یا سٹیلا نے پوچھا  
 " اچھا گزشتہ اتوار کو صرف میں نہ ملنے پر ساڑی میں نے ہی جیہر جیہر  
 کر دی ہو گی " اجمل نے کہا۔

" جی وہ گزشتہ سے پوسٹ منہ نکو ذرا سی چائے گمرہ جانے پر قالین میں  
 نے ہی چاقو کے کاٹ ڈالا ہو گا؟ " سٹیلا نے کہا۔

" لے دو میرا نام " میں نے دفعتاً نوادار ہو کر کہا۔ میرے پیچھے میری رضیہ  
 بھی داخل ہوئی۔

" بے وقوف انسانوں " میں نے دونوں میاں بیوی کو ڈانٹتے ہوئے  
 کہا " پرانے مردے کیوں اکھڑ رہے ہو۔ تمہاری جنگ کبھی ختم ہوتی ہے۔ "  
 " آہ ناظم! میں مر گیا اور میرے ساتھ وہ میرا دہنی بت بھی فنا ہو گیا۔ آہ  
 کاش ناظرہ تو تصورات کا جامہ پہنے ہوئے عالم سبیطا ہی میں مصروف  
 خرام دہتی۔ کاش تو مقیاب دگل نہ ہوتی۔ ان میری زندگی کا کچھ سہارا  
 نہ رہا۔ . . . . ناظرہ . . . . . ناظرہ! " وہ دیوانوں کی طرح اپنے  
 تخیلی خاکے کے تعاقب میں دروازہ کی طرف دوڑا اور دروازہ سے مچوکر گر گیا  
 اجمل! ہوش میں آؤ۔ سٹیلا ذرا اپنے شوہر کو سنبھالو یہ دقت اکڑے  
 رہنے کا نہیں ہے یہ کیا ستم ہے کہ خط و کتابت میں تو تم دونوں ایک دوسرے  
 کی محبت میں گرفتار رہے اور میاں بیوی بن کر نفرت کرنے لگے۔ "

سٹیلا نے بادل خواستہ اٹھ کر اچھل کر اٹھایا۔ جب اس کے حواس درست ہو گئے تو میں نے دونوں کو مخاطب کر کے کہا "تم دونوں علی دنیا میں زندگی گزارنے کے قابل نہیں ہو۔ تم کو تو کسی ایسی سستی میں سے جا کر چھوڑ دینا چاہیے جہاں دیوانے بستے ہوں۔ جذبات کے پتلو، وجدانات کے مجسمہ کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ فطرت نے دو مختلف زاوے قائم کر دئے ہیں۔ *Realism* (حقیقت) اور *idealism* (تصوریت)۔

تصوریت محض ایک سطحی شے ہے یہ صرف ہمارے جذبات و احساسات کو تازہ رکھتی ہے ہماری جوانی اور امنگوں کو زندگی بخشنا اسی کا کام ہے لیکن *Realism* (حقیقت) عملی زندگی کی ملکہ ہے۔ وہ ہم کو انسانیت کا درس دیتی ہے اور ہمارے فرائض سے آگاہ کرتی ہے جو لوگ.....

*Sentimen* (وجدانی) بن جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوریت کو حقیقت پر غالب کر کے اپنا لقب العین اسی کو بنا لیتے ہیں۔ یعنی حقیقت کی جگہ غیر حقیقت کو برتتے ہیں۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ تیز چاقو سے اگر چھپہ کا کام لو گئے تو تمہاری زبان ضرور کٹے گی اسی طرح اگر تم تصوریت کو اپنی عملی زندگی میں مقصدات کی جگہ دے لو گے تو اس کا حشر یہی ہو گا جو اس وقت تم دونوں کا ہوا ہے۔ محبت محض *sentimental* شے ہے۔ اس کو حقیقی زندگی کے پہلو بہ پہلو کھڑا کر کے اپنی حیات کا مقصد بنا لینا سحت غلطی ہے۔ بیوی کو بیوی کی طرح برتو! لیکن اس پر معشوق محبت کی دیو اور صنم الفت یہ شاعرانہ مبالغہ صرف کر کے اس کو وہ نہ بنا دو جو فی الحقیقت وہ ہے نہیں۔ اگر ہمت اور خالص زندگی میں معاہدت عمل دکار کی مقصی ہے۔ لیکن معشوق بنائی بیوی اس احوال میں کیٹس کی بیل کے سوا کچھ نہیں ہو

بیوی کو محبوب بنالینے کے بعد تم کو کوئی حق نہیں ہے کہ اس سے بچے جنمواؤ۔ اس کے گھر بار سپرد کرو۔ اس کو معشوق بنالینے کے بعد تم پر وہ تمام ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں جو شریعت عشاق کے لئے مقرر کر دی گئی ہیں۔ نیاز، فدا دگی، خیال، ناکامی، مفارقت اور غیر متناہی تصور مطلوب۔ کیا تم بیوی کے سامنے ان ”خرافات“ کو لے کر جا سکتے ہو؟ اور اگر جا سکتے ہو تو ایک خانگی زندگی بسر کرنے کی توقع کر سکتے ہو؟ ہرگز نہیں بیوی محبوب ہو سکتی ہے لیکن اس کا معشوق بن جانا خانگی زندگی کی تباہی کا باعث ہو۔

” خدا کی قسم پیارے ناظم تم جو کچھ کہہ رہے ہو لفظ بلفظ صحیح ہے اب اپنی رضیہ کو دیکھو، اس نے تم کو شرذعہ ہی سے شوہر سمجھا۔ عاشق خیال نہیں کیا۔ تم نے بھی اس کو بیوی سمجھا محبوب نہیں سمجھا۔ اپنی صحیح پوزیشن سمجھ کر تم نے خانگی زندگی اختیار کی۔ اب اگر محبت خود پیدا ہو جائے تو یہ بڑی برکت ہے (اور اچھے میاں بیوی کے درمیان ہو ہی جاتی ہے) اچھا ناظرہ! ہاں میں تم کو اسی نام سے پکارا کروں گا۔ کیا تم خانگی زندگی کو سونا پنے کی خاطر اپنے کو اتنا پست کر دینے کو تیار ہو کہ معشوق کے عوض بیوی بن جاؤ۔ بولو۔۔۔ بولو میں بھی حقیقی شوہر بننے کی کوشش کرتا ہوں میری بیوی اب حساس و زور و رنج شیلیا نہیں ہے بلکہ پیاری ناظرہ ہے جس کو اب تصوریت کو خیر باد کہہ کر حقیقت کے جادہ میں قدم رکھنا ہے۔“

” اچھے ناظر! مجھ سے زیادہ تم وجدانی انسان ہو، تم قبل شادی (اور بعد میں بھی چند مادہ تک) اس قدر والہانہ طور سے میرے ساتھ پیش آتے رہے کہ میں سمجھی تم سے میں اسی طرح مستقلاً نیاز حاصل کرتی رہوں گی۔ لیکن بعد میں تم کرنے لگے میری توقع کے خلاف اکڑ فون۔ شادی سے پہلے

اور پھر تو تم نے مجھے محبوب بنا لیا اور پھر لگے بعد میں سینہ زوری کرنے میں کب اپنی توقعات کا خون ہوتے دیکھنا پسند کر سکتی تھی۔ میں بھی سرکشی کرنے لگی۔  
 الحمد للہ بھائی ناظم نے آج ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم کو حقیقی طور پر میا بیوی بننا بتا دیا۔ اب میں بھی تمہاری حقوق شناس بیوی ہوں بشرطیکہ تم بھی نیک نفس شوہر بننے کا وعدہ۔“

”وعدہ؟ وعدہ کیسا؟ میں تو تمہاری آسائش کی خاطر اپنی جان پر ہر طرح کی صعوبت لینے کو تیار ہوں“ اجمل نے کہا۔

”اور میں بھی تم کو اپنا آقا سمجھ کر ہر وقت تمہارے ایتار کا احترام کیا کروں گی شیتلا نے کہا۔

”پاگل انسانوں! یہی تو محبت ہے“ اس مکالمہ میں پہلی بار میری رضیہ نے حصہ لے کر کہا۔

”ہمش رضیہ! خالی محبت نہیں محبت زوجین کہو۔“ میں نے اسکی اصلاح خیال کر کے کہا۔

قیسی رام پوری

—————

# خوابوں کی سستی اور حقیقت کی دُنیا

اری لے، اس تیرے چہیتے کا خط آج پھر آیا ہے۔“ بلقیس نے ڈولی میں سے اترتے ہوئے کہا۔

”کہاں ہے؟ اری دکھا تو سہی۔“ میں نے بے چین ہو کر کہا۔  
”تھم تو جا ایسی بھی کیا بے چینی ہے۔ اس کا نام سلتے ہی لگا دم نکلنے۔“  
بلقیس نے سترارت سے کہا۔

”اے ہے بھی دیدو۔ یہاں تو چار دن سے جواب کی آس تک رہی ہیں“  
میں نے کچھ جھینپ کر کہا۔

”کمرہ میں تو چل یا ہمیں ڈیوڑھی میں کھڑے کھڑے پڑھے گی۔“ بلقیس نے دالان کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے کمرے میں اطمینان سے پڑھیں گے۔“ میں نے کہا۔

بلقیس نے دالان میں جا اماں بی کو سلام کیا اور بیٹھ گئی۔ اماں بی نے دعائیں دیں اور مجھے آواز دی۔ میں گئی تو انہوں نے کہا ”تمہاری سہیلی آئی ہیں انہیں لیجا کر اپنے کمرے میں بٹھاؤ میں بلقیس کو لے کر اپنے کمرے میں آئی اور کمرے میں داخل ہوتے ہی پھر میں نے وہی سوال کیا ”کہاں ہے خط؟“

”میرے پاس ہے“ اس نے نہایت طمانیت سے کہا۔  
 ”اچھی تو کیا مجھے نہیں دکھائے گی؟“ میں نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔  
 ”دکھاؤں گی ضرور، مگر ایک شرط پر“ اس نے کہا۔

”وہ شرط کیا ہے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔  
 ”وہ یہ کہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ تم کوئی خط نہ لکھو گی“ اس نے مطمئن انداز میں کہا۔

”ادنیٰ بی! میں نے تو ابھی پڑنا بھی نہیں کہ اس میں لکھا کیا ہے اور جو اس میں کوئی جواب طلب بات ہو تو؟ میں نے کہا۔  
 اس پر بلقیس نے ایک مشعل بکچر دے ڈالا۔

”جسنی ذرا سوچو تو سہی تم کس بجھیرے میں الجھ رہی ہو۔ واقعات کیا ہیں؟ یہی ناکہ تم نے“ ادیب ”میں شریا کے نام سے ایک مضمون لکھا۔ جس نے مقبولیت خاص و عام حاصل کی۔ ایک مغلچے نے اڈیٹر ادیب کی معرفت اس مضمون کی تعریف کی ایک خط لکھا۔ چلیے تو یہ تھا کہ معاملہ یہیں ختم ہو جاتا مگر جہاں ہر انسان کی یہ کمزوری ہے کہ اپنی برائی سے ناراض اور تعریف سے خوش ہوتا ہے تمہاری انتہائی کمزوری اس طرح ظاہر ہوئی کہ تم نے اس توصیفی خط کا جواب لکھنے کی ٹھیرادی میں نے اسی دقت میں ہی منع کیا تھا کہ ایک غیر مرد کے خط کا جواب دینا کوئی ضروری امر نہیں ہے مگر تم نے کہا

لاؤ ذرا ان حضرت کو بنائیں۔ ذرا سا مذاق ہی رہے گا۔“ یوں اس مراسلت کی ابتداء مذاق سے ہوئی مگر اب میں دیکھتی ہوں کہ معاملہ سنجیدہ صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ شخص جس سے تمہاری خط و کتابت ہے کوئی معمولی آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ بحیثیت ادیب کے تمنائی کی صحافت اردو میں دھاک ہے، یہ بھی ضرور ہے کہ یہ نام فرضی ہے جبھی تو ایڈیٹر ادیب نے میرے پوچھنے پر لکھا تھا کہ ”دہلی کے رہنے والے ہیں اور اس نام سے مضامین لکھتے ہیں۔“

اس سے زیادہ خود انھیں معلوم نہیں کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں اچھا مضمون لکھا بھی تم نے کہ بیٹے بٹھائے اپنے ساتھ مجھے بھی اس مصیبت میں پھنسا دیا ایڈیٹر ادیب ہیں کہ مجھ سے تقاضا کر رہے ہیں کہ شریا صاحبہ سے اور کوئی مضمون لکھوا کر بھیجے ہر دوسرے تیسرے دن ایک خط بھیج دیتے ہیں۔ میں جواب دیتے دیتے تنگ آ گئی کہ مضمون کوئی آندھی کے آم تو ہیں نہیں۔ جب کوئی مضمون لکھا جائے گا آپ کو بھیج دیا جائے گا۔ ادھر وہ تمنائی صاحب میں کہ تمہاری جان کو آ رہے ہیں۔ اور تم ہو کہ انھیں جواب دے دے کر اور شہ دے رہی ہو ختم کر د اس علت کو یہ کیا روگ لگایا ہو۔ اپنے پیچھے؟ کہیں ہنسی میں پھنسی نہ ہو جائے۔ تم کہتی تو یہ ہو کہ تمنائی کو الٹو بنا رہی ہو مگر تمہارے خطوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو کچھ تمہیں لکھنا نہیں چاہیے وہ لکھ رہی ہو اور ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری تحریروں سے کسی مغالطہ میں مبتلا نہ ہو جائے۔ بھلا سوچو تو سہی ایک لڑکی کا اس طرح ایک اجنبی مرد سے سلسلہ مراسلت جاری رکھنا کہاں کی عقلندی ہے۔ اگر کسی کو جھوٹے بھی معلوم ہو گیا تو ساری عمر کے لئے خدا نہ کرے کلنک کا ٹیکہ

گنجانے گا۔ مجھ بندی کی بھی ناحق شامت آئے گی کہ ابھی سہیلی عقین غیروں کے خط لاکر دیتی عقین۔ اماں بی کے کان میں اگر اس کی جھنک بھی پڑ گئی تو میرا جڈا مونڈ ڈالیں گی۔ باز آئی بی میں ایسے بہنا پے سے ان سب سے زیادہ یہ کہ اب تمہاری بات بٹھری ہے اور عجب نہیں کہ عینے سوا عینے میں تمہاری شادی بھی ہو جائے۔ ایسی صورت میں تمہیں یہ خط و کتابت فوراً ختم کر دینی چاہیے۔ جب تک تم مجھ سے وعدہ نہ کرو گی کہ ان واسیہا باتوں کو جلد از جلد ختم نہ کرو گی میں تمہیں کوئی خط و خط نہ دوں گی۔

میں نے کہا خدا کا شکر ہے کہ تم نے اپنی اسپینج تو ختم کی۔ بہت بن چکیں مصلح بس اب وہ خط مجھے دکھاؤ۔

”اری ذرا سمجھنے کی کوشش تو کر تو تو ہر بات کو مذاق میں اڑا دیتی ہے۔ سارا رومان دہرا رہ جائے گا۔ مرد بڑے فربہ ہوئے ہیں چکنی چپری ہاتھوں سے عورتوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ ان کے ٹوکسی قول و فعل کا اعتبار کرنا ہی نہیں چاہیے۔ رہا خطوں کا معاملہ تو میرا یقین کہ خطوں سے زیادہ انسان کسی اور سکریر میں جھوٹ نہیں بوتا۔ یہ سب سے زیادہ خطرناک طریقہ ہے اور مکتوب میں جو کچھ لکھا ہوا ہو اس پر یقین کر لینا بے وقوفی ہے“ بلقیس نے کہا۔

”ہاں یہ تو میں بھی سمجھتی ہوں اور مجھے اپنے آپ پر اتنا اعتماد بھی کہ تم تنائی خواہ کتنے ہی بڑے انشا پرداز کیوں نہ ہوں مجھے بہکانے میں کامیاب نہ ہوں گے۔“ میں نے کہا ”یہ تو محض ایک دلچسپ مشغلہ ہے آج ہے اسل نہ ہو گا کوئی سادی عمر کا ٹھیکہ تو میں نے لیا نہیں ہے۔ اتنا میں اور کہوں گی کہ تم نے تنائی کی سیرت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا ہے ان کے دخط اس سے پہلے آچکے ہیں ان میں کوئی ایسی بات نہیں جسے خلاف تہذیب کہا

جائے۔ یا جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہو کہ ان کی نیت بخیر نہیں ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں تصنع کو بہت کم دخل ہے۔“

”بجا ارشاد ہوا۔“ بلقیس نے کہا۔ ”تمہارے پاس تو وہ خطوط محفوظ ہوں گے نا لاؤ تو ذرا میں انھیں تمہارے ساتھ پڑھوں۔ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ کتنے پانی میں ہیں۔“

”ابھی لاتی ہوں۔“ کہہ کر میں اٹھی اور میز کی دراز کھول کر دونوں خط نکال لائی۔

”پہلا خطبہ پڑھ کر سنائے۔“ بلقیس نے کہا۔

میں نے خط پڑھنا شروع کیا :-

حیران ہوں کہ آپ کو کس طرح مخاطب کروں؟ الفاظ مخاطب کو اس باب میں معذور پاتا ہوں۔ آپ سے میں قطعاً نادانگہ اس لئے رسمی الفاظ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ مبادا ناگوار خاطر گذریں۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ القاب و آداب کا فیصلہ خود آپ ہی پر چھوڑ دوں اور جو کچھ مجھے کہنا ہے کہنا شروع کر دوں انھیں میرے قلبی تاثرات سمجھئے۔

میں نے ایک نامعلوم خاتون کو خط لکھنے کی جسارت کیسے کی؟ سب کا جواب یہ ہے کہ ادیب میں آپ کا مصنوع ”رباب شکستہ“ دیکھ کر مجھ سے یہ ظلم نہ ہو سکا کہ آپ کو اس کی داد نہ دوں۔ گو عوام کی نظر میں میرا یہ فعل مستحسن قرار نہ پائے گا تاہم آپے ذوق کی اس فتنہ روشنی کا کیا کروں کہ جب تک آپ کو یہ خط نہ لکھ لیا قلب کا اضطراب دور نہ ہوا۔ آپ کا جی چاہے تو اسے مذموم

حرکت سمجھ کر مجھے برا بھلا کہہ لیجے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میری بے اختیار لائق تعزیر نہیں۔ بلکہ قابل رحم ہے۔  
 کہنے کو تو ”ر باب شکستہ“ ایک مایوس محبت کی سرگزشت غم ہے مگر مجھ سے پوچھے تو کہوں گا اس کا ہر نقطہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھ، ہر کشش ایک تڑپا دینے والی آہ اور ہر دائرہ ایک دھڑکتا ہوا دل ہے۔ میں نے بعض بعض فقروں پر گھنٹوں سردھنا ہے۔ کئی دفعہ یہ محسوس کیا کہ میرے دل کا درد شریا کے قلم سے ٹپکا ہے۔ کون شریا؟ آسمان صحافت پر پہلی مرتبہ چلنے والا ستارہ جس کی چمک دمک نے اور سب ستاروں کو مدہم کر دیا۔ جس کی تنویر نے دل و دماغ کی برکتوں کو بیدار کر دیا۔ جس کی روشن کر نوں سے میرے دل کی ہر چین جگمگا اٹھی۔

”ر باب شکستہ“ کو پڑھ کر مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک اجساڑ قبرستان ہے۔ جس میں ایک نئی قبر ہے۔ لوح مزار پر ”مرقدول“ کندہ ہے۔ شام کی اداسی میں ایک حسینہ سیاہ لباس پہنے رنجیدہ قدموں سے ”مرقدول“ کے قریب آکر چہرہ مزار روشن کر رہی ہے۔ سو جہی ہوئی سرخ آنکھیں پتہ دے رہی ہیں کہ آنسوؤں کے چٹے خشک ہو چکے ہیں۔ لبوں کا بدرنگ لاکھا بکار کے کہہ رہا ہے کہ اس خوب صورت سوگوار کو اسباب آرائش کی طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کندھوں پر بکھرے ہوئے سیاہ بال اور اترا ہوا زرد چہرہ دنیا سے پزاری غصا ہر

کہہ رہا ہے اور گویا زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ جس سے زیب  
وزینت تھی جب وہ ہی نہیں رہا تو اب بناؤ سنگار کس کے  
لئے کیا جائے؟

اس کو آپ "شاعری" نہ سمجھیں بلکہ آپ کے مضمون نے جو مجموعی  
اثر میرے دل پر کیا اس کی سچی تصویر ہے جسے میں نے اپنی تخیل  
کی آنکھ سے دیکھا ہے۔

مجھے دریافت کرنے کا حق تو نہیں ہے تاہم کیا میں آپ سے پوچھ  
سکتا ہوں کہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے آیا وہ واردات میں یا تخیلاً  
ہے تو ان میں سے جیسے جی خون کی بو آتی ہے، اگر میں غلطی پر  
ہوں تو مجھے آپ کے زبردست تخیل کی داد دینے دیجئے۔

"لوٹے ہوئے تاروں کو مت پھیرو۔ ان میں نغمہ کہاں ان  
کی جھنکار تمہیں پریشان کر دے گی۔ نغمہ سن کر جھوم جانے والے  
دوست! شکست نغمہ بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ تم رہا باب کے  
تاروں سے کھیلے رہے اور یوں پیدا ہونے والے ترنم میں کچھ  
ایسے کھوئے گئے کہ مضراب، ضرب و رہا باب سب کچھ کھو بیٹھے  
یہاں تک کہ ایک ایک کر کے تم نے سارے تار توڑ دئے۔  
پھر تم ان کی صدائے سیم خراش سے چونکے اور تم نے ایک  
حقارت کا قہقہہ لگا کر اس "رہا باب شکستہ" کو دور پھینک دیا  
اور دوسرا رہا باب اٹھالیا۔ مگر تم نے وہ آخری جھنکار نہیں سنی  
جو یوں حقارت سے پھینکے جانے پر رہا باب سے منبذ ہوئی اس  
میں سینکڑوں دکھی روحوں کی جگر پاش چینی تھیں، ہزاروں..."

بیواؤں کے بین کا شور تھا۔ لاکھوں بیٹیوں کی دل خراش  
 چیخ پکار تھی۔ کہ وڑوں مظلوموں کی دردناک آہ وزاری تھی  
 کیا اب بھی مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ ”شکست نغمہ“  
 کیا چیز ہوتی ہے؟“

مجھ سے نہ پوچھے کہ اس کو پڑھنے کے بعد میری کیا حالت ہوئی  
 خدا بھلا کر کے لازم کا کہ وہ بے بلائے آگیا اسے دیکھ کر مجھے  
 اپنی حالت سمجھانی پڑی اور خواہ مخواہ اسے کوئی غیر ضروری  
 کام بتانا پڑا۔ آپ نے دل کے خون میں ڈبو کر یہ فقرے لکھے  
 ہیں ورنہ ان میں اتنی حرارت نہ ہوتی کہ پڑھنے والے کا دل  
 اس کے قابو سے باہر ہو جائے۔ اس سے قبل کوئی مضمون آپ  
 کا میری نظر سے نہیں گذرا۔ شریا کا نام میرے لئے اب تک  
 اجنبی تھا۔ اگر آپ نے پہلے کچھ بھی لکھا ہے تو مجھے مطلع کیجئے  
 بہت شوق سے اسے پڑھوں گا۔

مجھے آپ کے جواب کا بہت انتظار رہے گا۔ اڈیٹر ادیب کی معرفت  
 مراسلت اگر کی جائے تو مناسب ہے کیونکہ میں اکثر دور  
 پر رہتا ہوں اور انھیں تبدیلی پتہ سے اطلاع دیتا رہتا ہوں۔

خاکسار

تمنائی

”اس قدر مبالغہ سے داد دینے کی ضرورت آخر کیا تھی؟“ بلقیس نے

ناک چڑھا کر کہا۔

”ارے بی! تم بھی حد کرتی ہو؟“ میں نے کہا۔ ”مبالغہ بھی تو ایک صفت

ہے وہ شاعر ہیں، بھلا اے کیسے چھوڑ دیتے؟" اس پر ہم دونوں نے خوب ہنسنے لگائے۔

"بلیقٹس!" میں نے کہا "اس سے تو تم بھی انکار نہیں کر سکتیں کہ سلسلہ مراسلت ہے بڑا دلچسپ"

"کیوں نہیں!" بلیقٹس نے طنز سے کہا۔ "دنیا میں صرف یہی ایک دلچسپ مشغلہ ہی تو رہ گیا ہے"

"اچھی تو ایمان نگل کہ بات نہ کیا کر" میں نے کچھ روٹھتے ہوئے کہا بھلا بتا تو سہی میرا اس میں بگڑتا کیا ہے؟ انھیں یہ تک نہیں معلوم کہ میں ہوں کون اور میرا پتہ کیا ہے؟ بہت سے بہت وہ یہ کر سکتے ہیں کہ تم سے میرے متعلق دریافت کریں تو مجھے یقین ہے کہ تم انھیں کچھ بھی نہ بتاؤ گی یہ کوئی قانونی جرم نہیں ہے کہ وہ مجھے پر مقدمہ دائر کر دیں گے۔ تو نے کبھی سمجھا ہی نہیں کہ رومان کسے کہتے ہیں۔

یہ ترے تن میں تو مردوں کی روح ہے"

"اے ہے تو رومان کیا اسی میں رہ گیا ہے کہ کوئی ایک مرد کسی عورت کی تعریف کرے اور پھر وہ عورت اس مرد کی جوابی تعریف کرے؟" بلیقٹس نے کہا "سبحان اللہ کیا رومان ہے"

"اری دیکھتی جا۔ یہ تو ابتدا ہے" میں نے کہا "کم نخت تجھے کیسے بتاؤں کہ یہ کیا چیز ہے"

"جی ہاں دیکھئے یہ آپ کی شہریت اور رومان پسندی آئندہ کیا رنگ لاتی ہے" بلیقٹس نے کہا۔

"اے ہے میں بھی تو کوئی ایسی ننھی بچی نہیں ہوں کہ کسی کے کہنے

میں آجاؤں " میں نے کہا۔  
 "پھر وہی بحث شروع ہو گئی" بلقیس نے کہا " ہاں وہ دوسرا خط  
 تو سادہ بیچوں انھوں نے اور کیا کیا جھوٹ فرمایا ہے "۔  
 میں نے پہلا خط طے کر کے رکھا اور دوسرا اٹھا کر پڑھنا شروع کیا:-  
 "شریاء"

ابھی ابھی تمہارا خط آیا۔ میرے لئے بہت سی حیرانیاں اپنے  
 ساتھ لایا۔ سب سے زیادہ تعجب خیز امر تو یہی ہے کہ "رباب  
 شکستہ" بعض تمہارے تجلیں کی تخلیق ہے میں تو سمجھا تھا کہ کسی  
 کہنے مشق ادیبہ نے شریاء کے فرضی نام سے اپنے نامرا د عشق کی  
 لفظی تصویر صفحہ قرطاس پر کھینچی ہے۔ مگر مجھے کس قدر تعجب  
 ہوا ہے یہ معلوم کر کے کہ ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کی جنبش قلم  
 نے "رباب شکستہ" کا حسین قالب اختیار کیا ہے۔ دوسری  
 حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ پاکیزہ مضمون بقول تمہارے سب  
 سے پہلا مضمون ہے، حب یہ نتیجہ ہے مشق اولین کا تو میں اپنی  
 بہترین توقعات تمہاری آئندہ تحریروں سے وابستہ کر سکتا ہوں  
 ع اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ

شریاء! تمہارے خط میں کئی نشتر ہیں جو میرے دل میں کھٹک  
 رہے ہیں۔ میں نے انقباض و آداب کی تلاش میں اپنا بہت  
 سادہ صرف کیا اور بالآخر ہار مان کر اس کا فیصلہ تم پر چھوڑ دیا  
 تھا۔ تم نے کتنی آسانی اور کس خوبی سے فیصلہ کر دیا:-  
 ان کی تو سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ جہاں تکلف و معارفت

ہو وہاں ان کی تلاش رہتی ہے۔ آپ مجھے صرف ٹھیکہ لکھا کیجئے۔ دوسرے یہ کہ اگر بجائے ”آپ“ کے اگر ”مخاطب“ تم سے کیا جائے تو وہ اجنبیت بھی نہ رہے گی جو اس بوڑھے لفظ سے چپکتی ہے۔ بوڑھو میں نے اس لئے لکھا کہ اس لفظ سے خواہ مخواہ بزرگی کا مفہوم دباہتہ ہو گیا ہے۔“

”آپ کی تصریح اس سے بہتر ناممکن ہے۔ میں اپنے حق میں بھی تم سے اس لفظ سے اجتناب چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں ابھی اس استعداد بزرگ نہیں ہوا ہوں کہ یہ سزا میرے لئے بخوبی کی جائے۔“

تم میرے حالات کو آگاہی چاہتی ہو۔ مختصر ایوں سمجھو کہ سات سال سے گورنمنٹ سروس میں ہوں۔ شہرت کی کبھی تمنائ نہ ہوئی۔ اسی لئے تمنائی کے قلمی نام سے کبھی کبھی کچھ لکھتا کرتا رہتا ہوں۔ تم نے میرے مضامین دیکھے ہیں اور ان کی بجد تعریف کی ہے۔ اتنی کہ میرا دماغ خواب ہو جائے اور میں اپنے آپ کو مافوق الانسا سمجھنے لگوں۔ فطرتاً تخیل پرست ہوں۔ اسی لئے مضمون نگاری کا شوق ہے۔ فنون لطیفہ سے مجھے دلچسپی ہے۔ شعر سے میری طبیعت کو مناسب خاص ہے مگر شعر بہت کم کہتا ہوں کیونکہ ہماری شاعری میں اچھا شعر کہنے کی بہت کم گنجائش ہے۔ اساتذہ قدیم سے کوئی بات نہیں چھوٹی۔ نثر میں ابھی نئی نئی طرزیں رائج کرنے کے لئے وسیع میدان پڑا ہے۔ اسی وجہ سے نظم چھوڑ کر نثر کی زیادہ توجہ کرتا ہوں۔ اکثر نقادوں کا خیال وہی ہے جو تم نے ظاہر کیا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ زیادہ الفاظ میں کم باتیں کہتے ہیں

اور تم کم الفاظ میں زیادہ باتیں۔ تمہاری پہلی وہ خصوصیت ہے جس پر مجھے رشک آتا ہے۔ تمہارے ذیل کے فقرے کو میں اپنی ادبی کاوشوں کی بہترین داؤد سمجھتا ہوں اور نازاں ہوں تحسین سخن شناس ہونے کی حیثیت سے میں اسے باعث فخر قرار دیتا ہوں:-

”آپ ایک ایسے اسلوب بیان کے مالک ہیں جس میں نظم و نثر کی سرحدیں مل گئی ہیں۔ شاعری کو پیغمبری کا جذبہ دکھا جاتا ہے میں آپچی و مکش نثر کو اس لحاظ سے پیغمبری کہہ دوں تو بجا نہ ہوگا۔ اگر اس صداقت پر مجھے آپ کا فرد گنہگار ٹھہرائیں تو میرا قصور معاف نہ کریں کیونکہ مجھے اپنی گنہگاری میں مزا آرہا ہے۔“

کاش اس ادبی کافرہ کی طرہ میں میں دو فقرے ہی لکھ سکتا۔ شریا اقم نے لکھا ہے کہ تم شاعرانہ زندگی بسر کرتی ہو مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی، انھیں پرست عوام بہت سی برائیوں سے بچے رہتے ہیں تمہاری تحریر میں ایک خاص قسم کی پاکیزگی ہوتی ہے جس سے روح کی آلائشیں پاک ہو جاتی ہیں میرا دل تمہاری طرف کھینچا جاتا ہے.....

حالانکہ میں نے عورتوں سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے اور تمہیں یہ سن کر شاید خوشی ہوگی کہ میں عورتوں سے نفرت کرنے والا شہو ہوں۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہارے وجود نے میرے دل کی دنیا ہی بدل دی ہے اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا نخواستہ

میں شامگی کی حدود سے گزرنا چاہتا ہوں خدا جانتا ہے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے۔ میری خیال پرست روح کو ایک تکمیل عورت کی تلاش تھی۔ خدا کا شکر ہے میں نے تمہیں پایا اور میری یہ دیرینہ آرزو برآئی۔ مجھے زندہ رکھنے کے لئے صرف یہی خیال کافی ہے کہ اس دنیا میں کم از کم ایک وجود ایسا ہے جس کو میں اپنا معبود خیال سمجھتا ہوں پہلے تمہارے مضمون نے اور پھر تمہارے خط نے مجھے ہمیشہ کے لئے تمہارا پرستار بنا دیا ہے۔ کیا میں توقع رکھ سکتا ہوں کہ آئندہ بھی تمہاری سرفرازیاں جاری رہیں گی ؟

تمہارا

تمنائی

”دہی بیجا تقریف اور شاعرانہ تعلیماں“۔ بلقیس نے کہا ”بھلا کوئی ان سے یہ تو پوچھے کہ تم خدائی فوج دار کون ؟“

”اری رہے دے ان باتوں کو۔ کیوں کسی کا صبر سببیتی ہے“ میں نے ہنس کر کہا۔ لا اب تو وہ خط دیدے۔

بلقیس نے اپنے انجی کیس میں سے گلابی رنگ کا ایک سر بند لفافہ نکال کر دیا۔ میرے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ دل کی دھڑکن ہاتھوں میں آگئی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ خط نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

شریلا !

تم نے تو اب کے اپنے خط میں سوالات کی بھرمار کر دی۔ ایک معقول و مستحکم تھا کہ میں چونک سا گیا۔ میں نے اب تک شادی کی نہیں

کی؟ دو نفلوں میں جواب یہ ہے کہ چونکہ اب تک میں تم سے نہیں ملا تھا اور اب جب کہ تم سے مجھے ذہنی اتصال نصیب ہو گیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان مادی تعلقات کی بجائے ضرورت نہیں ہے۔ میرا واسطہ اب تک خدا جو ٹ نہ بلائے تو سنیکڑوں عورتوں سے پڑ چکا ہے مگر نہیں جانتا کہ ان میں سے ایک نے بھی میرے قلب پر اپنی محبت کے نقوش کیوں مرتسم نہیں کئے۔ عورت کی فطرت کا ہر پہلو میری نظر کے سامنے ہے شاید یہی وجہ ہو کہ وہ عورتیں میرے دل میں محبت کی گرمی پیدا نہ کر سکیں۔ جن سے مجھے واسطہ پڑ چکا ہے تجیل کی دنیا میں عورت کو لائق پرستش مخلوق سمجھتا ہوں۔ مگر دنیا کے عمل میں اس خوب صورت مخلوق کو میں نے سدا دلکش آزار پایا اس کی لطافتیں صرف دور ہی سے بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور جب قریب سے اُسے دیکھا جائے تو اس کی تمام شہریت کا خون ہوتا ہے۔ جن مردوں کی شادیاں نہیں ہوئی ہیں وہ شادی کے لئے تڑپتے رہتے ہیں۔ اور جو مثال زندگی گزار رہے ہیں وہ اکثر گھریلو زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں میں نے اس وجہ سے یہ کلیہ قائم کیا ہے کہ عورت محض تجیل کی آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہے۔ تیس سال سے میں عورت اور دنیا کو بغور دیکھ رہا ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ مجھے ایک ایسی عورت مل جائے جو میرے مقررہ معیار پر پوری اترے مگر اب تک (سوائے تمہارے) مجھے کوئی ایسی عورت نظر نہ آئی۔ میں نے بیسٹار مردوں کو کہتے

سننا کہ عورت کی فطرت ایک ایسا معمہ ہے جس کو مرد حل نہیں کر سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرد عورت کی فطرت کو سمجھ ہی نہیں سکتا بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ عورت خود اپنی فطرت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ مرد بالعموم سیدھے سادے ہوتے ہیں اور صرف اس وقت دھوکہ دے فریب سے کام لیتے ہیں جب کہ وہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ عورتیں ہمہ تن دھوکہ اور سراپا فریب ہوتی ہیں اپنی شکل و صورت میں وضع قطع میں بات چیت میں روز مرہ کی زندگی میں محبت میں یہاں تک کہ ان کی روح بھی فریب سے رچی ہوئی ہے۔ ان کی آخری تنہا شادی ہے جس پر ان کی زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے جس کو انھوں نے اپنا منتہائے زندگی قرار دے رکھا ہے یہ بھی ایک فریب ہے جس میں شرع کا وسیلہ ڈھونڈا جاتا ہے اور جسے مرد کی غلامی کا موسوم کیا جاتا ہے۔ (تم اس کلیہ کی استثنا ہو) میں نے شادی کرنے والی عورتوں کی چند اقسام مقرر کی ہیں۔

پہلی قسم ان عورتوں کی ہے جو شادی شخص اس لئے کرتی ہیں کہ اپنی سمجھ بیدوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جائیں اور یہ سمجھا جائیں کہ شادی کے بعد وہ کچھ اور ہی ہو گئی ہیں اور واجب التحظیم ہیں۔ اس قسم کی لڑکیوں کو شادی کی خواہش یوں اور بھی زیادہ ہوتی ہے کہ اس سے انھیں آزادی زیادہ مل جاتی ہے۔ اور بڑی بوڑھیوں کی روک ٹوک ان پر کم ہو جاتی ہے۔ اس طرح انھیں موقع مل جاتا ہے کہ بیاہ کی آڑ میں کھل کھیلیں۔ دوشیزگی

کے زمانہ میں ان پر جو قیود اور پابندیاں عائد ہوتی ہیں شادی کے بعد اٹھ جاتی ہیں اور اپنی آرزو میں پورا کر لے کا انھیں زیادہ موقع مل جاتا ہے۔

دوسری قسم کی عورتیں وہ ہیں جو شادی کی اس لئے خواہش مند ہوتی ہیں کہ ان کو ایک مرد کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک بچہ سالانہ کی آرزو مند ہوتی ہیں ان عورتوں کو اس بات کا مطلق خیال نہیں ہوتا کہ کس مرتبہ کے شخص سے شادی کریں کیسی شکل و صورت ہو کیسی سیرت ہو کیا عمر ہو۔ ان باتوں سے انھیں کوئی غرض نہیں صرف مرد ہو اور بس۔

تیسری قسم کی عورتیں وہ ہیں جو شادی کا کاروبار کی ایک قسم قرار دیتی ہیں بچپن ہی سے ان کی تربیت اسی اصول کے ماتحت کی جاتی ہے۔ حصول دولت اور عیش و آرام ان کا مطمح نظر ہوتا ہے اس کی انھیں پرواہ نہیں ہوتی کہ بچے کس حال میں ہیں، بچے ہوں یا نہ ہوں اگر بے اولادی ہیں تو کوئی حرج نہیں اور اگر ڈیڑھ درجن بچے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر روپیہ پیسہ کافی ہے تو انھیں سب کچھ حاصل ہے۔

چوتھی قسم ان عورتوں کی ہے جو دوشیزگی ہی میں بذنام ور سوا ہو جاتی ہیں۔ انھیں شوہر کی تلاش اس لئے ہوتی ہے کہ ان کا دامن عصمت داغ بذنامی سے پاک ہو جائے۔ کھوئی ہوئی وقعت پھر انھیں کسی حد تک حاصل ہو جائے اس قسم کی عورتیں شادی اس لئے کرتی ہیں کہ وہ شادی کرنے پر مجبور ہیں اور سوسائٹی

میں منہ دکھانے کے لئے اور کوئی چارہ کار ہی انہیں نظر نہیں آتا۔  
 پانچویں قسم کی عورتیں وہ ہیں جو شادی کو مذہب عیاسی سمجھتی ہیں  
 ان عورتوں کو کسی ایک مرد کے ساتھ ساری زندگی گزارنا عجیب  
 نظر آتا ہے۔ ذرا میاں سے بگڑی اور انہوں نے حبث طلاق  
 لے لی اور نکاح کر لیا۔ اس کو بھی چھوڑا اور کسی سے بیاہ رہ چایا۔  
 غرض انہیں شادیاں کرنے کا شوق ہوتا ہے اور جتنی شادیاں  
 چاہتی ہیں کرتی ہیں۔

میں کہاں تک ان شادی کرنے والی عورتوں کی قسمیں گناہوں  
 تم سنے سنے تھک جاؤ گی۔ مختصر یوں سمجھو کہ سانب اور عورتوں  
 کی قسموں کا شمار ناممکن ہے ایسی صورت میں ایک سمجھ دار مرد کے  
 لئے شادی کا سوال مشکل ترین مسئلہ بن جاتا ہے جو قسمیں میں نے  
 اوپر بیان کی ہیں وہ اس قدر عام اور سرسری ہیں کہ ہر شخص جس میں  
 ذرہ برابر بھی عقل ہوگی ان سے اجتناب کرے گا۔

مجھے گاؤں کی دو شیرازہ بھی ناپسند ہے۔ معصوم دبے لوت وہ ضرور  
 ہوتی ہے گر بے زبان پالتو جانوروں کی طرح سبھے ایک عورت  
 کی ضرورت ہے۔ ایک ساتھی کی انگھروالی کی نہیں۔ مشین کی طرح  
 حرکت کرنے والی عورت کو میں صنف نازک کی توہین سمجھتا ہوں  
 یہ ہیں شادی کی مشکلات اور جب میں ان پر عورتوں کو میرا  
 دل متنفر ہو جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اتنے عرصہ تک جو میں  
 نے صبر کیا ہے اس کا اجر مجھے شریا کی صورت میں مل گیا۔  
 تم نے اپنی تازہ ترین نظم مجھے بھیجی۔ شکریہ! اس پر میرے

خیالات معلوم کرنا چاہتی ہو تو لوسنو۔ تم میں شعر کہنے کا ملکہ نہیں ہو  
 اس سے مناسب ہو گا کہ تم اپنی تمام تر توجہ صرف نثر کی طرف  
 رکھو۔ نثر میں تمہارا مرتبہ میرے نزدیک اتنا ہی بلند ہے جیسے  
 قدر کہ نظم میں ہے۔ اس سے تمہیں ہمت نہ ہونا چاہیے  
 بہت کم لوگ ایسے ہیں جو عمدہ شعر کہنے پر قادر ہوں یوں سیکڑ  
 شاعر پڑے پھرتے ہیں جن کو میں تو تک بند بھانڈ کہتا ہوں  
 تم کو تو شعر یوں بھی نہیں کہنا چاہیے کیونکہ تم خود سراپا شاعر ہو۔  
 تمہارا

### تمنائی

بلیقیس نے کہا چلو اس خط کو پڑھ کر یہ اطمینان تو ہوا کہ وہ تمہیں شادی  
 کی دہائی نہیں دیں گے۔ شک ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح رومانی دیوانے ہیں  
 اور محض تخیل پرستی ہی کو اپنا مقصد حیات سمجھ بیٹھے ہیں۔ مجھے تو م دو دنوں  
 کے مجنونانہ نظریوں پر ہنسی آتی ہے فطرت کے مقررہ اصولوں سے اگر بغاوت  
 کرنی ممکن ہوتی تو دنیا کبھی کی مٹ چکی ہوتی۔ یہ چو بچلے صرف اسی وقت  
 تک کے ہیں جب تک کہ تمہاری شادی نہیں ہو جاتی اور تمنائی کو ان کے  
 خود ساختہ نظریے توڑنے والی عورت نہیں مل جاتی۔

”مکن ہے کہ ایسا ہی ہو؟ مگر جب تک میری شادی ہو یا تمنائی کو کوئی  
 شکست دینے والی عورت ملے کم از کم اس وقت تک تو مجھے رومان کے ان  
 سہانے خوابوں کا لطف اٹھائے دو۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ شادی کی سنہری  
 زنجیروں میں مجھے دیر سویر جکڑ دیا جائے گا اور اسی لئے میں اس عہد زین  
 کا بہترین مصرف چاہتی ہوں اور میرے لئے وہ یہی ہو سکتا ہے کہ تمنائی

سے سلسلہ مراسلت قائم رہے۔ اچھی بلفیس وعدہ کر دجہہ سے کہ میری اسیری تک تم میرا ساتھ دوگی ۛ

میں نے کچھ اس قدر سبور کر کہا کہ بلفیس کو میری حالت پر رحم آگیا۔ گریمر منہ دیکھ کر مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئی۔ "روئے دیتی ہے مردی" اس نے زور کی چٹکی لے کر کہا اور پھر ہٹنے لگی دن بھر میرا مذاق اڑاتی رہی۔ ہر بات میں رومان اور تخیل پرستی کو ٹھینچنا کر لے آتی۔ یہاں تک کہ میں رو نہ پھٹی سی ہو گئی۔ سالن میں نمک زیادہ تھا تو کہنے لگی "اس میں کچھ رومان زیادہ ہو گیا ہے کہیں تمہاری بی بی کو بیا بھی تو تخیل پرستی میں مبتلا نہیں رہتیں؟ پان جو اس نے کھایا تو اس کا منہ پھٹ گیا۔ کہنے لگی "مردار تو نے اس میں رومان تیز کر دیا۔ میرے منہ کے ٹکڑے اڑا دئے اس موئے رومان نے شربت میں برف زیادہ پڑ گئی تو مجھے کہنے لگی "اری اس میں آنا سارا رومان کیوں ڈال دیا؟" غصہ کچھ ایسی رٹ لگائی رومان کی کہ مجھے اس لفظ سے نفرت سی ہونے لگی۔ شام ہوئے وہ خیر سے گھر سدھاری جب جا کر کہیں میرا پیچھا چھا۔

ہر دفعے تمنائی کا ایک خط آتا تھا۔ . . . . اور میں جواب لکھ دیا کرتی تھی۔ ان کے خطوں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میرا دل ان کی طرف کچھ جارتا تھا اور انتظار کے ساتھ دن گزارنے اجیرن ہو جاتے تھے۔ میں خود اپنی اس دار فقی پر ہنستی تھی کہ یہ آخر مجھے کیا ہو گیا۔ عذر کرتی تھی تو واقعات حد درجہ مضحکہ خیز نظر آتے تھے۔ بھلا ان سے میرا واسطہ کیا۔ ہزار چاہتی تھی کہ اس اجنبی سے خط و کتابت کا سلسلہ منقطع کر لوں اور لاکھ تہیہ کرنی تھی کہ اب کے خط آئے گا تو اس کا جواب نہ دوں گی مگر میرا دل مجھ سے بغاوت کرتا تھا

ادھر ان کا خط آیا اور میں جواب لکھنے بیٹھ گئی۔ میں انھیں لکھ دینا چاہتی تھی کہ یہ خط میرا آخری خط ہو گا مگر بے اختیاری کا یہ عالم تھا کہ حرف مدعا زبانِ قلم پر نہ آتا تھا۔ دل کے ہاتھوں اس سے زیادہ مجبوری اور کیا ہوگی؟ تمنائی کے خطوط نے رومان کی اتنی فضا پیدا کر دی تھی کہ مجھے سوائے زنجبسن کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ میری یہ حالت تھی کہ اس سہرے دھندلے میں بھٹکتی چلی جا رہی تھی۔

میری شادی کی گفت و شنید تو ہو رہی تھی اور بقیہ کی زبانی ساری باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ کئی جگہ سے بات آتی ہوئی تھی میرے والدین پرانے خیال کے نہیں تھے اس لئے مجھے ایسا لگتا تھا کہ زمانہ کالج لاہور میں تعلیم دلائی تھی۔ دورانِ تعلیم میں میری صحت نے میرا ساتھ نہ دیا۔ اور طبیوں نے مشورہ دیا کہ پڑھنا کھنا قطعاً چھوڑ دیا جائے چنانچہ کچھ ادھر ایک سال سے میں گھر ہی پر تھی۔ علاج باقاعدہ ہوا اور اب میری صحت بہت اچھی ہو گئی تھی اور مجھے پڑھنے لکھنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ پہلے تو جو پیغام میری شادی کا آتا تھا یہ کہہ کر واپس کر دیا جاتا تھا کہ ابھی لڑکی پڑھ رہی ہے اس لئے ابھی شادی نہیں کی جاسکتی۔ مگر اب جب کہ میں تندرست اور سہی کئی ہو گئی تھی تو میرے والدین کو میرے رشتے کا فکر بدل گیا پیغام تو کئی جگہ سے آئے ہوئے تھے اور آ رہے تھے اس لئے بے تلاش کرنے کی انھیں زحمت اٹھانی نہ پڑی اب سوال صرف انتخاب کا تھا۔ اس کا فیصلہ انھوں نے مجھ پر چھوڑ دیا اور بقیہ نے سارے رشتے میرے سامنے لا کر ڈال دئے میں شادی کے نام سے گھبراتی تھی۔ کیونکہ اپنی اکثر سہیلیوں کی آزادی سلب ہوتی دیکھ چکی تھی۔ مگر بقیہ نے پھر ایک طویل طویل لیکچر دے ڈالا۔ جس میں اسی بات پر زور دیا کہ

شادی تو بچھے کر لی ہی پڑے گی۔ انکار کی اس میں گنجائش ہی نہیں۔ میں نے بہت کچھ اسے قائل معقول کرنا چاہا مگر اس نے ایک نہ سنی اور مجھے اس قدر مجبور کیا کہ تنگ آ کر مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ آئے ہوئے رشتوں میں سے ایک کو بہت جلد منتخب کر لوں گی۔ وہ تو اپنے گھر چلی گئی اور میں عجب شش در پنج میں پڑ گئی۔ رفقوں کو ایک ایک کر کے دیکھا۔ ایک سے ایک اچھا تھا۔ ایک کا دوسرے سے تقابل کرتی رہی۔ بہت سارا وقت اس میں گزر گیا اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ تمنائی کے خیال نے میرا قلب اور بھی الٹ دیا۔ سوچتی تھی کہ میری رومانی زندگی ختم ہو جائے گی اور شرابا ختم ہو جائے گی تمنائی مجھ سے چھن جائے گا اور میں زبردستی کسی اور کے سپرد کر دی جاؤں گی۔ خدا جانے کس قسم کے شخص سے میرا واسطہ پڑ جائے۔ اگر میرے مزاج کے موافق نہ ہو تو جیتے جی مر جاؤں گی۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں؟ اسی گولگی حالت میں رات کی نیند بھی اچاٹ ہو گئی۔ طرح طرح کے دوسرے دل میں آتے رہے بہت رات گئے نیند آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں سینکڑوں بے تحاشے خواب دیکھے صبح ہوتے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔

خواب میں دیکھتی ہوں کہ ایک پر فضا مقام ہے۔ پودے پھولوں سے اور درخت پھلوں سے لدے ہوئے ہیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے قریب ہی ایک نغاف چشمہ رواں ہے مگر فضا میں ایک اداسی سی چھائی ہوئی ہے سامنے ایک بارہ دری ہے جس میں ایک عورت منہ پر نقاب ڈالے کھڑی ہے اس کی مضطرب جنبشوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی کا انتظار ہے تھوڑی دیر میں ایک لوجوان آنا نظر آتا ہے ہر چیز سے بشارت ٹپکتے ہوئے ہے اسے دیکھ کر مسرت کی لہریں اس عورت کے نقاب پر پڑ جاتی ہیں۔ بڑی

محبت سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں پھر منہ سی مذاق اور جھلیں ہوتی ہیں۔  
 فضا میں پھر ایک مدنی سی طاری ہونے لگتی ہے۔ نوجوان کی پیشانی پر  
 بن پڑنے لگتے ہیں چہرہ پر غصہ اور حقارت کے آثار جمع ہو جاتے ہیں۔  
 وہ اٹھتا ہے اور ایک طرف کو چلنے لگتا ہے عورت کی نقاب پر رخ و غم کی  
 شکنیں پڑ جاتی ہیں۔ خواب کا بے تکاپن دیکھے کہ وہ نوجوان جاتے جاتے  
 ایک دم سے جولوٹتا ہے تو بجائے ایک کے دو نوجوان کھڑے نظر آتے ہیں  
 اور وہ دونوں اس عورت کا رخ کرتے ہیں۔ جب قریب پہنچتے ہیں تو اس کی  
 نقاب پر حیرانی کے نقوش ابھر آتے ہیں وہ عورت سے دونوں کو دیکھتی ہے  
 اور سجد پریشان نظر آتی ہے دونوں نوجوانوں کی شکل و صورت میں ذرہ  
 برابر بھی فرق نہیں ہوتا وہ ابھی حیران و پریشان ہی کھڑی ہوتی ہے کہ وہ  
 دونوں ایک دوسرے سے مدغم ہونے لگتے ہیں اور پھر وہی ایک نوجوان  
 رہ جاتا ہے جس کے چہرے پر غصہ کے بجائے دلکش تبسم کے نشیب فراز  
 نظر آتے ہیں وہ آگے بڑھ کر اس عورت کی نقاب اٹھاتا ہے اور حالت خواب  
 ہی میں میری چیخ نکل جاتی ہے اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتی ہوں۔ نقاب میں  
 چھپا ہوا چہرہ میرا ہی چہرہ ہوتا ہے۔

عجیب جہنم خواب تھا۔ کچھ تو منہ سی آئی اور کچھ وحشت سی بھی ہوئی مگر  
 میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لی کہ یہ خواب پریشان متخیلہ کا نتیجہ  
 ہے۔ ابھی منہ ہاتھ دھویا اور ارادہ کیا کہ بقیہ کے ہاں جاؤں کیونکہ آج  
 تمنائی کو خط آنے کا دن تھا۔ شادی کا خیال سو ہاں روح ہونے لگا۔ بقیہ  
 نے کہا تھا کہ مجھے شادی تو کرنی ہی پڑے گی۔ آخر کیوں؟ محض اس وجہ سے  
 کہ میرے والدین کی مرضی ہے۔ چہرہ لڑکی کے والدین کی ہی مرضی ہے۔ مگر میرے

والدین اتنے جابر و ظالم نہیں ہیں کہ میری شادی زبردستی کر دیں گے میں تو سب سے شادی ہی کے خلاف ہوں۔ اپنا اختیار کھو کر پرانے بس میں ہونا۔ یہ سے شادی عورت کے جاوہ حیات کی یہ وہ منزل ہے جس پر پہنچ کر اس کے لئے آزادی خیال کی راہیں بھی سدود ہو جاتی ہیں۔ میں تو ذہنی مسرتوں کی دلدادہ ہوں خوابوں کی بستی میں رہنا چاہتی ہوں۔ تخیل کی نگرانی بسانا چاہتی ہوں۔ شادی میری مسرتوں کو مجھ سے چھین لے گی۔ میرے خوابوں کو توڑ دے گی میرے خیالوں کو دیران کر دے گی۔ نہیں نہیں میں شادی نہیں کروں گی۔ ہرگز نہیں کروں گی بلقیس سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ اگر میری زندگی چاہتی ہو تو میری شادی نہ ہوئے دو۔

ان ہی خیالات میں محو میں بلقیس کے ہاں پہنچی۔ شریر بلقیس کے چہرے پر سہنی کی لہریں پڑی ہوئی تھیں۔ کہنے لگی ”آئیے رومان صاحب! گھر میں بھی بیٹھا نہ کیا آج آپ سے؟ ایسی بے اختیار ہوئی؟“ میں نے کہا ”شیطان تجھے تو ہر وقت مذاق ہی سوچتا ہے۔ میرا دل خٹکانے نہیں ہے۔“

”خیر تو ہے بلقیس نے کہا ”کیا ہوا تجھے؟ ابھی خط آیا جاتا ہے۔“ میں نے کہا ”مردی خط تو جب آئے گا سو آئے گا۔ جب سے تو نے شادی کا معاملہ چھیڑا ہے میرا تو دن کا چین اور رات کا آرام غارت ہو گیا۔ سارے رتھے میں نے دیکھے مگر میں تو اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ میری شادی میری موت ہوگی۔“

”ہے ہے! لوج۔ شیطان کے کان بہرے۔ تو آخر اس قدر بیزار کیوں ہو رہی ہے کہ بات بات پر جان گنوائے دیتی ہے؟“ بلقیس نے

ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

میں نے کہا۔ "بلقیس! تم میری مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ جب میرا دل ہی ایک بات پر نہ ٹھکے تو مجھے اس پر مجبور کیوں کیا جائے گا؟" بلقیس نے دیکھا کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں معیم قلب سے کہہ رہی ہوں اور مجھے قائل کرنے کی کوشش بیکار ثابت ہو گئی۔ چنانچہ اس نے کہا "اگر تمہاری مرضی نہیں ہے شادی کی تو جانے دو۔ مگر دنیا زمانہ کا یہ دستور نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تم کم از کم اتنا کر سکتی ہو کہ شادی کے قصے کو ابھی اور ٹال دو۔ کیا خبر آئندہ کیا ہونے والا ہے؟" "خیر یہ تو کوئی ایسا مشکل امر نہیں ہے۔" بلقیس نے کہا۔ اتنے میں صنوبر خط لے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ بلقیس نے خط لیا اور چلی گئی۔

خط تمنائی کا تھا۔ وہی شاعرانہ نثر، تحریر میں وہی بانگین۔ خط طویل تھا اور بوجد دلکش دو ایک بایتیں خاص طور سے قابلِ غور تھیں لکھا تھا :-

"..... شاید اس خط کے ساتھ میں بھی دہلی پہنچ جاؤں

کمر سمس کی چھٹیاں اس بلد اشعر میں گزارنی چاہتا ہوں جو اپنی

آغوش میں میرے خوابوں کی شہزادی کو لئے ہوئے ہے جسکی

فضا شراب کی نظروں سے رنگین شخص سے معطر اور گفتگو سے

مترنم ہے۔ آہ! اس وقت خود مجھ کو اپنے اوپر رشک آئیگا۔

شعر و موسیقی کے پیکر لطیف سے قربت! اس کا خیال ہی مجھے

دیوانہ کئے دیتا ہے۔ کیسی لذیذ دیوانگی ہے۔ کیسا دلکش جنون

ہے۔ کہ اپنی فرزانگی اس کی نذر کرنا سعادتِ روح سمجھتا ہوں۔ —

اس خط کو دیکھ کر میری حالت دیوانوں کی ہونے لگی جی چاہتا تھا کہ میں جنونیوں کی طرح کھکھلانے لگوں۔ رنجین فضا میں نغمے تیرتے معلوم ہوتے تھے کائنات کا ذرہ ذرہ چیخ کر محبت کے مدھ بھرے گیت سنا رہا تھا اور مجھے دیوانہ بنا رہا تھا۔ مجھ پر سکر کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور حسبِ ہوشیار ہوئی ہوں تو دیکھا کہ میرا چہرہ گلاب سے تر ہے اور بقیق سے ہے کہ جیران و پریشان نظروں سے مجھے تک رہی ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو اس کی جان میں جان آئی اور مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کہنے لگی ”حسنی! یہ تو نے کیا حالت بنائی تھی۔ میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے تو پہلے کبھی تیری ایسی حالت دیکھی نہیں ہے۔ ہے! میرے تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ وہ تو بھلے کو گلاب پاستہ مجھے اسی دقت نظر آ گیا ورنہ خدا جانے دشمنوں کی طبیعت کا اور کیا حال ہوتا۔ میں بہت کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ میں نے کہا ”گھبراؤ نہیں بائبل اچھی ہوں۔ ذرا چکر آ گیا تھا“

دن بھر بقیق طرح طرح سے میرا دل بہلاتی رہی اور اپنے مذاق اور چھیڑ چھاڑ سے ہنساتی رہی۔ بدھ کا دن تھا۔ شام کو بدھ باغ لے گئی۔ مغرب کے وقت ہم وہاں سے چلے۔ تانگہ پہلے سے کھڑا ہی تھا۔ سوار ہو کر روانہ ہوئے ہم کوئی دو سو قدم گئے ہوں گے کہ خدا جانے کس چیز کو دیکھ کر گھوڑا بھڑکا اور سر پٹ ہو گیا۔ تانگہ والا راسیٹ کھینچتے کھینچتے آگیا کہ گھوڑا تھا کہ ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ میں بقیق سے لپٹ گئی تھی اور وہ مجھ سے چمٹ گئی تھی چشمِ زدن میں ہم دلی دروازے کے باہر نکل گئے

اور پرانے قلعہ کی سڑک پر اڑنے چلے جا رہے تھے۔ ہم دونوں پہلے تو ہمت کئے چپکے بیٹھے رہے اور یہی خیال کر رہے تھے کہ اب تانگہ رکا جاتا ہے مگر جب بائیں ٹوٹ گئیں تو ہماری ہمت بھی ٹوٹ گئی اور بے اختیار چیخیں نکلتے نکلتے گئیں۔ اتفاق وقت کہ اس وقت راہ گیر بھی اکا دکا ہی چل رہے تھے۔ اور وہ بھی حیرانی اور بے بسی کے سوا اور کچھ نہ کر سکتے تھے تانگہ برق رفتاری سے چلا جا رہا تھا اور تانگہ والا ہٹوا، بچو روکنا کا غل مجاہد ہاتھ۔ ہمیں موٹر کے ہارن کی آواز دور سے سنائی دی اور پھر قریب سے کئی بار جلدی جلدی ہارن بجا۔ پچاس قدم کے فاصلہ پر سامنے سے موٹر آرہی تھی اور تانگہ عین اسی کی سیدھ میں چلا جا رہا تھا۔ جب دس قدم کا فاصلہ رہ گیا تو موٹر ایک دم سے دائیں ہاتھ کو نہایت پھرتی سے بچا لگئی اور تانگہ آگے نکل گیا۔ ہماری چیخیں کسی طرح نہ رکتی تھیں۔ غالباً موٹر والوں نے واقعہ سمجھ لیا۔ کیونکہ موٹر کی پٹی اور ہمارے تعاقب میں تیزی سے آنے لگی۔ مجھے بس صرف اسی قدر یاد ہے اس کے بعد ہی تانگہ بجلی سے کھبے سے ٹکرایا اور الٹ گیا۔ میرا سر زور سے کسی پتھر سے ٹکرایا اور میں... بے ہوش ہو گئی جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ ایک صاحب مجھ پر جھکے ہوئے میرے سر کو پانی سے دھو رہے ہیں اس وقت پردہ درہ کیسا جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ میں اٹھ بیٹھی اور منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ درد سے سر پھٹا جا رہا تھا اھوں نے کہا آپ کے سر میں چوٹ آئی ہے۔ میں نے آپ کا سر دھویا ہے اور پن کیڑا باندھ دیا ہے۔ میں نے کہا: "بلقیس کہاں ہے؟" وہ بے چارے کیا جانیں کہ بلقیس کس کا نام ہے۔ مگر سمجھ گئے اور کہنے لگے "انھیں چوٹ زیادہ نہیں آئی ہے غالباً خوف سے بیہوش

ہو گئی ہیں۔ میں نے انھیں موٹر میں ..... سے تکیہ نکال کر لٹا دیا ہر  
ابھی ہوشیار ہو جائیں گی۔ یہ سن کر میں اپنی تکلیف تو بھول گئی اور حبث  
بلیقیس کی طرف چلی۔ اسی وقت اسے بھی ہوش آ گیا اور غیر مرد کو دیکھ کر شرم  
دیا سے اس کا چہرہ مٹمانے لگا۔ جلدی سے اس نے اپنا برقعہ اوڑھ لیا اور  
مجھ سے کہنے لگی "چوٹ تو نہیں لگی کہیں؟" میں نے اس وقت بتانا اس  
مناسب نہ سمجھا اور کہا "نہیں۔ تمہارے تو نہیں لگی؟" اس نے کہا  
معلوم تو ہوتا نہیں۔ "سامنے" تانگہ پڑا تھا۔ ایک پہیہ ٹوٹ کر چورا ہو گیا تھا  
گھوڑا نہایت اطمینان سے چرنے میں مصروف تھا۔ تانگہ والا سر جھکا گئے  
تانگہ کے پاس کھڑا ٹوٹے پہیے کو دیکھ رہا تھا۔

موٹر میں اور کوئی نہیں تھا۔ موٹر والے صاحب ہم دونوں کو باتیں کرتا  
دیکھ کر پڑے ہٹ گئے اور تانگہ والے سے کچھ کہنے سنے لگے۔ ان کے  
طرز گفتگو اور وضع قطع سے شرافت چمکتی تھی وہ پھر ہمارے قریب آئے اور  
پہنچی نظریں کئے ہم سے بے پردگی کی معذرت کرنے لگے۔

میں نے کہا "آپ ہمیں ناحق شرمندہ کرتے ہیں۔ ہم آپ کا شکریہ کسی  
طرح ادا نہیں کر سکتے۔ کیا ہم اپنے محسن کا نام دریافت کر سکتے ہیں؟"  
انھوں نے میرے سوال کا جواب نہ دیتے ہوئے کہا "اگر آپ اجازت  
دیں تو آپ کو آپ کے دولت خانہ پر پہنچا دوں۔ اس وقت اور ایسے مقام  
پر کسی اور سواری کا انتظام ناممکن ہے۔ تانگہ والے کو میں نے اپنے گھر کا پتہ  
بتا دیا ہے۔ کل صبح اس کا حساب کر دیا جائے گا۔" ہم نے شکریہ کے ساتھ  
اس اقدام کو قبول کیا اور موٹر میں جا بیٹھے۔ بلیقیس نے انھیں اپنے گھر کا پتہ  
بتایا اور موٹر روانہ ہو گئی۔ راستہ میں میں نے دو دفعہ اور ان سے نام پتہ

معلوم کرنا چاہا مگر آدمی تھے بڑے سلیقے کے۔ بڑی خوب صورتی سے اور باتوں میں ٹال گئے۔ میں سمجھ گئی کہ یہ حضرت چھانا چاہتے ہیں اور ان کی شرافت کا نقش میرے دل پر اور بھی گہرا ہو گیا۔ بلقیس کے گھر پہنچ کر انھوں نے ہارنا بجایا اور بھائی جان (بلقیس کے دو لڑکے) آواز سن کر باہر نکل آئے۔ ہم موٹر میں سے اتر آئے تھے۔ بلقیس کو دیکھ کر انھوں نے کہا ”تم کیسے؟ اور یہ کون جسنی ہیں؟“ بلقیس نے کہا ہاں ابھی بتاتی ہوں۔ تم انھیں تو بٹھاؤ۔“ اس نے موٹر والے صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ بھائی صاحب نے ان سے ہاتھ ملایا اور انھیں لاکر بٹھایا پھر دو منٹ کے لئے ہمارے پاس آئے اور پوچھا ”یہ آخر معاملہ کیا ہے؟“ بلقیس نے بہت تھوڑے نطق میں ماجرا سنایا تو وہ لپکے ہوئے گئے ان کے پاس اور ان کا بہت بہت شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا ”اب آپ میرے ساتھ کھانا کھائے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتے۔“ وہ بہت گھبرا رہے تھے اور جلد چٹکارہ حاصل کرنا چاہتے کہنے لگے :-

”مجھے آج تو بچے ایک جگہ شریک طعام ہونا ہے ورنہ ضرور آپ کی جہان نوازی کا لطف اٹھاتا۔“

”اچھا تو پھر کل کسی وقت کا وعدہ کیجئے۔“ بھائی صاحب نے کہا۔ میں کل کس وقت آپ کا منتظر ہوں؟“

”میں کل شام کو حاضر ہو سکوں گا۔ کیونکہ کل دن کو بھی ایک دوست کے ہاں وقت کا تعین ہو چکا ہے۔ اب اجازت دیجئے۔“ انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ اس وقت جلدی میں ہیں اس لئے میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔“

تاہم کیا میں آپ کا نام جاننے کا فخر حاصل کر سکتا ہوں؟“

بھائی صاحب نے میرا سوال ان سے پھر دہرایا۔

وہ اپنا نام نہ بتانا چاہتے تھے اس لئے کچھ پریشان سے نظر آئے  
مگر اب ٹانٹا ممکن نہ تھا اس لئے خاموشی سے اپنا کارڈ نکال کر پیش کر دیا  
اور کہا:-

”مجھے بھی اپنے اسم گرامی سے آگاہ کر کے مرہونِ منت کیجئے۔“

”مسٹر اشرف مجھے آپ سے مل کر بیحد خوش ہوئی اور میں آپ کی

ہمدردی اور مہربانی کا شکر گزار ہوں میں بھی اپنے نام کا کارڈ پیش کر رہا ہوں۔“  
یہ کہہ کر بھائی صاحب نے اپنا کارڈ نکال کر دیا۔

”شکر یہ مسٹر صہبائی! آپ نے اپنی خوش اخلاقی سے مجھے اپنا گردیدہ بنا  
لیا۔ کل شام کو آپ سے مفصل گفتگو ہوگی۔“ یہ کہہ کر انھوں نے ہاتھ ملایا اور  
چلے گئے بلقیس نے بھائی صاحب سے کارڈ لے کر بیچے دیا۔ اس پر محمد اشرف  
ایم۔ اے ڈپٹی کلکٹر لکھا ہوا تھا۔

رات کے نو بج رہے تھے بلقیس نے کہا ”اسی صورت میں تو میں تمہیں  
گھر نہ بھیجوں گی۔ بی اماں کو تمہاری چوٹ کا حال معلوم ہو گیا تو خفا ہوں گی آج  
تم نہ جاؤ۔ میں انہیں پرچہ لکھ کر بھیجے دیتی ہوں۔ کہ آج تم نہیں آؤ گی۔ کل شب  
کو ایک صاحب کی دعوت ہے اس لئے میں نے تمہیں روک لیا ہے کہ انتظام  
میں میرا ہاتھ بناؤ گی۔“

میں نے کہا ”اچھا۔ تم انہیں ابھی لکھ کر بھیج دو۔ وہ پریشان ہو رہی ہوں گی“

بلقیس نے پرچہ لکھ کر بھیج دیا اور تھوڑی دیر بعد جواب بھی آ گیا۔ اماں بی

نے لکھا تھا کہ پرسوں اسے ضرور بھیج دینا اس کے بغیر گھر سنان رہتا ہے۔

رات کو بہت دیر تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ تاہم گنگہ کا واقعہ اور پھر سٹر اشرف کی ہمدردی کا ذکر ہوا۔ میرے دل میں تو ان کی شرافت کھب گئی تھی!

اگلے دن میں نے تنائی کے خط کا جواب لکھا۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ رات سے ایک بات میں اور بھی محسوس کر رہی تھی۔ سٹر اشرف کا چہرہ آنکھوں میں بار بار پھر رہا تھا۔ کتنا خوب صورت اور کتنا شریف! شام کو وہ حسب وعدہ آئے اور میں نے جب تک انھیں جھانک کر نہ دیکھ لیا۔ چین نہ آیا۔ پھر اپنی اس حرکت پر منہسی بھی کہ یہ کیا حماقت تھی۔ بہت خوش مزاج اور خوش مذاق آدمی معلوم ہوتے تھے۔ بھائی صاحب سہ بہت دلچسپ باتیں ہوتی ہیں۔ جب وہ گئے ہیں تو ان دونوں میں گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ آتے رہے اور میرے سر کے زخم کے متعلق خاص طور سے پوچھ لیتے تھے۔ بھائی صاحب کی زبانی انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ میں کون ہوں۔ ان کے خاندانی حالات بھی معلوم ہو چکے تھے۔ وہ بی کے ایک شہر لیف گھرانے کے فرد تھے والدین کا انتقال زمانہ طالب علمی ہی میں ہو گیا تھا جو کچھ پڑھا لکھا تھا اپنے ذاتی ذوق و شوق سے آدمی بہت ذہین تھے۔ علی گڑھ سے ایم اے پاس کرتے ہی ڈپٹی کلکٹری مل گئی۔ سات سال سے یو۔ پی کے مختلف مقامات میں متعین ہوتے رہے۔ آج کل میرٹھ میں ہیں۔ شادی اب تک نہیں کی۔ بھائی صاحب سے ان کے تعلقات اتنے گہرے ہو گئے کہ ہر اتوار کو دہلی ان کے پاس جاتے تھے تاہم دسے کے واقعات کو تین گھنٹے ہو گئے تھے۔ اس عرصہ میں تنائی کے تین خط آنے چاہیں تھے مگر اب تک کوئی خط نہ آیا تھا۔ میرا خیال تو ضرور

لگا ہوا تھا مگر وہ بے چینی نہیں تھی۔ جو پہلے رہا کرتی تھی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے صرف تمنائی کا خیال میرے نخیل کی دنیا پر چھایا رہتا تھا اور اب جب سے مسٹر اشرف کو دیکھا تھا ان کی صورت اور باتیں وہ کہہ کر یاد آتی تھیں۔ تمنائی کی مراسلت اگر جاری رہتی تو شاید مسٹر اشرف کا خیال آنا جاگزیں نہ ہوتا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ میں انوار کے دن بلقیس کے ہاں ضرور پہنچ جاتی اس بات کو بلقیس بھی تاثر لگتی تھی اور ایک دن اس نے منہ پر رکھ ہی دیا۔

”کیوں بنو! یہ زخم سر میں آیا تھا یا دل میں؟“ اس نے شرارت دکھا کر میں نے چند رہا کر پوچھا ”دل کا زخم کیسا؟“

کہنے لگی ”اری رہنے دے خندی۔ کیوں باتیں بناتی ہے۔ اب مجھ سے بھی دل کے بھید چھپانے لگی؟“

میں نے کہا ”بلقیس! تو بڑی نظر باز ہے اب تجھ سے کیا کہتی ان باتوں کو اپنا گھٹنہ کھولو اور آپ ہی لاجوں مرو“

بلقیس بولی ”ہوں! تو یہ آگ دو طرفہ ہے! جی تو میں کہوں کہ آخر یہ انوار کا پھیرنا غد کیوں نہیں ہوتا اور ہاں اب وہ تمہارے تمنائی کہاں گے میں نے کہا“ اچھا اب مذاق کو تو چھوڑو اور ڈھنگ کی بات کرو۔ تمنائی نے اتنے دن سے کوئی خط نہیں بھیجا یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ میں کسی کے گلے زبردستی تو پڑتی نہیں وہ خاموش ہیں تو میں نے بھی چپ سادھ لی“

”ہاں ان کی بھی کسی عورت سے مدد بھیڑ ہو گئی ہوگی۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ یہ سب رومان دھرا رہ جائے گا“

بلقیس نے فحشہانہ لہجہ میں کہا ”تو تو سرے سے شادی ہی کے

خلاف ہے اب میں تجھ سے اور کیا کہوں ؟ ”  
 میں نے ہنس کر کہا ” میں اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر سکتی ہوں ۔“  
 ” ہاں اگر یہ ممکن ہو تو میں تجھے ایک خوش خبری سناؤں ۔ کل ہی تیرے  
 بھائی صاحب کہہ رہے تھے کہ حسنی کی شادی اگر اشرف سے ہو جائے  
 تو کیا برائی ہے میں نے کہا برائی تو کوئی نہیں ہے اور اس سے بہتر رشتہ  
 اور ہو بھی نہیں سکتا ۔ انھوں نے کہا تم حسنی کا عن ۔ یہ لو اگر وہ راضی ہو تو  
 اشرف کا پیغام بھجو ا دیں ۔ انھوں نے مجھ سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا تھا میں  
 نے کہا یا ہے کہ میں اپنی اہلیہ سے پوچھ کر کوئی جواب دے سکوں گا ۔ بول !  
 اب کیا کہتی ہے ؟ ”

میں نے کہا ” تو پیغام بھجو دے جہاں اور آئے ہوئے رکھے ہیں ”  
 میں اسے بھی شامل کر لیا جائے گا ۔ پھر غور کریں گے کہ کس سے شادی کیجائے  
 اس نے کیا ۔ زور کی چٹکی لی اور کہا ” اور وہ تیرا رومان ؟ اس موئے کا  
 کیا حشر ہو گا ؟ ”

میں نے کہا اس پر بھی غور کیا جائے گا اور ہنسنے لگی ۔  
 دوسرے دن بلقیس اماں بی کے پاس پہنچیں اور اشرف کی تعریفوں کے  
 پل باندھ دئے ۔ انھوں نے کہا ۔ ” اگر حسنی اس رشتہ کو پسند کرے تو ہمارا  
 فکر دور ہو جائے انھیں بچاری کو کیا خبر کہ کیسے کیسے انقلابات ہو گئے ۔“  
 اسی اذکار کو اشرف صاحب بھائی صاحب کے پاس آئے تو ان کی طرف  
 سے پیغام بھیجے یا گیا اور ابامیاں نے بھی اسے بہت پسند کیا ۔ اماں بی کو دیکھا  
 تو وہ جلا سوائے تعریفوں کے اور کیا کرتیں ۔ بلقیس نے پہلے ہی انھیں بچا کر  
 لیا تھا ۔ غرض بات طے ہو گئی ۔ جہیز تو تیار ہی تھا اور سب تیاری بھی ہو گئی اور

میری شادی ہو گئی۔

میں دواغ ہو کر میرے گئی۔ بہت عرصہ سچی سبائی کو ٹھٹی تھی۔ ہر چیز سے اعلیٰ مذاق ٹپکتا تھا۔ اشرف صاحب بہترین شوہر ثابت ہوئے۔ ہم دونوں میاں بیوی میں بہت ہی خلوص و محبت تھی۔ محبت کی ابتدا تو اسی دن ہو گئی تھی جس دن تانگہ کا سانحہ ہوا تھا۔ اشرف صاحب نے شادی کے بعد مجھے بتایا کہ میری بے ہوشی کے مختصر وقفے میں انھیں مجھے بغور دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ اور اسی وقت میری محبت ان کے دل میں جاگزیں ہو گئی تھی۔ مجھے بھی اقرار ہے کہ اشرف صاحب کو دیکھ کر میرے خیالات کی رونے ایک اور ہی سمت اختیار کر لی تھی۔ میرے لئے اب دن عید اور رات شب برات تھی۔ ایک عورت کے لئے اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کو ایک چاہنے والا شوہر مل جائے۔ ایک سال پلک جھپکاتے میں گزر گیا۔ اس عرصہ میں مجھے تمنائی کا خیال کسی دفعہ آیا۔ مگر میں نے فوراً ہی اسے دل سے ... نکال دیا۔ کیونکہ میرے لئے اب انھیں بھول کر بھی یاد کرنا گناہ تھا۔ میں اب اشرف صاحب کی ہوشیاری تھی اور ان کی محبت میرے ہر رگ و ریشے میں رچ رہی تھی۔ تمنائی نے اس عرصے میں مجھے کوئی خط نہیں لکھا اور میں نے بھی اسے بہت غنیمت سمجھا بلکہ اکثر خائف رہتی تھی کہ کہیں ان کا اندہ شوق نہ آجائے۔ واقعات کی اس ستم ظریفی کو دیکھ کر یہ کیفیت تھی کہ ان کے خطوط کو ترستی تھی یا اب یہ حالت تھی کہ ان سے ڈرنے لگی تھی۔ شاید تمنائی کی یاد مجھے اس لئے اور بھی کم آتی تھی کہ اشرف صاحب کے خیالات ان سے بہت ملتے جلتے تھے۔ یہ حضرت بھی اسی قدر مبالغے سے میری تعریف کرتے تھے جس قدر کہ تمنائی۔ میری روح تڑپتی تھی اتحاد و انتراک خیال کے لئے یہی

دجہتی کہ تمنائی سے سلسلہ خط و کتابت قائم ہو گیا تھا مگر حب اشرف صاحب کے ساتھ بھی مجھے یہ نعمت میسر آگئی (بلکہ خیال کے ساتھ عمل میں بھی) تو تمنائی کا اثر مجھ پر سے اٹھ گیا۔

ہمیں دنیا بھر کا عیش و آرام میسر تھا۔ اشرف صاحب ہر وقت میرا ہی دم بھرتے تھے اور میں بغیر کچھ دیکھ کر جیتی تھی۔ دوسرا سال بھی ختم ہونے کو آیا حب اشرف صاحب گھر پر نہ ہوتے تھے تو میرا بیشتر وقت امور خانہ داری میں گزرتا تھا اور جو کچھ بچتا تھا مطالعہ میں صرف ہوتا تھا مگر اس پر بھی میں اپنی روح میں کسی چیز کی کمی پاتی تھی ایک تشنگی سی تھی جو خالی اوقات میں شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ مجھے خطرہ ہو چلا تھا کہ کہیں میرا نخل حیات بے ثمر رہ جائے اس کا تذکرہ میں نے اشرف صاحب سے کیا تو انھوں نے میری خوب سنسی اڑائی اور کہا "آج کل کی تمدن دنیا جسے عذاب جان قرار دے رہی ہے تم اسے راحت روح سمجھ رہی ہو۔ تم بڑی خوش نصیب ہو کہ اولاد کے جھنجھٹ سے بچی ہوئی ہو۔ اس کی مصیبتوں پر تم نے کبھی غور نہیں کیا۔ ذرا اسی ایک سوال کا جواب دیدو کہ آخر اولاد سے والدین کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟" میں نے غور کیا تو واقعی تکلیف ہی تکلیف نظر آئی۔ دس بارہ مثالیں دے انھوں نے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کر دیا۔ خود میں نے اپنی کئی سہیلیوں کو جھپکتے دیکھا ہے۔ خاموش ہو رہی مگر قلب کی بے چینی نہ گئی۔ خدا جلے میری کیا کمزوری تھی کہ اولاد کی بچہ تمنی تھی، شاید میری اور بے اولادی بہنوں کو بھی اس جذبہ بے اختیار کا تجربہ ہو۔ پھر یہ حالت ہو گئی کہ شب و روز اسی کی آرزو اور افسردگی رہنے لگی۔ اشرف صاحب نے مجھے بڑی محبت سے سمجھایا کہ تم نے تھے۔ مگر میں اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ میری صحت خراب رہنے لگی

اور علاج معالجہ سے کوئی افادہ نہ ہوا۔ میں دیکھتی تھی کہ اشرف صاحب بھی میری علالت کو دیکھ کر کڑھتے تھے اور اکثر ناراض بھی ہوتے تھے۔ تین مہینے اور گزر گئے۔ میری مسرت کی کوئی انتہاء نہ رہی جب میں نے محسوس کیا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرا خیال غلط نہیں ہے تو میں نے نہایت مسرت سے اشرف صاحب سے اس کا ذکر کیا مگر میری ساری خوشی خاک میں مل گئی جب میں نے دیکھا کہ انھوں نے اس خبر کو اس طرح سنایا کہ کوئی وحشت ناک خبر تھی۔ گھبرا کر بولے ”حسنی! تم مجھ سے چھن گئیں“ اور فوراً باہر چلے گئے۔ بات گئی گزری ہوئی۔ میری صحت اچھی ہوئی شروع ہو گئی مگر اشرف صاحب کی نظریں کہتی تھیں کہ وہ مجھے اسی محبت اور پیار سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ میں طرح طرح سے ان کا جی بہلاتی تھی اور انھیں خوش کرنے کی کوشش کرتی تھی مگر ان کے مزاج کی اداسی بڑھتی جاتی تھی جب میرے ہاں لڑکی ہوئی ہے تو ان کا چہرہ زرد پڑ گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ فی الحقیقت انھیں روحی صدمہ ہوا ہے۔

سلی جس دن سے پیدا ہوئی تھی بیمار چلی جاتی تھی۔ میرا دم ہولوں ہی میں جا رہا تھا۔ کمزور بھی تھی ذرا سی بیماری بھی بہت معلوم ہوتی تھی، اشرف صاحب کا یہ کہنا کہ تم مجھ سے چھن گئیں، بڑی حد تک صمیم ثابت ہو رہا تھا۔ میں خود محسوس کر رہی تھی کہ میری تمام تر توجہ ان سے سٹ کر نہجی کی طرف ہو گئی تھی۔ میرا دن کا چین اور رات کا آرام تو بچے کے پیچھے گیا ہی تھا، اشرف صاحب کی زندگی بھی حقیقتاً بڑی بے لطف ہو گئی تھی۔ یا تو ان کی یہ حالت تھی کہ ہر وقت ان کا چہرہ بھول کی طرح کھلا رہتا تھا یا اب دلوں ان کے منہ پر مسکراہٹ بھی نہ آتی تھی۔ میں بچی کے معاملہ میں اس قدر رقیق القلب ہو گئی تھی کہ ذرا اس

کی طبیعت بگڑی اور میری حالت دیوانوں کی سی ہوئی۔ اشرف صاحب کو بھی پریشان کر دیتی تھی کہ ”اچھی ان ڈاکٹر صاحب کو بلا لاؤ۔ وہ بچوں کا خاص طور سے علاج کرتے ہیں“ دیکھنا ان کے علاج سے تو فائدہ نہیں ہوا فلاں حکیم جی کو دکھا دو۔ دیکھو تو ہسی گلوڑی کا کھیا سا منہ نکل آیا۔ اے ہے! اس کی تو حالت گرتی ہی جاتی ہے۔ یہ محلے میں جو نیڈت جی رہتے ہیں ویدک علاج کرتے ہیں انھیں بلا کر ذرا دکھا دو۔“ غرض وہ بچارے بھی بچی کی آئے دن کی بیماری سے تنگ آ گئے تھے۔ مرد ذات کہاں تنگ سہا کرے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی کالوں میں بچی میں کی آواز پڑتی۔ جب تک گھر میں رہتے اسی کا رونا سنتے۔ انھوں نے یہ کرنا شروع کیا کہ گھر کا رہنا بھی بہت کم کر دیا۔ مجھے اس پر غصہ آیا اور میں نے ایک ان اٹھیں سختی سے ٹوکا وہ کچھ نہ بولے اس پر اور بھی ”تاؤ آ!“ میں بھی منہ بھلا کر پڑ گئی۔ پہلے وہ میری خوشامیاد کر لیتے تھے۔ مگر اب منانے بھی نہ آئے۔ میں نے رور و کر آٹھیں لال کر لیں۔ مگر اس اللہ کے بندے نے الٹ کر یہ بھی جو پوچھا ہو کہ نیک بخت تو روتی کیوں ہے۔ غرض کچھ ایسے گم سم ہوئے کہ نہ منہ سے بولیں نہ سر سے کھیلیں۔ رات ہی کو میں نے یہ طے کیا کہ کل دن کی گاڑی سے دہلی چلی جاؤں گی۔ کچھ دنوں الگ رہیں گے تو شاید مزاج ٹھیک ہو جائے گا۔ دہلی میں بچی کا علاج بھی اچھا ہو سکے گا۔ صبح اٹھ کر میں نے ناشتہ تیار کر لیا اور جب ناشتہ کرنے بیٹھے تو میں نے کہا ”ننھی کا جی ٹھیک نہیں ہے۔۔۔۔۔“

اور آپ کو بھی بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ میں آج دہلی جا رہی ہوں۔“

کہنے لگے ”ننھیں اختیار ہے۔“

میں نے دیکھا کہ مزاج ابھی درست نہیں ہوا ہے اس لئے چکی ہو

رہی۔ انہیں کہیں باہر معائنہ کرنے جانا تھا۔ چلے گئے اور میں دہلی روانہ ہو گئی دہلی میں پہنچی تو بلقیس کو سب سے پہلے بلا بھیجا۔ اماں بی بی سے میں نے صرف یہی کہا تھا کہ نفی کے علاج کے لئے دہلی آئی ہوں۔ بلقیس آئی تو میرے اچانک آنے پر اظہار تعجب کرنے لگی۔

”اری تو یہ ایسا کیسی کیسی نازل ہو گئی؟“

”تمہارے بہنوئی سے لڑ کر آئی ہوں۔“ میں نے کہا۔

بلقیس نے کہا ”خدا خیر کرے“ میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ داں میں ضرور کچھ کالا ہے جو یوں بے اطلاع کے آئی ہے سنا تو یہی آخر ہوا کیا؟“ میں نے کل کیفیت بیان کی۔ سن کر کہنے لگی ”بڑے افسوس کی بات ہے۔ اثرِ صاحب تو بہت سمجھ دار آدمی ہیں۔ انہوں نے تمہاری مجبوریوں کو کیسے نظر انداز کر دیا؟“

میں نے کہا ”بوا ذرا دیجھو تو یہی اس میں بھلا میرا قصور کیا ہے؟ بچی پیدا ہوئی میری خطا؟ بچی بیمار رہے گی، میرا گناہ؟ اب جو وہ مجھ سے کہنے لگیں تو بھلا میں کیا کروں؟“

”ہاں سچ تو ہے۔ یہ تو سراسر ظلم ہے۔ مگر تو نے ایک غلطی کی اور وہ یہ کہ انہیں چھوڑ کر یہاں چلی آئی۔“ بلقیس نے کہا۔

”میں تو اس خیال سے آگئی کہ شاید اس عارضی جدائی سے ان کے خیالات کچھ سدھ جائیں اور انہیں اس کا احساس ہو جائے کہ میں کس قدر مجبور ہوں۔“ میں نے کہا۔ شاید تنہائی کی گھڑیاں انہیں کچھ سکھائیں۔“ بلقیس نے کہا ہاں یہ بھی ممکن ہے۔ پھر بھی تمہیں یہاں زیادہ دلوں نہیں رہنا چاہیئے۔ ہفتہ عشرہ میں واپس چلی جانا۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ

کہیں تمہارے پیچھے خدا نخواستہ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔ وہ ہیں آج کل پریشان سکون تلاش کرنے میں ان سے کوئی نفز میں نہ ہو جائے" میں نے بھی بقیہ کے کہنے کی صداقت کو محسوس کیا اور کہا "ہاں کچھ دنوں بعد چلی جاؤ گی۔ نبی کی طرف سے ذرا اطمینان ہو جائے" رات کو بقیہ چلی گئی۔

مجھے دہلی آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ اشرف صاحب کا کوئی حظ نہ آیا خیال تھا کہ وہ خط ضرور لکھیں گے مگر ان کی خاموشی سے بہت مایوسی ہوئی اشرف صاحب کی اس رکھائی نے دل خون کر دیا۔ میں غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتی جا رہی تھی کہ یکایک کسی نے مجھے سہارا دیا۔ یہ تمنائی کا خیال تھا جس نے مجھے اس کی گہرائیوں میں سے نکال کر پھر ساحل حیات پر لا کر کھڑا کیا۔ آہ! ماضی کی خوشگوار یاد نے میٹھی میٹھی چٹکیاں لے کر دل میں نیل ڈال دئے اور عالم بے اختیاری میں میری آنکھوں سے دو بڑے بڑے آنسو ٹپک پڑے جنہیں نے کہا اب تمنائی کی آرزو کرنا گناہ ہے۔ دل نے کہا جس کی وجہ سے خیال بھی گناہ ٹھہرا جا رہا ہے جب اسی کو تیری پرواہ نہیں تو پھر اپنی جان کیوں ہلکان کرے؟ اسی کشمکش میں خاصی دیر لگ گئی اور میں کسی نتیجہ پر پہنچ نہ سکی اس میں شک نہیں تھا کہ میں مظلوم ہوں اور میری مجبوریوں کا اشرف صاحب کو احساس نہیں ہے۔

میں نے اٹھ کر ادیب کا وہ پرچہ نکالا جس میں "باب شکستہ" شائع ہوا تھا۔ اپنے مضمون کا ایک ایک لفظ میں نے غور سے پڑھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ میں نے اپنی موجودہ حالت کا صحیح نقشہ اب سے تین سال پہلے کھینچ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اپنے ہی بارے میں پیشین گوئی

کی تھی۔ ”باب شکستہ“ حرفِ بجرٹ مجھ پر صادق آ رہا تھا۔ پھر میں نے تمنائی کے خطوط کا پیکٹ نکالا اور ایک ایک خط پڑھنا شروع کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے مطالعہ سے میری روح تازہ ہو رہی ہے۔ بے اختیار جی چاہا کہ عہدِ رفتہ دوبارہ آجائے دل نے تڑپ کر کہا یہ تو تیرے ہی ہاتھ میں ہے قلم اٹھا اور تمنائی کو خط لکھ دے ضمیر نے پھر اپنے نشتروں سے کچوکا۔ میں نے کہا اشرف صاحب مجھ سے کتنے ہی ناراض کیوں نہ ہو جائیں میں انھیں دھوکہ نہیں دوں گی، نہیں دے سکتی،

میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ جذبات میں ہیجان با تھا، میں نے قلم اٹھایا اور کہنے لگی ”باب شکستہ“ کے بعد میں نے کچھ نہیں لکھا تھا اور کاموں سے فرصت ہی اتنی نہ ملتی تھی کہ کچھ لکھوں۔ پہلے سکونِ خاطر بہتا تھا۔ اطمینان سے مضمون لکھ لیا تھا۔ اب اضطرابِ دل نے مجھ سے مضمون لکھایا۔ یہ مضمون بھی پہلے مضمون سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ وہ تخیلات تھے اور یہ تاثرات۔ مضمون مکمل ہو گیا تو میں نے اس کا عنوان ”افسردگی کی آرزو“ تجویز کیا۔ ادیب ایک عرصہ سے نہیں آیا تھا۔ غالباً سب ہو چکا تھا۔ ان دنوں ”سنبلستان“ ادبی حلقوں میں بہت مقبول تھا۔ میں نے مضمون صاف کر کے اس میں شریک کے نام سے پمچدیا دو مہینے بعد جو پرچہ شائع ہوا اس میں ”افسردگی کی آرزو“ مع ایک طویل ایڈیٹوریل نوٹ کے شائع ہوا۔ نوٹ میں ”باب شکستہ“ کا حوالہ بھی تھا اور لکھا تھا کہ یہ انھیں نامور خاتون کا مضمون ہے۔ پرچہ شائع ہونے کے تین دن بعد ایڈیٹر ”سنبلستان“ کی معرفت میرے نام ایک خط آیا۔ اندازِ تحریر دیکھتے ہی میں پہچان گئی کہ تمنائی کا ہے۔ جلدی سے کھولا۔ خط یہ تھا :-

ٹردیا

اتنے عرصہ میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ تم میری اس طویل خاموشی سے ناراض ہو گے۔ مگر سچ جانتا ہے

گو میں رہا رہیں ستم ہائے روزگار۔ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں ہا  
ادیت کبھی کا سنبھو چکا۔ اس کے ایڈیٹر کا بھی انتقال ہو گیا۔ تمہارا پتہ  
مجھے معلوم نہیں تھا اور نہ تمہیں میرے پتہ کا علم۔ تمہیں خط کیسے بھیجتا  
دل موس کے رہ گیا "سنبستان" میں ابھی ابھی تمہارا مضمون  
"افسردگی کی آرزو" دیکھا۔ مدت کی دہائی ہوئی چوٹ ابھر آئی۔ دل  
کے پرانے زخم خون دیسے گئے اسی خون سے تمہیں یہ خط لکھ رہا  
ہوں۔ شاید تمہیں بھی میری بیکسی پر رحم آ جائے۔

میں نے اپنے آخری خط میں تمہیں لکھا تھا کہ میں غمگین دہلی آنے  
والا ہوں۔ میں دہلی آیا تھا اور مجھ سے دور تھا کہ شربا کے دیس میں سانس  
لے رہا ہوں۔ میں خوش تھا کہ میں وہاں ہوں جہاں میرے  
زنگین خواب کی خوب صورت تعبیر ہو رہی ہے۔ اس خط پاک کا  
ہر ذرہ چمک کر مجھے شربا کا پتہ دے رہا تھا۔ یہاں کی فضا میں  
وستی کی سی ملی جلی کیفیت تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ میری شربا  
کی نیٹلی انکھڑیوں میں ہر وقت شراب دہلتی رہتی ہے۔ میری  
روح کی پیاس بڑھتی جا رہی تھی کہ ناگاہ مجھے ایک سراب نظر آیا  
آہ! میں کیسے کہوں کہ تمہارا تمنائی بہک گیا۔ میری زندگی کے صحرا  
میں ایک زنگین گولہ اٹھا اور میں اس میں گم ہو گیا۔ میں اپنی اس  
کمزوری کا تم سے کس طرح اقرار کر دوں کہ ایک عورت نے مجھے

شکست دے دی حسن کی بے پناہ ساحرانہ قوتوں نے مجھے بے اختیار  
 کر دیا اور مجھ سے بھی وہ لغزش ہو گئی جو ایک کمزور انسان کا خاصہ  
 طبعی ہے۔ شادی، کس قدر خوشنما فریب، کبسا دلکش دھوکہ، بستا  
 سے زیادہ خوب صورت اور زہر سے زیادہ خوش رنگ۔ میں اس  
 سانپ سے کھیلتا رہا، اس کی زہریلی فطرت سے بے خبر، اس کے  
 مقتضائے طبیعت سے بے پروا، اس کی ہلاکت آفریں پینکا  
 کو محبت کا جاں نواز نغمہ سمجھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے مجھے  
 ڈس لیا۔ اس زہر کو میں نے جو ہر حیات سمجھ کر چکھا اور اس کی  
 مٹھاس نے میری عقل سلب کر لی۔ میری بصارت و بصیرت  
 مفلوج ہو گئی اور میں اس خوش ذائقہ زہر کو کھاتا رہا۔ یہاں تک  
 کہ جب ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ زندگی کے خون کی بجائے  
 میری رگوں میں موت کا اہونگر دھس کر رہا ہے۔ سانپ نکل چکا  
 تھا اور اب صرف اس کا اثر باقی تھا۔ آہ! میرے خوابوں کے  
 جزیرے ویران ہو چکے تھے اور اس ویرانے میں تمنائی کی پریشا  
 روح بھبھکتی پھر رہی تھی۔ یہ ہے مختصر روئیداد اس شخص کی جو اپنے  
 آپ کو مقدس فرشتوں سے بھی اعلیٰ وارفع سمجھتا تھا۔ مگر اب حیر  
 انسان سے بھی خود کو کمتر اور ذلیل پاتا ہے۔

”رہ باب شکستہ“ کی طرح ”آخر دگی کی آرزو“ میں بھی خیالات  
 کی تیرجانی کی گئی ہے۔ مگر اس نقشِ ثانی میں وہ تمام شدتیں برک  
 کا آگئی ہیں جن کی جھلک نقشِ اول میں نظر آتی تھی۔ جس طرح  
 چھری گئے مل کر تڑپ کو اور بڑھادیتی ہے اسی طرح مہارے

مضنون نے میرے رٹپنے اور ترڑپتے رہنے کا سامان مہیا کر دیا۔ شریا مجھے نہیں معلوم کہ جب سے ہماری مراسلت اتفاقاً ختم ہوئی تم پر کیا بیتی۔ تاہم میں دست بدعا ہوں کہ میرے سوال کے جواب میں یہی کہہ سکو کہ یہ مضنون بھی پہلے کی طرح محض تخیلی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ جس عورت کے دل و دماغ پر مایوسیوں اس قدر غلبہ پائی ہو وہ زندہ بھی رہ سکتی ہے یا نہیں جس کی کیفیت یہ ہو گئی ہو کہ سنسنے میں بھی آنسو نکل پڑتے ہوں اس سے زیادہ قابل رحم اور کوشنی ہستی ہو سکتی ہے۔ تمہارے مضنون سے زیادہ غم انگیز جذبات میں نے آج تک کسی اور مضنون میں نہیں دیکھے ایسی دکھ بھری داستان میں نے آج تک نہیں سنی۔ تمہارے مضنون کا خصوصاً وہ حصہ جہاں تم نے ماضی اور حال کا تقابل پیش کیا ہے اس درجہ دردناک ہے کہ حساس طبیعتیں اسے پڑھ کر اپنے آنسو ضبط نہ کر سکیں گی۔..... میں آؤ پڑھتا تھا اور روتا تھا، روتا تھا اور پڑھتا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ اسے یہاں نقل کروں اور اس کے ہر حرف پر اپنے آنسوؤں کے موتی بچھاؤں کہ تا جاؤں :-

چاند لے آسمان پر کھیت کیا۔ اس کی ٹھنڈی سیلی  
 روشنی ہر چیز پر پھیل گئی۔ یہ سماں میں نے پہلے بھی  
 کئی دفعہ دیکھا تھا اور اس وقت میرے دل کی  
 دہڑکن کہتی تھی کہ کوئی نئی ذیلی دہن ہے جو  
 سونے میں سیلی اور موتیوں میں سفید ہو رہی ہو

اس کا تبسم ہے کہ گھونگھٹ میں سے پھوٹے پڑتا ہو  
 اور دولت زر بن کر کائنات میں بکھرا جاتا ہے۔ اب  
 بھی وہی رات ہے وہی چاند، مگر میرے من کی  
 اداسی کہتی ہے کہ یہ تو کسی عورت کی نعش ہے جس  
 کے چہرے پر موت کی بھیاں نک زد دی کھنڈی ہوئی  
 ہے پہلے خوشی سے میری رگوں میں زندگی کا گرم  
 خون پھیلنے لگتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی  
 ہر لہر میں مسکراہٹیں گھلی ہوئی ہیں مگر اب میرے  
 ہر رگ دریغ میں موت کی سی ٹھنڈک گردش کرنے  
 لگتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم کے گرم گرم آنسو  
 میری روح کو داغ رہے ہیں۔ پہلے رنگین فضا  
 میں مسرت کے تھمتھے فشر ہوتے نظر آتے تھے مگر  
 اب بدرنگ فضا میں کرب کی چیخیں گھلی ملی نظر آتی  
 ہیں دور سے کسی کے گانے کی آواز رات کے سناٹے  
 میں تیرتی ہوئی آئی۔ میں نے جانا جیسے کوئی میری  
 مردہ حسرتوں کا نوحہ سن رہا ہے۔

شراب! خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ تم نے یہ فقرے کس جذبہ کے  
 ماتحت کہے ہیں؟ مجھے تو ان کی آڑ میں تمہارا چہرہ بھی آنسوؤں سے  
 تر نظر آ رہا ہے۔ میں محبت نا جنس کا شکار ہوں۔ کیا تم نے یہ آنسو  
 مجھ ہی پر بہائے ہیں؟ اگر واقعہ یہی ہے تو میں تمہارا شکر یہ کس  
 طرح ادا کروں؟ مجھے اپنے واقعات سے مطلع کرو۔ خدا کرے کہ

تم خیریت سے ہو۔

تمہارا تمنائی !

تمنائی کے خط کے آنے سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ مگر یہ معلوم کر کے افسوس بھی ہوا کہ وہ بھی میری طرح ناخوشگوار شادی کی مصیبت میں مبتلا ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہوا ہو کہ یہ حضرت بھی اشراف صاحب کی طرح اپنی بیوی سے خواہ مخواہ ناراض ہو گئے ہوں اور وہ بچاری میری طرح بے لطف زندگی کے دن گزار رہی ہو۔ اس خیال کا آنا ہی تھا کہ مجھے اس کا یقین سا ہو گیا۔ مرد عموماً عورتوں ہی کو قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ عورت کس قدر مجبور ہو جاتی ہے۔ ماں بننے کے بعد اس کی ذمہ داریاں کتنی بڑھ جاتی ہیں۔ مردوں کی خواہش تو یہی ہے کہ ایک ہی عورت ماں کے فرائض بھی انجام دے۔ بیوی کے بھی اور دلربا کے بھی اس خیال کے آتے ہی میں تمنائی کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ خط میں میں نے لکھا کہ میری شادی کو کچھ اوپر تین سال ہو گئے اب ایک بچی کی ماں ہوں۔ میرے شوہر کو بھی مجھ سے کچھ شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کے بعد میں نے عورتوں کی مردوں سے غلط توقعات کی وضاحت کی۔ مردوں کے جو روتشدد کی مثالیں پیش کیں اور ان سے دریافت کیا کہ مسز تمنائی پر کہیں ان کی طرف سے تو زیادتی نہیں ہو رہی۔ آخر میں مسز تمنائی کے مفصل حالات لکھنے کی استدعا کی اور اپنے مضمون کی تعریف کا شکریہ ادا کیا۔

خط اسی دن لکھ کر ڈلوادیا۔ چار دن بعد جواب آیا جس میں میرے خط کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا :-

تمہارا خط دیکھ کر مجھے تسلیم کر لینا پڑا کہ مرد فی الحقیقت

جابر و ظالم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں خود محسوس کر رہا ہوں کہ میری طرف سے زیادتی ہوئی۔ تمہارے خط نے میری آنکھوں پر سے خود غرضی اور نفس پرستی کے پردے اٹھا دئے۔ شریا تم میرے لئے نیکی کا فرشتہ ہو۔

میری بھی ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ جو نہیں جانتی کہ باپ کی محبت کسے کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس بچی ہی کو ان تمام بد مزگیوں کا سبب ٹھہراتا تھا جو ہم میاں بیوی میں پیدا ہو گئی ہیں گلاب سے آئندہ اس کا باپ اس سے محبت کرے گا اور اسی کی خاطر اس سے بھی محبت کرے گا۔

منزل تنائی سے شادی بربنائے محبت ہوئی تھی۔ اس سے تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ وہ کیسی ہوں گی مجھے یہ سن کر بیدار بخ ہوا کہ تمہارے شر ہر دم سے شکی ہیں۔ اتنی سمجھ دار عورت سے اگر مجھے شکایت پیدا ہو تو میں اسے اپنی غلطی سمجھوں گا کیا میں تم سے پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ انھیں تم سے کس نوع کی شکایات ہیں۔ ————— ؟

خط کا جواب میں نے لکھ دیا۔ اس میں اشراف صاحب کی ناراضگی کا سبب بھی لکھ دیا کہ محض اس لئے کشیدہ خاطر ہیں کہ میں ایک بیمار بچی کی ماں کیوں بن گئی چند اور رسمی باتیں لکھ کر خط ختم کر دیا۔

شام کو بلقیس آئی تو کہنے لگی تمہیں آئے ہوئے خامے دن ہو گئے نضحی بھی اب سا لٹوٹی ہو گئی ہے یہاں زیادہ دنوں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ میں نے کہا ”ہاں میں تو خود جانے کا ارادہ کر رہی ہوں۔ کل شام

کو چلی جاؤں گی۔ دیکھئے اب آئندہ کیا رہتی ہے اور وہاں دیکھنا اگر میرا کوئی خط آئے تو پتہ کاٹ کر میرے بھج دینا۔“

اس نے پوچھا ”کس کا خط آنے والا ہے؟“ میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ تمنائی سے پھر خط و کتابت ہو رہی ہے۔

میں نے کہا ”شاید کسی کا آئے۔“

اس نے کہا ”خطوط تو میں سب بھیج دوں گی پہلے تو تو نکل بیجا۔“ دوسرے دن شام کو میں میرے گھر روانہ ہو گئی۔ اشرف صاحب کو میرے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ غامضی رات گئے کلب سے واپس آئے تو مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ رات کو ایک آدھ بات کی۔ صبح کو بھی جب غیر ضروری باتیں ہوتی رہیں۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے کہ ملازمہ نے ڈاک لا کر دی۔ اشرف صاحب نے ایک ایک کر کے خطوط دیکھے شروع کئے۔ ایک گلابی لفافہ دیکھ کر میرا دل پرکاساں اڑا اور وہ نیچے کاغذ پر لکھا کہ پتہ کی بناءً ”ٹی“ تحریک کو میں نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ وہ خط تھا جو برسوں میں نے تمنائی کو لکھا تھا۔ میں نے بے اختیارانہ ایک دم سے جھپٹ کر اسے اٹھا۔ اشرف صاحب کے چہرے پر بھی ہلکیاں اڑ رہی تھیں۔ انھوں نے کہا ”وہ خط میرا ہے مجھے دو۔“

میں نے کہا ”نہیں میرا ہے۔ اس میں کچھ خانگی باتیں ہیں اس لئے آپ کو نہیں دکھا سکتی۔“

انھوں نے کہا۔ ”وہ خط تمنائی کے نام ہے۔ تمہارا نام تو تمنائی نہیں ہے۔“

میں نے جلدی سے پوچھا ”اور کس کا نام ہے؟“

”انھوں نے کہا ”میرا فلمی نام ہے۔“

میرے ہاتھ سے خط گر پڑا۔

”آپ تنہائی میں؟“ میں نے استعجاب سے کہا۔

”ہاں، کیا تم اس نام سے واقف ہو؟ انھوں نے پوچھا۔

میں نے ان کے سوال کا جواب ایک اور سوال سے دیا ”کیا آپ شریا سر

واقف ہیں؟“

وہ یہ نام سن کر بھونچکے سے رہ گئے ”شریا————— تمہیں اس کے

متعلق کیا معلوم ہے“ انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔

میں نے کہا ”میں شریا سے اسی قدر واقف ہوں جس قدر کہ اپنے آپ سے

شریا میرا قلمی نام ہے“

ان کے چہرے پر حیرت و انبساط کے مخلوط آثار نمایاں ہوئے۔ تم، تم شریا

ہو؟ حسنیٰ کیا تم شریا ہو؟ اچھا تو بتاؤ اس خط کا مضمون کیا ہے؟“ انھوں نے

خط کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

میں نے خط کا سارا مضمون انھیں بتا دیا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھ مجھے تکتے

رہے۔ پھر اٹھ کر میرے قریب آئے اور کہنے لگے ”حسنیٰ گزشتہ سب باتوں کو بھول

جاؤ۔ تم نے اپنے خطوں میں مجھے میری کمزوریوں سے آگاہ کر دیا۔ میں انکے اصلاح

کرنیکی کوشش کروں گا یہاں سے ہمارے زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہو۔ اب سے ہم تنہائی

اور شریا کی نجلی زندگی کی لطیف رنگینیوں کو اشرف اور حسنیٰ کی عملی زندگی میں منتقل کر

کی کوشش کریں گے“

ہمارے آنکھوں میں ایک نئی زندگی چمک رہی تھی اور اس معاہدے پر ایک

طویل بوسے کی مہر ثبت کی جا رہی تھی۔

شاہد احمد، بی اے (آنر)، دہلی

# خواب

اور

## اُس کی تعبیر

اگر چندی آنکھوں، دبیز عینک اور طویل ٹاپل ناک کے باوجود کوئی شخص معقول ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے تو اقبال المعروف بہ صحرائی بلگرامی حال مقیم الہ آباد پیشہ لکچرار لارنس کالج الہ آباد ہر طرح معقولیت کا مجسمہ کہلانے جانے کا مستحق تھا۔ خوش اخلاق و خوش اطوار، خوش گفتار، خوش حال اور خوش پوشاک ہونے کے ساتھ ہی وہ خوش خور بھی تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ بریانی اور متبخن کی تین تین لبریز قاپیں چٹ کر جانا اس کا معمول تھا، یہ بھی کہلا جاتا ہے کہ فرصت اور فراغت کے لمحات میں نئے نئے کھانے ایجاد کرنا اس کا محبوب ترین شغل تھا۔ بہر کیف اس کمزوری کو دور کرنے کے بعد وہ ہر طرح ایک دلچسپ آدمی تھا۔ لائق، فائق، غور و فکر کا عادی۔ اچھا شاعر اور

انشاپرداز، ہندوستان میں معاشیات کے ایک اہل فکری تنظیمی پروگرام کا مجدد، جریدہ "نوبہار" کا مستقل نامہ نگار، تنہائی پسند بھائی قلعوں کا معمار، بے انتہا سگریٹ پیئے والا۔ ذکی الحس، فطرۃً رومان پسند لیکن عادتاً بزدل، کم ہمت اور خائف یہی وجہ تھی کہ ایک دن ایک غیر متعارف خاتون کے بنفشی رنگ کے معبر و معطر خط نے اس کے جسم میں لرزہ پیدا کر دیا۔ بے تکلف طرزِ خطابت اور غیر معمولی لگاؤ آمیز لہجہ نے اس کے ہوش و حواس مختل کر دیے۔ اس کی ۲۸ سالہ عمر میں یہ پہلا خط تھا جو کسی عورت نے اسے لکھا ہو۔ اور وہ بھی اس قسم کا!

جس وقت کالج کے چیر اسی نے یہ خط اسے دیا وہ درس و تدریس سے فراغت پانے کے بعد لائبریری میں بیٹھا تھا۔ خط پر سرسری نظر ڈالتے ہی اس کا سر جھکانے لگا۔ تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہ کالج کے پوشیدہ ترین گوشہ میں پہنچا۔ کئی سگریٹ ختم کرنے کے بعد وہ باطنیانہ اس خط کو پڑھ سکا۔ ایک بار دوبار۔ کئی ہزار بار بنفشی رنگ کے کاغذ پر لاجور و روشنائی سے بہترین خطا کی گئی تھی۔ اقبال جب خط پر نظر ڈالتا اسے ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی نازک اندام حسینہ لاجور و بنفشی رنگوں میں ملبوس عطریں ڈوبی، صاف و دلکش آوازیں اس سے یوں سرگرم اُختلا کرتی ہیں کہ محترم سحرانی!

سلام شوق! اپنی اس جرأت کی معافی چاہتے ہوئے میں ان خیالات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں جو آپ کی زندہ جاوید نظم "عنوان" حیاتی پریتم! "پڑھنے کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ میں "نوبہار" کی تدبیری خریدار ہوں، اور آپ کے افکار کا خاص طور سے مطالعہ کرتی ہوں

آپ کے نثر کے مضامین، مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے میری سمجھ سے باہر ہیں لیکن آپ کے اشعار مجھ پر جادو کا اثر کرتے ہیں خصوصاً آپ کی تازہ نظم ”خیالی پریم سے!“ نے تو مجھے نہ معلوم کہاں پہنچا دیا۔ شاید آکاشس پر دکنے ستاروں کے پاس !

باور کیجئے کہ آپ کی نیشلی نظم میں نے ہزاروں مرتبہ گائی اور ہر مرتبہ ایک نئی لذت حاصل کی ایک لفظ میرے دل میں پیوست ہو گیا۔ آپ کے اعلیٰ جذبات پر شمش کے لائق ہیں۔ لیکن ہزار افسوس کہ ان کی قدر کرنے والا کوئی نہیں۔ میری وارفتگی ملاحظہ ہو کہ جسطرح میں آپ کے پاکیزہ جذبات اور انوکھے خیالات کی دیوانی ہو رہی ہوں چاہتی ہوں کہ سب اسی طرح دیوانے ہو جائیں۔ کم از کم آپکے اشعار کا مطالعہ تو یہی ہوتا ہے مجھے فرض کر لیے دیجئے کہ آپ کی پیاری نظم کا ایک ایک لفظ آپ کی دلی کیفیات کا مرقع ہے اگر یہ سچ ہے تو میں حیران ہوں کہ آپ کو صرف شاعری سمجھوں یا پریم کا سب سے بڑا دیوتا ! جس کی موہن مرلی نے پریت کے سہانے گیت سنا کر مجھے عرصہ سے والد و شیرا بنا رکھا ہے میرا پر شوق دل آج اس حقیقت کا انکشاف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عرصہ سے میں آپ کو اپنا معبود خیال تصور کرتی ہوں۔ ساتھ ہی مجھے معاف کیجئے گا اگر میں یہ دریافت کروں کہ عشق کے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے گیت جو آپ سنا کر تے ہیں ان کا محرک کون ہے؟ سوز و گداز سے لبریز نغموں کے عقب مجھے ایک ایسا چاند نظر آتا ہے جس نے آپ کے جذبات میں تلاطم پیدا کر دیا ہے۔ کیوں؟ مجھے یہ سب

کچھ نہ کہنا چاہیے تھا۔ لیکن آپ کی لوحِ دل پر نقش ہو جانے والی نظم نے میرے پُر ارمان دل میں شوق کی چنگاریاں بھردیں اور میں مضبوط نہ کر سکی۔ خدا نہ کرے جو یہ چند سطور آپ کی ناگواری کا باعث ہوں۔

ہمیشہ آپ کی "....."

اقبال نے سینکڑوں مرتبہ لفافہ کو گھور گھور کر دیکھا۔ کیا یہ خط اسی کے نام ہے۔ "صحرائی صاحب معرفت ایڈیٹر" "نوبہار" کانپور" کو کاٹ کر ایڈیٹر نے اپنے قلم سے کالج کا پتہ لکھ دیا تھا۔ پھر بھی اسے کسی طرح یقین نہ آتا تھا۔ کاتب خط نے اپنا نام نہیں لکھا تھا بلکہ خط سے ہم سشتہ ایک لفافہ پر "سٹ معرفت پوسٹ ماسٹر صاحب لکھنو" لکھا ہوا تھا۔ لفافہ پر ٹکٹ بھی چسپاں تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فری جواب مطلوب ہے۔ گھر آئے پر اقبال نے خط کے مضمون کو بار بار اپنے دماغ میں دوہرایا۔ ہر ہر لفظ پر غور کیا۔ کئی گھنٹے تک اس کا دماغ لالہ زار رومانی وادیوں میں گشت کرتا رہا۔ لاجوردی اور بنفشی رنگ اس کی آنکھوں میں کھے ہوئے تھے۔ جوہی اور چمپا کی مخلوط مہک نے اس کے دماغ پر ایک نشیلی کیفیت طاری کر دی تھی۔ پر ارمان خوابوں کے جگمگاتے میں اسے ہر چیز زنجین نظر آئی تھی۔ ایک سراپا حسن ووشیزہ فوس قفرج کی مالا پہنے مشک و عینبر برساتی اس کے افق خیال پر نمودار ہوئی اور اس کے دل کی دنیا جگمگا اٹھی۔

"لیکن ممکن ہے یہ مذاق ہو" اقبال اس کے ساتھ ہی چونک پڑا۔ "قطعاً یہ صرف مذاق ہی ہو سکتا ہے کسی گدھے نے مجھے اپنا باپ بنانے کے لئے یہ جال بچھایا ہے۔ ہوں! تاکہ میں اس خط میں اپنا دل نکال کر رکھ دوں اور پھر وہ نالائق کلب میں میرے خط کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرے..... آہا ہا ہا

تم نے یہ خط دیکھا؟ قہ قہ قہ۔ پیاری حسینہ! عزیزانِ جان! از غیبی حور! ایاہا  
 ہا محبت ابدی محبت نہیں، عشق، جناتی عشق، چکور چاند، کلی اور بھونرا، شمع  
 اور پروانہ میں اور تم! قہ قہ قہ۔ کیا تم! پیاری تم۔ آہ! درد۔ محبت۔ دل۔ نغمہ  
 حسن عشق۔ کیف۔ سرور۔ حبت۔ دوزخ۔ ایاہا ہا۔ دیکھو، دیکھو۔ او ہو ہو ہو۔ عات  
 زار اقبال۔ پجاری اقبال۔ ہو قوت۔ گدہا۔ ایاہا ہا۔ . . . .

لیکن اس خط میں کچھ ایسی بات تھی کہ اقبال نے تہیہ کر ہی لیا کہ وہ اس  
 کا جواب ضرور دے گا۔ عمر بھر میں ایک تو موقعہ ایسا ملا تھا جس سے وہ اپنی روحانی  
 آرزوؤں کی کسی حد تک تکمیل کر سکتا۔ پھر ایسے زرین موقعہ کو احباب کے تمسخر  
 کے ڈر سے کھو بیٹھنا ہمیشہ کی محرومی کے مترادف تھا۔ اس لئے اس نے ہمت  
 کہہ لی اور کچھ نہ سہی کم از کم جھوٹ سیج تو معلوم ہو ہی جائے گا۔ چنانچہ کئی سگریٹ  
 پینے کے بعد وہ لکھنے بیٹھا رات گئے ۱۵، ورق کا ایک مسودہ تیار ہوا جس میں نظر  
 ثانی کے بعد تین صفحے اور بڑے مضمون کیا تھا؛ فلسفہ حیات، انسانی سرشت  
 ادب، دانش، اردو شاعری کا مستقبل، کساد بازاری، اقتصادیات، جہد لبقا  
 حکومت اور انقلاب مکمل سوراج بذریعہ بنادنت، ایک مکمل دستور اساسی کا  
 فقدان وغیرہ وغیرہ پر ایک ژولیدہ تبرہ اور آخری تین صفحوں میں آہ و بکا  
 درمیان پر زور اظہار عشق!!

توبہ! یہ میں کیا لکھ گیا۔ استغفر اللہ۔ معاذ اللہ۔ ماشاء اللہ۔ شہ شہ شہ!  
 ہزار نفر کے بعد اقبال نے اپنی گھنٹوں کی محنت کو نہر آتش کیا اور پھر  
 لکھنے بیٹھ گیا۔ صبح ہوئے ایک مسلم رائٹنگ پیڈ ضائع کرنے کے بعد یہ خط تیار  
 ہوا :-

”محترم خاتون!

آپ کا پاکیزہ خط ایسی حالت میں موصول ہوا جب کہ میں عرصہ سے صاحب فراموشی ہوں۔ مسلسل علالت نے ذول و دماغ کو ماؤنٹ کر رکھا ہے۔ اس زائل ہو چکے۔ زندگی کی کوئی امید باقی نہیں۔ ایسی حالت میں حیران ہوں کہ آپ کے عہدہ خط کا کیا جواب دوں۔

یہ کہنا سراسر الزام ہو گا کہ آپ نے میری تعریف میں حد درجہ غلو سے کام لیا۔ اس لئے کہ آپ کی تعریف نے فی الواقع مجھے معذور بنا دیا۔ البتہ انا کہہ دیئے میں کوئی ہرج نہیں کہ آپ نے جن بڑی بڑی صفات سے مجھے متصف کیا ہے وہ جائز نہیں بظاہر آپ کی مبالغہ آمیز توصیف پر صرف آپ کا بڑا ہوا حسن عقیدت ہے اور بس۔ بہر حال میں خوش ہوں کہ آپ میرے بیچ میرے افکار سے محفوظ ہوئی ہیں اور ان کی قدر کرتی ہیں۔ میں اپنی اس خوش قسمتی پر خفا بھی ناز کر دوں کہ ہے۔ ساتھ ہی اپنی اس محرومی کا گلہ بھی ہے کہ میں اپنی لائق قدر دان کے نام نامی سے بھی آگاہ نہ ہو سکا۔ بطور احتجاج میں بھی اپنا اصل نام نہ ظاہر کر دوں گا۔

میرے اشعار کے متعلق آپ کا استفسار یقیناً دلچسپ ہے جواب دیتے اس لئے ڈرتا ہوں کہ اس سے میری کمزوریوں کی غمازی ہوگی جس جذبہ کے ماتحت میرے اشعار موزوں ہوتے ہیں۔ اس سے میں خود بھی اچھی طرح واقف نہیں۔ ہا محرک والا تفسیر سوا اس کا اظہار اور اغماض دونوں میرے عیوب کو ظاہر کرینگے

اس لئے اپنی سلامتی اسی میں سمجھتا ہوں کہ چپ رہوں۔ آپ کے اشتیاق و اصرار پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔  
تو مہیندار کہ اس زمزمہ ساز سے ہمت  
گوش نزدیک لبم آ کر کہ آواز سے ہمت

میں ایک الم نصیب مایوس محبت ہوں اور بس۔ لیکن اللہ میری روح کے اس تار کو نہ چھوڑے گا۔ اس سے نشیلے گیتوں کی بجائے ایسے دل خراش نالے بلند ہوں گے جنہیں آپ کے طرب آشنائکان کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے۔ نہ کبھی آئندہ مجھے اس امر کے اظہار پر مجبور رکھے گا۔ یہ میری طبعیانہ درخواست ہے میں شرمندہ ہوں کہ اپنی علالت کے سبب فی الحال زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ امید کہ آپ معاف فرمائیں گی۔ آئندہ مجھے اس پتہ پر خط لکھے گا۔ بحرانی معرفت پوسٹ ماسٹر الہ آباد۔ آپ کی محبت بھری توصیف کا ہزار بار شکریہ۔ والسلام

آپ کا  
صحرائی

جس بے چینی سے سند باد جہازی اس وقت کا منتظر تھا جب کہ وہ نالائق تسمہ پائے نجات حاصل کر کے اپنے وطن واپس آجائے، اتنی ہی بے چینی سواقبال نامعلوم حسینہ کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی دماغی کیفیات اور ان ہوائی قلعوں پر تبصرہ کرنا جو وہ اب تک ہزاروں مرتبہ بگاڑ کر بنا چکا تھا، الف لیلیٰ کے دور ہلنے کے برابر ہے۔ ہفتہ میں پچیس ہزار مرتبہ اس نے ملازم کو ڈاک خانہ

بھجا اور پچاس ہزار مرتبہ اسے یلوس ہونا پڑا۔ ایک روشن صبح جب کہ وہ رات دیر تک جاگنے کے سبب سو رہا تھا اس کی نیند سے بھری چند ہی آنکھوں نے چونک کر نفشہ ولا جو رد کا خواب دیکھا۔ ملازم اس کے مرتعش ہاتھوں میں لفافہ دے کر چلتا ہوا۔ وہی خوب صورت خط! چمپا اور جوہی کی مخلوط خوشبو تھی اور نفشہ زار پر لا جو رد موتی بکھرے پڑے تھے۔ سگریٹ پیتے ہوئے وہ غسل خانہ میں گھس گیا اور یہ اطمینان کر کے کہ اب کوئی مغل نہ ہوگا اس لئے خط کو حفظ کرنا شروع کیا۔

”میرے دیوتا صحرائی!“

خط ملا۔۔۔ بہت سا شکریہ۔ آپ کی علالت کی خبر سن کر دلی صدمہ ہوا۔ خداجلد ہی صحت عطا کرے۔ میں ہمہ وقت دست بدعا ہوں میں نے دانستہ طور پر اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا اس لئے کہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ اب چونکہ آپ مصر میں اور لبطا ہر سہاری خط و کتابت کے جاری رہنے کے آثار بھی ہیں اس لئے ایک دوسرے کا نام معلوم ہونا ضروری رہا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اصلیت یہی رومان کا خون کر دیتی ہے۔ کیا اچھا ہو اگر آپ خود ہی میرے لئے کوئی نام تجویز کریں۔ ایسا نام جو از حد رومانی ہو اور آپ کو پسند بھی پڑے۔ میں آپ کو اپنے متعلق کچھ بھی نہ بتاؤں گی اور نہ آپ بتائیے یہ اس لئے کہ میں چاہتی ہوں کہ یہ پر لطف اور دلچسپ مذاق صرف مذاق ہی رہے اور کوئی اور صورت اختیار نہ کرے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ میں اس سہانے رومان میں بھیا نک اصلیت کے شائبہ کو بھی دخل دینا نہیں چاہتی ہم ایک دوسرے کے لئے صرف ایک

دلادینا سہارا ہی رہیں تو شاید اپنی اپنی زندگیوں کی ہمدردیوں اور  
تلفیہوں کی اپنے رومانی خوابوں کے ذریعہ ایک حد تک تلافی کر سکیں گے  
یقین ہے کہ آپ میری رائے سے اتفاق کریں گے۔

یہ معلوم کر کے رنج ہوا کہ آپ نے محبت کے عوض بابوسی مولیٰ  
لیکن آپ رنج و غم سے اس قدر دل برداشتہ کیوں ہیں۔ یہی تو اصل  
چیزیں ہیں روح کو جاننے والی۔ انسان کے اہل جوہر کو ابھارنے  
والی۔ شاعر کی آواز میں درد پیدا کرنے والی۔ اللہ تعالیٰ محبت کے عوض  
یہ چیزیں ہنگی ہیں۔ آپ کے اصرار نے کہ میں کبھی بھی اس کے متعلق  
آپ سے استفسار نہ کر دوں مجھ میں اور بھی اختیاق پیدا کر دیا۔ جی  
چاہتا ہے کہ آپ کی روداد محبت آپ ہی کی زبانی سنوں۔ لیکن  
مجبور ہوں۔

آج میری مسرت کا ٹھکانا نہیں کہ اس الوب شخصیت کا خط میرے  
پاس آیا جس نے عرصہ سے میرے خیالوں کی دنیا آباد کر رکھی تھی  
میں خوش ہوں بہت خوش! دنیا کی ہر چیز میرے مسرور نعموں سے  
ہم آہنگ ہے آج پریم دیوتا کے مقدس دربار میں مجھ حقیقہ داسی کو  
باریابی حاصل ہو گئی۔

اس ازلی پریمی نے جو روجوں میں گونجنے والے عشق کے اداس  
گیت گایا کرتا ہے مجھ پریم بھکارن کی آواز سن لی۔ میرا رمانوں  
سے بھر دلوں خوشی کے سمندر میں تیر رہا ہے میں کس قدر خوش  
نصیب ہوں۔ ادا۔۔۔

آپ میری غیر معمولی بے تکلفی کو معاف فرمائیں۔ میں ایک جانفزا

رومان کے لئے تڑپتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ آرزو اکل طریقے پر پوری ہوئی۔ اسی لئے میں اس رومان کی پر اسرار نوعیت سے ضرورت سے زیادہ متاثر ہوں۔

خدا کرے میں جلد ہی یہ سن لوں کہ آپ بالکل تندرست ہیں۔ زیہ  
محبت محبت محبت !

آپ کی — جو آپ کہیں “

عسل خانہ میں بند ہوئے اقبال کو کئی گھنٹے گزر گئے۔ لازم پریشان تھے کہ آخر ہوا کیا۔ جب نوبت کو اڑ توڑنے تک پہنچی تو حضرت مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے۔ اس دن کلج جاتا سر اسر حاق تھی۔ سارا دن اسی خط کے غار میں صرف ہوا۔ لیکن اب بھی اسے کسی ستم ظریف کی چاں کا گمان ہوتا رہا اور بار بار اس کے کانوں میں احباب کے تضحیک آمیز تہقے گونج گئے۔ لیکن اپنے دل کو ڈھارس دے وہ اس سمندر میں سر کے بل غوطہ لگا لے کا تہیہ کر چکا تھا۔ رات گئے حضرت نے کئی گھنٹے کی محنت کے بعد یہ خط لکھا :-

“شانتی !

تمہارا حیات افروز خط موصول ہوا۔ میں اپنی خوش نصیبی کا کچھ کچھ قائل ہو چلا ہوں۔ یقیناً جانا جس طرح تم اپنی بے رنگ زندگی سے تنگ آکر رومانی فضا کی متلاشی تھیں۔ اسی طرح میں بھی مسلسل سکون سے اکتا کر روج کو گد گد آنے والا اضطراب ڈھونڈتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم دونوں کی آرزو پوری ہوئی اور وہ بھی بقول تمہارے ”بطریقہ کمال“ میں نے تمہارا نام ”شانتی“ تجویز کیا ہے۔ جس کی کئی وجوہ ہیں ایک یہ کہ مجھے یہ نام پسند ہے۔ کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا۔ دوسرے یہ کہ

شانتی (سکون و آرام) دنیا والوں کو باوجود عقربہ و جہد و کجی نہیں مل سکتی اور میں بھی اپنے محبوب کو اپنے لئے "ناقابل حصول" سمجھتا ہوں صرف اس کا تصور ہی میری سست نبض میں زندگی کی لہر دوڑانے کے لئے کافی ہے۔ تیسرے یہ کہ ہندی شاعری میں اقدام محبت ہمیشہ عورت کی طرف سے ہوتا ہے اور موجودہ صورت میں بھی اقدام کا سہرا ہمارے ہی سر نظر آتا ہے۔ (یہ میں الزام نہیں کہتا) اس لئے یوں بھی میں ایک ہندی نام تجویز کرتا چوتھے یہ کہ تم نے اپنے آپ کو اب تک "سٹ" کی حیثیت سے ظاہر کیا جو شاید ہمارے نام کا اصل جزو ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ "سٹ" سے شروع ہونے والا نام... "شانتی" کیوں نہ ہو۔ غرض مجھے "شانتی" نام ہر طرح رومانی معلوم ہوا۔ اس کے تلفظ ہی سے شیرینی ٹپکتی ہے، تمہاری کیا رائے ہے؟ میں اگر تمہارے پاکیزہ مذاق اور شائستہ انداز تحریکی تعریف کہ دل تو اسے خوشامد پر محمول نہ کرنا۔ حق یہ ہے کہ میں تمہارے اعلیٰ مذاق اور پرستیدہ جذبات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ میری روداد محبت کے متعلق تمہارے لطیف کلمات مجھے بہت پسند آئے۔ اس داستان پارینہ کے دل خراش دفتر دوہرانے کی بجائے میں تجھ کو بہتر سمجھتا ہوں اس لئے کتنا اچھا ہوا کہ تم — یعنی ایک حسین خواب — میرے ارمانوں کا مرکز بن گئیں۔ میرے خون کا ہر قطرہ نئے سرے سے شراب ناب میں تبدیل ہو گیا۔ میرے دل کی ہر چیز از سر نو جگمگا اٹھی۔ آرزوؤں اور ارمانوں کے جامدوسن سمندر میں امید اور شوق کی سبک رو موجوں نے پھر ایک نرم تلامطم

برہا کر دیا۔ مکمل تابیغ میں ہر سیت کی جھللاتی شمع پھر نمودار ہوئی۔ پھر وہ  
حسرتیں جو ناکامی کے سوگوار دامن میں منہ چھپائے خدا معلوم کب  
سے بے حس پڑی تھیں۔ نئے سرے سے بیدار ہو گئیں اور میرا  
دل پھر کسی کے پریم بھجن گانے لگا۔

————— آہ! ہماری دنیا کتنی عجیب ہے۔ رنگین و دلا دینیکلا  
کی دنیا عالم اسباب کی سرحدوں سے کوسوں دور جہاں صرف میں  
اور تم ہیں اور وہ بھی جسمانی قیود سے آزاد، صرف تخیل کی صورت  
ہیں۔ ——— خدا کرے یہ حسین طلسم کبھی نہ ٹوٹے۔

اس خط میں تم دیکھو گی کہ میں نے آپ اور جناب کی ریاکاری کو توڑ  
کر زیادہ بے تکلف بننے کی کوشش کی ہے توقع ہے کہ تم بھی  
اسے پسند کر لو گی۔ میں اب اچھا ہوں۔ بالکل تندرست البتہ فرصت  
کم ہوتی ہے۔

باقی ————— باقی

تمہارا ————— صحرائی

شانتی نے یہ نام بہت پسند کیا۔ شانتی واقعی حد درجہ باکیف نام ہے میں  
اس نام سے منسوب ہو کر اپنے آپ میں ایک عجیب و غریب تبدیلی محسوس کرتا  
ہوں۔

اس کے بعد صحرائی اور شانتی کے خطوط نے عشق اور جنون کی صورت  
اختیار کر لی۔ اقبال کی ذہنیت پر اس پر اسرار رومان نے خاطر خواہ اثر کیا  
وہ اب عطریات کی کثیر مقدار استعمال کرنے لگا۔ گانا سیکھنے کی بھی کوشش  
کی ظاہری نمائش میں بھی ضرورت سے زیادہ ترقی کی۔ عام طور پر بشارش اور

جولان نظر آتا۔ لیکن تنہائی کا معمول سے زیادہ دلمہ پہلا اکثر اوقات تنہائی کی بکری میں گم رہتا۔ اور آپ ہی آپ عجیب عجیب حرکتیں کرتا۔ اس کے اشعار میں بھی اب اداسی۔ مایوسی۔ ناکامی کی چاشنی نہ رہی۔ بلکہ "تمنائے وصل" اور فراق کی کڑیوں کے ٹکڑے نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔

ہر چوتھے دن ایک خط آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ شانتی کے خطوط زیادہ پر زور اور غضب ناک ہوتے تھے۔ وہ ایک محفوظ و مامون فاصلہ پر بیٹھی اقبال کے ان احساسات سے کھیلا کرتی تھی جن کا بیدار ہو جانا خالی از خطر نہیں ہوتا اور خود بھی اپنے لطیف سے لطیف جذبے کو ظاہر کرنے سے ذرا نہ بھجکتی تھی تاہم قدر کہ بعض اوقات اقبال جیسے کم ہمت اور ڈرپوک انسان کو بھی پھر پر آجاتی اور اکثر اسے رنج ہوتا کہ کیوں نہ وہ ایک دوسرے سے لیں۔ اس کے خطوط میں بھی اب زیادہ زور اس بات پر ہوتا۔

..... میرے ارمانوں کی تنگی اب صرف تمہارے تنہائی سے سیراب نہیں ہو سکتی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں خیالی دھندلکے سے مکمل کر اب اپنا اصلی روپ ظاہر کر دیں۔ یقیناً جا بھہ میں اب ضبط کی طاقت نہیں۔ ان رومانی خوابوں سے اب مجھے بے چینی اور الجھن ہونے لگی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان لاج بھری نیشی آنکھوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں جن میں میرے لئے پریم کا دریا لہریں لے رہا ہے۔

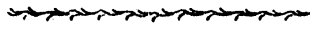
اس پاک دل کی تیز دھڑکن اپنے ماکوں سے سنوں جس میں میری لئے محبت کا سرچشمہ چھوٹ نکلا ہے۔ غرض یہ کہ میں تم سے ملنے کے لئے تڑپتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں کسی تمنا کی تکمیل چاہتا

ہوں۔ بلکہ اس لئے کہ ان رنگین بہاروں، کیف آ و کجی بن گشتاؤں پھولوں کی مست خوشبوؤں اور چندر ماں کی شفاف دودھیائی چاندنی میں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے لئے چند محسوس معنی پیدا ہو جائیں اور بس — شانتی تصور کہ وہ میں تمہارے حسین قدموں میں آنسوؤں کی سرگرم رو میں یہ درخواست کر رہا ہوں کیا تم مجھے تھکرا دو گی.....

لیکن شانتی اپنے رومانی سمندر میں غرق تھی اور رہنا چاہتی تھی۔ یقیناً اس کے دل میں بھی دلوں اور انگلیں پیدا ہوتی تھیں، شوق اور آرزوؤں کی گھٹائیں چھاتی تھیں لیکن اس میں "عمل" کی بہت نہ تھی۔ محبت، اسرار اور رومان کا تصور ہی اس کی معصوم نبض میں چنگاریاں بھردیتا تھا اور یہ کافی سے زیادہ تھا۔ اسی سے اس کے شوق کی تسکین ہو جاتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ دوستی کے عملی سامان قطعی ناممکن المصنوع ہیں۔ پھر عمل ناامیدی سے تو یہ لفظی اور خیالی رومان بہر حال بہتر تھا۔ چنانچہ اس نے لکھا :-

"..... نہیں عزیز ترین صحرائی! یہ ناممکن ہے ہمیں کبھی بھی ملنا چاہیے۔ ہمارا ایک دوسرے سے فنا اس سرور انجیز طلسم کی شکست کے برابر ہے۔ پھر کیا تم اسے پسند کر دو گے کہ "شانتی" تمہارے اعلیٰ تخیل کی پیاری اور رومانی تخلیق ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے۔ تمہاری شانتی مجھ سے ہزار درجہ افضل ہے۔ وہ ایک فردوسی ہستی ہے جو تمہارے خیالی مجلوں میں رہتی رہتی ہے تم مجھ سے مل سکتے ہو لیکن اپنی شانتی کو کبھی نہیں پاسکتے اور آہ! یہ آخری چیز ہوگی جسے میں کسی طرح بھی پسند کروں کہ تم مجھے شانتی کی بجائے کچھ

اور مجھ۔ میں تمہاری نظر میں ہمیشہ شانتی ہی رہنا چاہتی ہوں۔ اس  
لئے عزیز صحرائی حذا را اس خیال کو دل سے نکال دو.....“



ایک برس گزر گیا صحرائی اور شانتی کی جوشیلی خط و کتابت جاری رہی، اقبال  
نے پھر کبھی شانتی سے ملنے کی درخواست نہ کی، اس طرف سے وہ قریب قریب  
نامید ہو چکا تھا۔ لیکن ان کی رومانی محبت کا شجر ہر بار پھولتا پھلتا رہا اور کبھی صلیت  
کی بادِ موم نے اسے نہیں مر جھایا۔ بنفسہ ولا جور دی خطوط اب بھی اس پر وجدانی  
کیفیت طاری کر دیتے تھے، جوئی اور چپا کی مخلوط خوشبو اب بھی اس کے ماع  
پر نشی کیفیت طاری کر دیتی تھی۔ دقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ تاآنکہ اقبال کو  
اپنے معاشیات کے تنظیمی پروگرام کے سلسلے میں اچانک مشرقی بنگال جانا پڑا اور  
پھر وہاں سے جمبر لین انکوائری کمیٹی کے ساتھ بہار اور ارمیہ کا دورہ بھی کرتا تھا۔  
ہر چند اقبال کو یہ جدائی کسی طرح گوارا نہیں تھی..... لیکن کیسی  
طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ دورے کی حالت میں بھی یہ رومانی خط و کتابت جاری  
رہتی۔ چنانچہ اس نے شانتی کو لکھا :-

”عزیز شانتی !

اپنے دل پر پتھر رکھ کر آج میں تم کو کچھ عرصہ کے لئے ”خدا حافظ“  
کہتا ہوں مجھے ایک اہم کام کے سلسلے میں کافی عرصہ تک دورہ پر  
رہنا ہے اور اس دوران میں ہماری خط و کتابت کا جاری رہنا  
مشکل نظر آتا ہے تمہیں بھی یہ جدائی شاق گزرے گی لیکن میں جلد  
ہی نارغ ہو جاؤں گا اور ہم پھر ایک دوسرے کے صادق خیالات  
سے اپنے دلوں کو روشن کر لیں گے۔ وہ رومانی چنگاریاں جو عرصہ

سے ہمارے دلوں میں روشن تھیں وقت کے ہاتھوں کجلا چکی ہیں  
اس لئے یہ وقتی فراق یوں بھی تجدید کا کام دے گا اور ہماری محبت  
کے شعلے پھر بھڑک اٹھیں گے۔ الوداع !

خدا کرے تم ہر طرح خیریت سے رہو۔ میں جلد ہی تمہیں خط لکھوں گا  
اگر اس عرصہ میں مجھے تم کوئی پیغام پہنچا نا چاہو تو "سن رائزر" کے  
پرپرنس "کالم میں لکھ سکتی ہو۔ میں جہاں کہیں بھی ہوں گا عزوراً سے  
دیکھ لوں گا۔ ویسے تمہارا پیارا خیال ہر وقت میری روح کو گراتا رہے گا  
الوداع !! بہت سے x x x !! یہ چند سطور غفلت میں لکھ سکا

ہمیشہ  
تمہارا صحرائی "

ہر چند اقبال کچھ ایسا قریبی عزیز نہ تھا۔ لیکن یہ علی احمد صاحب کی وضع داری  
کے خلاف تھا کہ برسوں کے بعد تو اس سے ملنا ہوا اور اسے اپنے ہاں کچھ دن بہانہ  
رہنے پر مجبور نہ کریں۔ اقبال بھی اپنا دورہ ختم کر چکا تھا اور ابھی چھٹیاں بہت سی  
باقی تھیں۔ اس لئے اس نے علی احمد صاحب کا (جنہیں وہ چچا جان کہتا تھا،  
حکم ماننا پڑا۔ یوں بھی وہ ایڈیٹر "نوبہار" اور دیگر احباب کانپور سے تفصیلی  
ملاقات کا خواہاں تھا۔ چنانچہ اس نے علی احمد صاحب کے ہاں تین چار روز  
ٹھہرنے کا وعدہ کر ہی لیا۔

کھنؤ میں مسلسل آٹھ برس تک تعینات رہنے کے بعد علی احمد صاحب  
اسب حج کا حال ہی میں کانپور تبادلوں کا ہوا تھا۔ گو کانپور بھی ان کے لئے  
کوئی نئی جگہ نہ تھی لیکن کھنؤ جیسی صحرائیں یہاں کب نصیب ہوتی تھیں اپنے  
طویل قیام کے سبب وہ کھنؤ کے شریف تر حلقوں میں اس طرح گھل مل گئے

تھے کہ پردیس وطن سے بھی زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔ شفیق احباب سے آٹھ برس کا ساٹھ چھوٹے پر انھیں قلبی رنج ہوا۔ آنے کو وہ کان پور آگئے لیکن کھنڈوں میں دوبارہ جانے کی برابر کوشش کر رہے تھے۔ اسباب بھی سارا لکھنؤ ہی چھوڑ آئے تھے اس لئے کہ دو ایک مہینہ میں پھر انھیں لکھنؤ جانے کا یقین تھا۔

گو بے سرو سامانی تھی لیکن اقبال کی خاطر مدارات آسائش اور آسودگی میں انھوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ کوٹھی کا ایک وسیع و پربہ تکلف کمرہ اس کے لئے وقف کر دیا۔ جس میں ضرورت کی ہر چیز کے ساتھ تعیش کے سامان بڑے پیمانے پر مہیا تھے۔ تیسرے پہر کی چائے اقبال نے اپنے چچا جان کے ساتھ پی۔ معمولی گفت و شنید کے بعد وہ کچھ دوستوں سے ملنے کے لئے رخصت ہوا۔ علی احمد صاحب نے بار بار تاکید کیا "شام کو جلدی آنا تمہاری چچی اور بہن تم سے ملنے کی بہت مشتاق ہیں" چچی کے لفظ اور شخصیت میں جتنی جاذبیت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے لیکن "بہن" کا مسئلہ واقعی غور طلب تھا۔ اقبال چلتے پھرتے بیٹھتے اٹھتے اسی پر غور کرتا رہا بہن کا لفظ بار بار اس کے دماغ میں "جگنو" کی طرح چمکتا رہا۔ کبھی وہ ایک نفیسی منی انگوٹھا چوسنے والی بہن کا تصور کرتا اور کبھی ایک طویل و عریض عورت دو تین بچوں کو ساتھ لئے اس کے سامنے آکر "بہن" ہونے کا اعلان کرتی ان دو کے علاوہ اگر کوئی نقشہ اس کے ذہن میں آتا تو وہ صرف بنفسہ و لا جورد اور جوئی و چپا کے سردار انجیز مرکب کا ایک نورانی مجسمہ ہوتا تھا جو ان رعنا اور حسن مجسم۔ شباب کے تصور کے ساتھ بنفسہ و لا جورد کے دلکش خواب آپ ہی آپ اس کے ذہن میں آ جاتے تھے۔ دراصل اس کے تخیل کی معراج ہی یہ تھی۔

حذا خدا کر کے شام ہوئی اور وہ تیز قدموں سے علی احمد کی کوٹھی میں داخل

ہوا۔ سب سے پہلے اقبال کو جن صاحب سے متعارف کروایا گیا وہ محرم حیات کا نڈر ہے، ”ک“ کی جگہ ”ق“ بولنے والے مولوی شمس الدین صاحب تھے یہ مولوی صاحب جن کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہوگی چچی کے میٹکے کے ایک غریب اور مفلوک الحال رشتہ دار کے لوز نظر تھے۔ آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے اور چچا ان کے تمام اخراجات کے کیس تھے۔ ناز و روزے کے سختی سے پابند تھے۔ ڈار ہی رکھنے کا بھی ارمان تھا اسی وجہ سے سب انھیں مولوی صاحب کہتے تھے۔ خوشنویسی میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ گانے کے بھی شوقین تھے۔ لیکن زیادہ تر نعت و مناجات محکا پاکہ کرتے تھے۔ بی بی سحر بہت ڈرتے تھے۔ غرض ان کی بونچی شخصیت گھر والوں کے لئے ہمیشہ سامانِ دبستگی فراہم کرتی رہتی تھی۔ اپنی عجیب و غریب حرکاتوں سے سب کو ہنساتے رہتے تھے۔ بعض لوگ انھیں ”مولوی کھلونا“ بھی کہتے تھے منجملہ اور خوبیوں کے بڑا ہنریہ تھا کہ ان کی ”خوش مذاقی“ کی داد ان کے چانٹوں اور... گھونٹوں سے دی جاتی تو اور بھی خوش ہوتے دراصل اسی کو وہ اپنی ستر در دلی اور بہت افزائی سمجھتے تھے۔

چچی کو جیسا ہونا چاہیے تھا ویسی ہی تھیں۔ لچیم شمیم، خوب گوری، پان کی دلدادہ ہنس کھ، اچھے کپڑوں کی شوقین۔ ہزاروں دعاؤں کے ساتھ اقبال کا سلام لیا۔ اپنے پاس بٹھایا۔ پان دیا۔ اور پھر بے سرو پا گفتگو شروع ہوئی۔

”..... تم نے تو اشارۃً خوب قدر نکالا۔ پہلے جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تو تمہاری عمر مشکل سے دس برس کی ہوگی۔ تمہاری اماں میری بچپن کی سہیلی تھیں۔ خدا انھیں جنت نصیب کرے۔ لاکھوں میں ایک عورت انھیں ————— کب سے لاکہ ہو ————— کیا تنخواہ ملتی ہے

\_\_\_\_\_ ولایت کیوں نہیں چلے جاتے \_\_\_\_\_ شادی کب کر دو گے \_\_\_\_\_  
 \_\_\_\_\_ وغیرہ وغیرہ \_\_\_\_\_

اقبال ہر سوال کا سوچ سوچ کر جواب دے رہا تھا، لیکن اس کی آنکھیں  
 ”بہن“ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ بنفشہ ولا جو رد کے سیکڑوں مجھے اس کی نگاہوں  
 کے سامنے بن بن کر بگڑے۔ چپا دو جونی کی مست خوشبو اس کے دماغ میں بسی  
 ہوئی تھی۔ اچانک برابر والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ سرخ جارجٹ کی ایک  
 بجلی سی کوندی اور فوراً ہی ہلکے سرسئی پر دوں میں روپوش ہو گئی۔ چچی نے  
 ڈانٹ کر کہا۔ ”اے طلعت! آئی کیوں نہیں۔ اپنے بھائی اقبال سے ملو“ کچھ  
 پس و پیش کے بعد سرسئی پر دوں میں جنبش ہوئی۔ ایک شعلہ جوالہ ایک رنگین صاف  
 سبک رفتاری سے بڑھا اور اقبال کا دل حلق کے پاس دھڑکتا معلوم ہوا۔ بونا  
 سا قداسی نوذلی جوانی نے تناسب میں گدگداہٹ پیدا کر دی تھی۔ بھرے بھرے  
 صبح باز و آئینہ مثال کا فوری باہیں۔ خسا آلود شمع انگلیوں سے ساری کا پلو  
 بنگالے شریکس انداز میں چہرہ چھپائے، جھجکتی شرماتی، الجاتی ہوئی آنکھ بڑی  
 اور ایک قیامت خیز نچک کے ساتھ خالص مشرقی انداز میں اقبال کو آداب کیا۔  
 اقبال گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور اس کے دل نے چلا کر کہا ”شائستہ!“ لیکن  
 اس کے کانوں میں ”آداب“ کی بانسری جیسے نشیلے سراج بھی تک گونج...  
 رہے تھے۔ اس پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ جن بالذات ایک مسرت  
 ہے۔ اس کا دل بیوں چھل رہا تھا۔ چچی بولیں ”کل ہی ان کی دوسری میس پا  
 ہونے کی خبر آئی ہے“ طلعت دوسرے صوفے پر بیٹھ چکی تھی اور اقبال مجنونا  
 الحواس بنا ابھی تک کھڑا تھا۔ چچی کا فقرہ اس نے سنا ہی نہیں۔ بہت دیر بعد  
 چچی پھر بولیں ”بیٹھ جاؤ نامیاں اقبال کھڑے کیوں ہو“ اقبال گویا خواب سے

چونکا۔ معذرت کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔ لیکن اپنی حماقت پر دل ہی دل میں نامد  
تھا۔ کچھ دیر بعد مولانا کھلونے صاحب نے اعلان کیا کہ کھانا تیار ہے اور سب  
کے سب کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

دورانِ طعام میں مولوی شمس کے بیڈ ہنگے لطیفے سب کو ہنساتے ہے  
علی احمد صاحب ان کی کھوپری پر چمچے بجا رہے تھے اور وہ اور بھی خوش  
ہو ہو کر سب کی کسی حرکتیں کر رہے تھے۔ گو پر تکلف کھانوں کی افراط تھی اور اقبال  
کو اصولاً اس زمین موقع سے اپنی وسیع بساط بھر فائدہ اٹھانا چاہیے تھا لیکن  
اسے یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ وہ کھا گیا رہا ہے۔ کیف و سکر کی حالت میں وہ نہ  
معاذم کہاں کھویا ہوا سا تھا۔ اب اسے پیٹ بھر کے ”دیدار“ نصیب ہوا۔  
چاند سے مکھڑے پر حیات افروز بشارت۔ بڑی بڑی مد بھری آنکھوں میں رونما  
کی تجزیہ۔ کمان جیسے ہلائی ابرد۔ گھنی پلکوں کا حسین سایہ، نارنجی رخساروں  
پر پڑ رہا تھا۔ تیلی ستواں، ٹاک۔ ٹھوڑی کے قریب ایک جاں بخش سیاہ تل چھوٹا  
سادہ بانہ۔ پنکھڑی جیسے نازک لب جن سے مسٹھاس ٹپکی پڑتی تھی۔ خوشنما  
بتیسی پر موتی کی سی آب۔ بلوری گہرے دن میں موتیوں کی مالا جس کے وسط میں  
انگوری رنگ کا ایک بڑا سا موتی حلق کے نشیب (دگدگی) میں پڑا خفیف سی  
ہنسی کے ساتھ خضر خضر کر ایک عجیب عالم پیدا کر رہا تھا۔ اقبال برابر طلعت  
کی طرف دیکھتے جا رہا تھا۔ لیکن جب کبھی وہ اس کی طرف نگاہیں سے بھی  
نظر کرتی تو اس کے جسم میں کپکپی سی پیدا ہو جاتی ہوش زائل ہو جاتے۔ بدحواسی  
کے عالم میں کوئی بے ڈھنگی سی حرکت کر بیٹھا۔ مثلاً ایک مرتبہ کسی ایسے ہی موقع  
پر گھبراہٹ میں پوری نمک دانی فیرنی کی طشتری میں خالی کر لی جس پر چھپنے  
خوب مذاق اڑایا۔ مولوی شمس کے ہنگام آفریں تہقے کے عقب میں ایک

سر پٹنہسی اور سائی دمی جس سے اقبال کے رہے ہے وہ اس بھی جاتے ہے۔  
 خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا اور سب کے سب پائیں باغ کے چو ترے  
 پر جا بیٹھے۔ طلعت نے نفاست و نزاکت سے پان پیش کئے۔ اب  
 اقبال کی سرسبکی ذرا ذرا دور ہو چلی تھی۔ طلعت اس کے قریب ہی بیٹھی تھی  
 اس کا دل تڑپ تڑپ کر اس حسن کی دیوی پر نثار ہو جانا چاہتا تھا۔ بارہا اس  
 کا جی چاہا کہ اس مجسم شہاب کے قدموں میں گر پڑے لیکن اس خیال کے  
 آتے ہی اس کی روح کا نپ گئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نبضیں تیز  
 ہو گئیں۔ تنفس کی رفتار دوچند ہو گئی۔ اس نے دوسرا سر سیٹ سلگایا بولوی  
 قسمٹس بولے:-

”آپا! بھائی جان تو وہ نیار یقار ڈرناؤں۔ قیوں بھائی جان سنئے؟“  
 ”قطعی“ اقبال نے کھنکھار کر کہا۔ مولانا کو موفون لانے دوڑ پڑے  
 چچا اپنا حق اٹھا کر مردانہ میں پہنچے اور چچی نے اقبال کو ایک اور پان پیش  
 کیا۔ باجہ آیا اور طلعت نے عمدہ عمدہ ریکارڈ چھانٹ کر یکے بعد دیگرے  
 چڑھانے شروع کئے۔ ہر ریکارڈ کے ختم ہونے پر وہ اقبال سے دریافت  
 کرتی کہ ”کیوں بھائی جان! یہ کیسا رہا؟“ اقبال کے پاس صرف ایک  
 ہی جواب ہوتا کہ ”بہت خوب“ ایک دو دس بیس ریکارڈ سچ کئے اور اقبال  
 ہر ایک کے متعلق یہی کہتا رہا کہ ”نہایت عمدہ۔ بہت خوب“ طلعت نے  
 جل کر کہا ”معاف کیجئے گا بھائی جان مجھے اب تک آپ کی پسندیدگی و ناپسندیدگی  
 کا معیار نہ معلوم ہو سکا“ اقبال نے ہمت کر کے کہا ”وہی جو آپ کا ہے“  
 طلعت مسکادی اور اقبال اپنی کامیابی پر بہت خوش ہوا۔ غرض بارہ بجے  
 تک اسی قسم کی خوش گیمیاں ہوتی رہیں اور باجہ بختار ہا۔ اگرچہ اکتانہ جائیں تو

شاید طلعت ساری رات باجمہ بجاتی رہتی اور اقبال ساری رات بیٹھا سنتا رہتا رات گئے سوئے کی تیاریاں ہوئیں۔ طلعت نے اقبال کو آخری پان دیتے ہوئے کچھ اس رازدارانہ انداز میں "سب بخیر" کہا کہ اقبال ریشہ خطمی ہو گیا۔ دل حلق کے پاس دبہکتا معلوم ہوا۔ ہڑبڑا کر اس نے "وعلیکم السلام کہہ دیا۔ طلعت نے ایک ہلکا سا تقریٰی تہقہ لگایا اور وہاں سے چلی گئی۔

بستر پر دواز ہو کر اقبال نے حالات کی نزاکت پر غور کرنا شروع کیا عمر میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ ایک سراپا حسن دوشیزہ کا اس نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اس طرح گھل مل کر باتیں کیں ہوں۔ طلعت کی سحر کار مسکراہٹ اس کے دل پر گہرا اثر کر چکی تھی۔ چاند سے مکھڑے کی ہزاروں دلکش ادائیں دل میں کھب گئی تھیں۔ طلعت واقعی حسین تھی لیکن حسین تو معمولی سا لفظ ہے سب ہی عورتیں اپنی اپنی جگہ حسین ہوتی ہیں۔ طلعت میں کچھ باتیں ایسی تھیں جن سے اس میں امتیازی نشان پیدا ہو گئی تھی۔ غرض گھنٹوں انہی خیالات میں رہنے کے بعد اقبال پر یہ حقیقت روشن ہو گئی تھی کہ اگر وہ دو ایک دن یہاں اور رہا تو اسے طلعت سے ضرور عشق ہو جائے گا۔ ایسا عشق جو شاید اس کی موت پر ختم ہو اور یہ اقبال کے لئے ایک دردناک اور قابل غور چیز تھی رات بھر وہ طرح طرح کے سہانے خواب دیکھتا رہا۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ دھانی رنگ کی ساڑھی میں لپٹی ایک حور اس کی میز پر گلدان میں پھول چن رہی ہے اور ہلکے سروں میں کچھ گنگنا بھی رہی ہے۔ بہت دیر تک اقبال یہ منظر دیکھتا رہا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ اس دیوی کے سامنے سجدہ رہیز ہو کر عرض مدعا کرے۔ لیکن اس ارادے کے ساتھ ہی اس کا سر جکرا لے لگتا۔ جانکنی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اچانک دھانی رنگ کی ساڑھی تیزی سے بڑھی

اقبال نے خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد پھر گنگنا نے کی آواز ماری اور اقبال نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ طلعت انتہائی شغف کے ساتھ اس کی ٹوپی صاف کر رہی تھی۔ برش کی تیز حرکت کے ساتھ اس کے نازک آدیزے کانپ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر غضب کا بانچپن تھا اور ایک شیریں مسکراہٹ نے تو کچھ اور ہی عالم پیدا کر دیا تھا اقبال دلچسپی سے اس کی حرکت پر غور کر رہا تھا۔ ٹوپی کو سلیقے سے رکھنے کے بعد اس نے ٹائی کو پریس میں رکھا۔ بہت دیر تک بیچ کستی رہی اور گنگنا تھی رہی۔ اس مرتبہ اقبال نے ہمت کر ہی لی اور اپنی آواز کو سر بلا بنانے کی ناکامیاب کوشش کرتے ہوئے کہا ”طلعت!“

وہ ایک دم سے چونک پڑی۔ تیزی سے مڑی اور اپنے مخصوص تہقبے کے درمیان بولی۔ ”اوہو! تو آپ جاگ رہے ہیں۔ معاف کیجئے گا میں مغل ہوئی۔“

اور یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ چلتے وقت اس کی ساڑھی کا پلو اقبال کی طول طویل ناک پر پڑا اور اس کا دماغ معطر ہونے کے ساتھ ہی تحلیل ہو کر رہ گیا۔ وہ دروازہ سے نکلی ہی ہوگی کہ کامپٹی ہوئی آواز میں اقبال نے پھر آواز دی ”طلعت!“

”فرمائیے؟“ کہتی ہوئی طلعت پھر اس کے پلنگ کے قریب آگئی۔ اقبال کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ دماغ معطل ہو گیا۔ اسے کیا کہنا چاہیے؟ آخر کہنے کی بات ہی کونسی تھی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ طلعت مسکرا رہی تھی۔

”ذرا میری عینک دینا“ اقبال نے بغیر سوچے کہا۔

”آپ کی عینک۔ کہاں رکھی ہے؟“ طلعت نے متلاشی نظروں سے

ادبر اُدھر دیکھا۔

”جی؟“ اقبال نے غیر متقل لہجہ میں کہا۔

”ادبڑ۔ آپ کے سر ہانے ہی تو رکھی ہے۔“ اس نے ہلکے سے تہقہہ کے

ساتھ کہا۔

”اوہ معاف کرنا۔“ اقبال نے نادوم ہوتے ہوئے کہا اور عینک اٹھا کر

صاف کرنے لگا۔ طلعت دلچسپی سے اس کی حرکتوں کو دیکھتی رہی۔ اقبال نے

غیر معمولی احتیاط سے عینک لگانے کے بعد طلعت کی طرف دیکھا اور دونوں

خواہ مخواہ ہنس دئے۔ اقبال کے حواس کچھ کچھ ٹھکانے آئے۔ اس نے سلسلہ

جاری رکھنے کے لئے کہا ”ذرا میرا سگریٹ کیس دیجئے کہاں رکھا ہے اور آپ

بھی دیجئے گا۔“

”نہیں وہ بھی آپ کے سر ہانے ہی تو نہیں رکھا۔“ طلعت نے شوخی سے

کہا۔

”نہیں!“ اقبال نے احتیاطاً تکیہ کے نیچے ٹوٹے ہوئے کہا۔

”کیا آپ کو یقین ہے؟“ طلعت نے میز کی چیزوں کو ارٹ پلٹ

کرتے ہوئے پوچھا۔

”قطعی!“ اقبال نے اطمینان کے لہجہ میں کہا۔

نہ معلوم کہاں سے طلعت نے سگریٹ کیس ڈھونڈ نکالا اور اقبال کو ڈر

ہوئے کہا ”آپ چائے ہم لوگوں کے ساتھ پئیں گے یا میں یہیں بیحدوں؟“

”آپ کی رائے میں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟“ اقبال نے مستحضرانہ لہجہ میں

پوچھا۔

”مجھے سوچنے کا موقع دیجئے۔“ طلعت نے عجیب انداز میں اپنی حسین

چہرے پر بناوٹی فکر کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔

اقبال صرف سنہیں سکا۔

"ہاں! میری رائے میں آپ کو ہم لوگوں کے ساتھ ہی چار پیسے چاہئے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ دورانِ چار میں میری طرف بالکل نہ دیکھیں جیسا کہ آپ رات کے کھانے پر کرتے رہے تھے۔....." طلعت نے گرم دن مشکاکہ ریسی آنکھوں میں مسکاہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”شرط نامنظور کی جاتی ہے۔“ اقبال نے نہ معلوم کس طرح کہا۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ چار کے ساتھ کھلائیں گی کیا؟ میں فوراً ذہل ناشتہ کر نیکا عادی ہوں۔“

”ٹوس۔ کھن۔ انڈے اور۔ اور۔ اگر آپ چاہیں تو فورمہ، بریانی باقرحانی، پلاؤ، متغین، مرغی۔ اور۔ اور۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اوہ!“ بہت سا شکر ہے.....

”تو آپ جلدی تیار ہو کر آئیے۔“ اور یہ کہہ کر طلعت چلتی بنی۔  
غرض سہی نہم کی خوش فطریوں اور دلچسپیوں میں کئی دن گزر گئے اقبال  
اور طلعت کی بے تکلفیاں بڑھتی گئیں۔ اقبال کے دل میں طلعت کی محبت  
جاگزمین ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے تہیہ کر لیا کہ اگر طلعت اسے حاصل  
نہ ہوئی تو وہ خودکشی کر لے گا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ آیا طلعت کے دل میں بھی  
اس نے کوئی جگہ حاصل کی یا نہیں؟ ایک شام کو وہ منہ مٹھا تھا کہ کسی نے  
پچھے سے آکر آنکھیں بند کر لیں۔ انجلیوں کی ملائمت نے فوراً اغمازی کر دی لیکن  
اقبال نے کوئی مدافعت نہیں کی کبھی منٹ گزر گئے اور وہ اسی طرح بُت بسا  
بیٹھا رہا۔ بالآخر ایک حسین شخص نے طلعت کے ساتھ طلعت نے خود ہی ہار مان لی۔ اور

اقبال کے رد برو ہو بیٹھی۔ اقبال نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا :-  
 ”خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ آخر سعادت مند لڑکی ہو۔ لیکن سچ کہنا اس  
 وقت تمہیں اس شکست سے کنسار نہ ہو ؟“  
 طلعت نے ناک کو ماتھے پر چڑھا کر کچھ ایسی شکل بنائی کہ اقبال ہنسنے  
 لگے توٹ گیا۔ ”ذرا میز پر سے میری عینک دیجئے تاکہ میں ڈارون کی دادی  
 اماں کی شکل اچھی طرح دیکھ سکوں“ اقبال نے ہنسنے ہوئے کہا اور طلعت  
 بھی بے اختیار ہنس پڑی۔ آہ ! وہ موسیقی سے لبریز سنہی جو اقبال کی روح  
 کے ایک ایک تار میں گونج گئی۔

طلعت نے میز پر سے عینک اٹھا کر خود لگائی اور اقبال کے منہ میں سر  
 سگریٹ نکال کر ایک جھوٹا کیش لگاتے ہوئے کہا — ”تو میرے عزیز طالب  
 علمو! میں تمہیں اپنے مشرقی بنگال کے سفر حالات سناتا تھا۔ . . . .  
 ایک دم سے طلعت کو کھانسی اٹھی۔ سگریٹ کا دھواں اس کی ناک میں چڑھ  
 گیا۔“ اقبال نے جھپٹ کر پانی کا گلاس دیتے ہوئے عینک آ کر خود لگائی۔  
 اور نرمی سے کہا ”خدا کے لئے طلعت میری سونو۔ مجھے تم سے ایک نہایت  
 اہم معاملہ پر گفتگو کرنی ہے۔“  
 ”کیا دنیا میں کوئی بات بھی اہم ہو سکتی ہے؟“ طلعت نے گلاس میز پر  
 رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں! اور وہ میری محبت ہے“ اقبال نے جی کڑا کر کہا۔  
 ”ایا یا یا —“ طلعت نے ایک گونجدار قہقہہ لگایا۔ ”آپ کی  
 محبت !! یعنی چہ؟“

”سونو طلعت! میں تمہاری محبت میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔“ اقبال نے

غضب ناک اچھے میں کہا۔

”بالکل درست، مجھی آپ نے اپنی سات عدد دٹائیاں جلا دیں۔“ طلعت نے میز کی طرف اشارہ کیا جہاں سے دھوئیں کے بادل بلند ہو رہے تھے۔ اقبال دوڑ کر میز کے قریب پہنچا۔ اس نے طلعت کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر میز پر رکھ دیا تھا۔ وہ لڑھک کر ٹائیوں کے انبار میں جا پڑا اور آگ لگ گئی اقبال نے جلدی جلدی آگ بجھائی۔ طلعت کے نفرتی تہمتوں نے باجہ سا بجا رکھا تھا۔ اقبال بھی ہنستا رہا۔ اقبال نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ پھر طلعت کا ہاتھ پکڑ کر انتہائی سنجیدگی سے کہا:-

”سچ سچ بناؤ تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟“

”طلعت نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور کہا اتنی!“

اقبال و نور شوق میں طلعت کے کھلے ہوئے بازوؤں میں جا پڑا اور،  
 دماغی کے عالم میں اس کے شکریں لبوں پر اپنے خشک و مر تعش لب رکھ دئے  
 طلعت کے جسم میں ایک خفیف سی پکی پی پیدا ہوئی۔ آہ! وہ ایک پاک شہر تھی  
 جو پہلے بسہ پر ایک دوشیزہ کے جسم میں پیدا ہوئی تھی

محبت اسی وقت تک کیف و سرور کی حامل ہے جب تک کہ طالب و مطلقہ ایک دوسرے سے ملنے نہیں۔ کہاں یہ کہ وہ ازدواج کے سے فیض رشتہ میں جکڑ دئے جائیں۔ ساری شہریت تباہ و برباد ہو جاتی ہے اور محبت لازمی طور پر نفرت و حقارت میں تبدیل ہو جاتی ہے وجہ ظاہر ہے۔ مسلسل کیمیا کی کے سبب وہ ضرورت سے زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ پھر جوں جوں ایک دوسرے کے عیوب ظاہر ہونے لگتے ہیں ان کی وہ بے بیشمار و لا تعداد

تو قحط جو شادی سے پہلے ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئی تھیں ایک ایک کر کے فنا ہوئی جاتی ہیں۔ فی الحقیقت اگر ازدواج محبت کا میاب ہو جائے تو فطرت کے بہت سے قانون درہم برہم ہو جائیں۔

اقبال اور طلعت بھی کم و بیش نصف سال تک محبت کے جلد اثر جانے والے نشہ میں سرشار رہے۔ ساری دنیا انھیں عیش کا پیغام دیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ نئی ذیلی جوانیاں تھیں۔ انگلوں اور ولولوں کا ایک سیلاب تھا جن سے تشنہ کام دل سیراب ہوتے تھے۔ کائنات سے بے خبر وہ عشق و جنون کی رو میں بے غل و غش بہہ چلے جا رہے تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے بہت جلد سیراب ہو گئے۔ وقت کے ساتھ عشق کے بھوت کی آہی گرفت کمزور ہوتی گئی۔ اس "اجنبیت" کے دور ہونے کے بعد جو عشق کے لئے لازمی چیز ہے دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی قدر و منزلت کم ہوئی شروع ہوئی۔ انفرادیت مدغم ہونے لگی۔ شخصیتوں نے عمومیت اختیار کر لی۔ مسلسل مشاہدے نے ایک دوسرے کے عیوب ظاہر کرنے شروع کئے۔ پھر ستم پر ستم یہ کہ طلعت اب بھی اقبال کو اپنا جاں نثار عاشق تصور کرتی تھی اور ہر لمحے اقبال سے "خزان نیاز" حاصل کرنے کی دعوے دار نتیجہ یہ ہوا کہ ان فرائض میں جو بحیثیت بیوی کے عائد تھے کمی آنے لگی۔ اور ہر اقبال طلعت کو ایک نہ خرید لوٹدی سے زیادہ کچھ اور سمجھنے کے لئے تیار نہ تھا۔ کیسی محبت اور کہاں کا عشق یہ تو زن و شوہر کا خالص "کاروباری رشتہ" تھا۔ احساسات و جذبات کا یہاں کیا گندہ۔ ایک طرف حقوق تھے تو دوسری جانب فرض اور بس۔ جہاں ان دونوں میں سے کسی ایک میں بھی کوتاہی نہ تھی اور رشتہ معرض خطر میں یا انرض دونوں کے دلوں میں محبت کے نفوش تندر تاج میٹھ گئے اور نہ ہی جگہ

نفرت و حقارت نے اپنا سکہ جمایا۔ تا آنکہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اقبال ہمسہ وقت یہی محسوس کرتا کہ طلعت سے شادی کر کے وہ ایک ایسے گناہ کبیرہ کا مرتجب ہوا ہے جس کا کفارہ کسی طرح ممکن ہی نہیں اور طلعت بھی یہی سمجھتی کہ جس دن اقبال کے ساتھ اس کا سنجوگ قائم ہوا اسی دن اس کی قسمت پھوٹ گئی۔

ایک رات اقبال ذرا دیر سے گھر میں آیا۔ شاید کالچ میں کوئی ٹنگل وغیرہ تھی۔ گھر کی چار دیواری پر ایک غمناک اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن اقبال اس کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ لباس تبدیل کر رہا تھا کہ ”بچا“ طلعت کی محبوب بلی اس کی ٹانگوں میں آکر لیٹ گئی اور اپنی مسلسل ”خرخر خرخر“ سے اس کا استقبال کرنے لگی۔ اقبال کو بلیوں سے عموماً اور ریحانہ سے خصوصاً زلی نفرت تھی۔ چمکدار پوٹ کی ٹوبیس گھوڑوں کی طاقت سے ریحانہ کے سر پر پڑی اور وہ کئی فٹ کی بلندی پر اڑتی ہوئی ریحانہ کے گلے کا ہار ہو گئی ایک مہیب ججج کے ساتھ ریحانہ بوائے کھانے کی کشتی کو قالین پر اس نزاکت کے ساتھ پھینکا کہ سارا قالین چب چبک ہو گیا اور وہ خود اول فول بجتی ہوئی اپنی مالکن کے پاس پہنچی۔

”آپ آگئے۔ ہوں؟ طلعت بھری ہوئی شیرنی بنی کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔

تین ہزار مرتبہ سمجھا چکا ہوں کہ یہ کبخت بلی میرے کمرے میں نہ آنے پائے۔ آخر یہ کیا ———؟“ اقبال نے گرج کر کہا۔

میں بھی دولاکھ مرتبہ عرض کر چکی ہوں کہ ریحانہ میرے دم کے ساتھ ہے جب تک میں اس گھر .....

• اگر ایسا ہی ہے تو میں گھر بھی اس لئے چھوڑ دوں گا۔

کبھی بھی میں نے اسے اپنے کمرے میں پایا تو ————— تو ————  
 ”تو — کیا —؟“

”تو میں اسے حلال کر کے رکھ دوں گا۔“ اتنا کہنے اپنے بچہ میں خود بخود پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”اس سے پہلے آپ میرا گلا گھونٹ دیجئے“ طلعت نے قریب قریب روتے ہوئے کہا۔

”فضول مت کہو جی! تمہاری خواہ مخواہ ضد کی عادت ہو گئی ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ منحوس بلی اگر تمہیں غمزہ ہے تو اسے اپنے پاس رکھو میرے کمرے میں کیوں نحوست پھیلاتی ہے“

”آخر چالوڑ ہی تو ہے۔ میں . . . . .“

”جالوڑ والوڑ میں نہیں جاتا جی۔ ہاں! جالوڑ! پھر ایسے جالوڑ کو آخر پالا ہی کیوں جائے؟“

”افسوس! آپ کو مجھ سے بالکل محبت نہیں!“

”شے شے! پھر وہی بیوقوفی کی باتیں فرمیں! محبت کا کیا ذکر ہے؟“

”یہی کہ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہوئی تو آپ میرے ساتھ ہنسی رعایت

ضرور کرتے۔“

”رعایت کیا؟ یعنی یہ کہ تمہاری بلی کو گلے میں ڈھول کی طرح لٹکالوں

معاف کیجئے میں مجنوں تو ہوں نہیں جو بیٹے کے کتے کو چاٹتا پھروں۔“

”دنش تک خاموشی رہی۔ طلعت کا خون کھول رہا تھا۔

”اور یہ تو بتائیے! آج اتنی دیر تک کہاں رہے؟“ طلعت نے تعویذ

سیران بھیتے ہوئے کہا۔

”رہے جہاں ہمارا جی چاہا۔ تمہیں اس سے کیا؟“ اقبال نے ترشی سے

جواب دیا۔

”ہاں صاحب مجھے اس سے کیا! دو دو بجے رات تک بیٹھے سوکھتے رہو بھوکے مرد اور انعام یہ ملتا ہے کہ تمہیں اس سے کیا۔ ٹھیک ہے صاحب۔ کس گدھے نے کہا تھا کہ تم بھوکے مرو۔ مجھے ناہنجار کے لئے تم اتنی تکلیف کیوں گوارا کرتی ہو.....“

”لیکن آپ کسی طرح دیر سے آنا نہ چھوڑیں گے؟“

”کیسے چھوڑ دوں۔ میرے بس کی بات نہیں۔ اگر تم سے یہ کہوں کہ کام ہو جاتا ہے تو تمہیں یقین نہیں آتا۔ تم تو یہی سمجھتی ہو کہ میں ادھر ادھر سگڑے لگاتا پھرتا ہوں“

”کام ایک دن کا دو دن کا یہ روز کی دیر تو خالی از علت نہیں“

”کیا کہا؟ خالی از علت نہیں۔ ہاں ٹھیک تو ہے۔ علت ضرور ہے

اور تم اس علت سے بخوبی واقف ہو۔ کیوں؟“ اقبال نے ترش ہنسی کے ساتھ کہا۔

”میں کیا جانوں؟“

”میں بتاؤں؟ سنو! ایک عدد حسینہ! سمجھیں؟“ اقبال نے دلچسپی سے کہا۔

”وہ تو میں پہلے ہی سے جانتی تھی۔ آپ کے بتانے کی ضرورت نہیں۔“

”تو میری رائے میں تم بھی اپنے لئے ایک چاہیتا پیدا کر لو۔“ ”کس“ کیوں کروں۔ میری جوتی کو غرض پڑی ہے۔ یہ مشغلہ آپ ہی کو مبارک رہا! بوائے داغی ہوتے ہوئے ادب سے کہا۔ ”میاں! کھانا تو آپ

نے پھینک دیا۔ حکم ہو تو بازار سے منگادوں یا پھر کچھ جلدی جلدی پکاؤں۔  
 ”کھانا میں نے پھینک دیا؟ ہاں بڑی بی سچ کہتی ہو۔ اس گھناؤنی بل  
 سے میں ہی تو ڈنڈ گیا تھا۔ خداراتم جاؤ یہاں سے مجھے نہیں چاہیے کھانا دانا  
 جاکو“ اقبال نے ڈانٹ کر کہا اور رختیا بواکان دبا کے روانہ ہوئیں۔  
 ”تو یہ کہے کھانا بھی وہیں اپنی چائینتی کے ہاں کھا آئے۔ ٹھیک ہو۔“  
 طلعت نے کہا۔

”ہاں ایچم اتم سچ کہتی ہو۔ میری بہت سی چائیتیاں ہیں اور اب  
 میں روزانہ کے ساتھ کھانا کھایا کروں گا۔“

”آخر اس کٹ جھتی سے فائدہ؟“ طلعت نے تنگ آ کر کہا۔

”اتنا ہی خنسا تمہیں حاصل ہوتا ہے“ اقبال نے تیزی سے کہا۔

”میں پوچھتی ہوں کیا تم وہی آدمی ہو جو شادی سے پہلے مجھ پر حبان  
 چھڑکتے تھے؟“

اور میں بھی پوچھتا ہوں کیا تم وہی طلعت ہو جو تھوڑے دنوں پہلے میری  
 معمولی سی بات کو حکم سمجھ کر اس کی تعمیل کیا کرتی تھیں۔ میری آسائش و آسودگی  
 کا ہر طرح خیال رکھتی تھیں اور — اور . . . . .“  
 ”تو اب کیا میں آپ کی حکم عدولی کرتی ہوں۔ آپ کی آسائش و آسودگی  
 میں کوتاہی کرتی ہوں؟“

”بالکل نہیں۔ مجھے تمہاری وجہ سے بہت آرام ہے۔ ہر وقت میں سر  
 میں بوٹا رہتا ہوں۔ تم نے اور تمہاری بی بی نے میرے گھر کو گلزار بنا رکھا ہے  
 جس کی بواریخما باغبانی کرتی رہتی ہیں۔“ اقبال نے جما جاکر کہا۔  
 ”تو یہ ہے! آپ تو سیدھی سی بات پر لڑنے لگتے ہیں۔“

”ہاں عادت سے مجبور ہوں۔ تم تو کبھی لڑائی ہی نہیں۔ ہے نا۔ بڑی نیک۔ صلح جو۔ مرخجان و مرجع آدمی ہو۔“

”ہوں!“ اقبال کے جملے کے فقرے طلعت کے دل کے پار ہو رہے تھے۔

”بتائیے بتائیے۔ میں نے کب لڑائی نکالی۔“

”پر سوں زالی بات یاد کرو۔ کیا ہوا تھا؟“

”کیا ہوا تھا؟ یہی مانگہ آپ نے فخر کو سگریٹ نہ لانے پر نہ دو کو ب کیا اور میں نے اس غریب کی حمایت میں صرف اس قدر کہا کہ بیٹھک کی جھاڑ پونچھ میں سارا دن گزار دیا۔ رات کو یاد نہ رہا۔“

”اچھا۔ پچھلے ہفتے کیا ہوا تھا۔ اس دن بھی لڑائی میں نے ہی نکالی تھی نا؟“

”کس دن؟ کب؟؟“

”جس دن بوارجیما جا رہی تھیں اور تم نے ان کے بدلے مجھ پر صلواتوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ میرا کیا قصور تھا۔ صرف اتنا کہ بوارجیما سے اپنی پسند کا ایک نیا کھانا پکوانا چاہتا تھا اور اس بوڑھی چڑیل نے میری حکم عدولی کی۔ کیا میں اسے نہ ڈانٹتا؟ آخر تو کہہ میں۔ ہر جیسے گئے گا گجراتنخواہ کا دیتا ہوں کیا اتنا بھی حق نہیں کہ قصور کرنے پر سخت سست کہہ سکوں۔۔۔۔۔۔“

”تو میں نے کیا کہا تھا۔ کونسی لڑائی نکالی تھی۔ یہی تو کہا تھا کہ نوکروں سے نوکر دس کا سا بڑا نوکرنا چاہیے پہلے تو ہنسی مذاق سے آپ نے ان کو سر پر چڑھا لیا اور پھر یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ آپ کے اشاروں پر جان دے۔ یہ سب کچھ لے آنا وہ ہو جائیں۔ میں مانتی ہوں نوکر دس کو ڈانٹنا ضرور چاہیے لیکن جاو بجا نہیں۔ اس دن رجیما نے انصاف سے دیکھے تو کوئی قصور نہیں کیا

تھا۔ پھر آپ جو حق ناحق اس کے لئے ڈھانپیں گے تو وہ آخر کوئی زرخیز پودہ نہیں جو جو تیاں کھائے اور آپ کے ٹکڑوں پر پڑی رہے۔ پھر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ گھس لگانے کو کوئی ماما نہیں ملتی اور جو ملتی ہے وہ کوڑی۔ کام کی نہ کلج کی اور منہ مانگی تنخواہ۔ رچیا جیسی محنتی ایمان دار اور نرم زبان ماما میں کہاں ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے میں اس کی معمول سے زیادہ خاطر رکھتی ہوں۔ ہاں اگر آپ کو یہ منظور ہے کہ میں دونوں وقت چولھے میں اپنا منہ جھلسوں تو بسم اللہ! آج ہی ہاتھ پکڑ کر نکال باہر کیجئے۔ میری کونسی ایسی وہ کوئی عزت ہے۔

”خدا کا شکر تمہارا لکچر تو ختم ہوا۔ لیکن ایک رچیا ہی پر کیا موقوف ہے۔ تم ہمیشہ میرے مقابلے میں لڑ کر دوس کی طرف داری کرتی ہو۔ جہاں میں کسی لڑکے کو دانٹا اور تم نے اس کی حمایت لی۔“

”غرض میں عیبی ہوں۔ وہ تو ہر طرح مجھ پر ہی آپ کی چھری تیز رہتی ہے، طلعت نے رونجھے پن سے جواب دیا۔

”نہیں یگم! تم تو سزا پاؤ بی ہو عیب تو پاؤ بیوں شرعی مجھ میں ہیں۔“

”آخر یہ بحث کب تک جاری رہے گی؟“ طلعت نے جڑ بڑھوتے ہوئے پوچھا۔

”جب تک تمہارا جی چاہے۔“ اقبال نے اطمینان سے کہا۔

”تو ختم کر واس نصیبہ کو۔“

”بسم اللہ میں نے شروع کب . . . . .“

”تو گو یا میں نے ابتدائی کی مٹی؟“ طلعت نے از سر نو سلگتے ہوئے کہا۔

”اور نہیں تو کیا میں نے کی مٹی؟ ٹھیک ہے۔ میں ہی تو صلواتیں سناتے تمہارے کمرے میں گیا تھا۔“

”توبہ یا اللہ! کیسا میرا دم ضیق میں ہے۔“

”اور میں بہت خوش ہوں۔ تمہاری شکل دیکھتے ہی میرا دل باغِ بلبل بن جاتا ہے۔ تم ہر طرح میری خوشی اور خوشنودی کے اسباب بنیائے رہتی ہو۔“

”اور آپ بھی میری آسودگی کا بہت خیال رکھتے ہیں —“ منے صبا ایک دفعہ اس قضیہ کو طے کر لیجے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نالائق ہوں اور کسی طرح آپ جیسے نفیس الطبع انسان کی بیوی بننے کی اہل نہیں ہوں تو مجھے طلب دیدیجئے اور پھر اپنی اسی چاہتی کو لے آئیے جس کے ہاں آپ راتوں کو رہتے ہیں۔“

”تمہیں معلوم ہے تم نے اکابا سانس میں کتنی باتیں کہہ ڈالیں۔ خیر میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ سنے سنے عادی ہو گیا ہوں۔ اب خدا راجھہ غریب پر رحم کیجئے اور اپنی اس کو اس کو ختم کیجئے۔ میں خود ہی جان سے عاری ہو چکا ہوں۔ غضب خدا کا دو گھنٹے گزر گئے اور یہ کٹ جتنی کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی جب سے گھر میں قدم رکھا ہے ایک آفت برپا ہے۔ آخر میں کب تک آجکی گالیاں سنے جاؤں اور کیوں؟ میں تنگ.....“

”یہ الٹی ہوئی گالیاں آپ دیتے ہیں یا میں؟“

”خیر! میں ہی دیتا ہوں۔ لیکن لکھنا آپ تشریف لے جائیے۔ کرم کیجئے“

طلعت ایک تند و تیز اونٹنہ! "کے ساتھ بڑ بڑاتی ہوئی روانہ ہوئی اور اقبال نے جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

آج کوئی نئی بات نہ تھی۔ قریب قریب روز کا یہی پروگرام رہتا تھا۔ حالات

اتنی خطرناک صورت اختیار نہ کرتے اگر دونوں ذرا سے ایشارے کام لے لیتے لیکن ایشارے تو کجا وہاں تو "احساس" کا بھی پتہ نہ تھا دونوں ایک دوسرے کے عیوب پر نظر رکھتے۔ ذرا ذرا سی بات کی پرچول رہتی۔ بات بات پر مین میخ نکال جاتی، اور پھر غضب یہ تھا کہ اقبال کے سر پر "رومان" کا بھوت سوار تھا "شانتی" کا تصور ہر وقت پیش نظر رہتا۔ طلعت کی ہر کوتاہی پر اس کا دل خون کے آنسو روتا اور فوراً اسے "شانتی" کا خیال آتا۔ بنفشہ دلا جوہر کا ایک لورانی مجھ جونی اور چمپا کے ہار پہننے اس کے پیش نظر ہوتا۔ جس کی حیات افروز مسکراہٹ اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی۔ اس قسم کی لڑائیوں کے بعد وہ خاص طور پر پوشیدہ دراز میں سے "شانتی" کے خط نکال کر پڑھا کرتا تھا۔ چنانچہ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا اور کئی گھنٹے تک وہ بنفشہ دلا جوہر کے سمندر میں غرق رہا "شانتی" کتنی فرشتہ خصلت لڑکی تھی وہ سر اپا محبت تھی۔ آہ وہ اپنے صحرائی کی کتنی قدر کرتی تھی۔ اس کے صادق و خوشگوا خیالات ہمیشہ اس کے لئے پیام راحت و سکون لاتے تھے۔ بھینی خوشبو والے نبشتی خط اس کے لئے کتنے معانی رکھتے تھے۔ آہ! رومان کی وہ فردوس سی دایاں جہاں ان دونوں کے پاک دل مصروف گلگشت تھے۔ کتنا خوش آئند تھا وہ زمانہ جب کہ وہ دونوں اپنے سینوں میں محبت کی آگ چھپا پئے پہروں ایک دوسرے کے تصور میں غرق رہتے تھے "اپنے صحرائی کی شانتی"۔۔۔۔۔ اپنی شانتی کا صحرائی "۔۔۔۔۔! وہ ایک ایک خط کو کئی کئی دفع پڑھ رہا تھا۔ یاس و ناامیدی کی غناک گھٹائی اس پر چھا رہی تھیں شانتی! پیاری شانتی کے خطوط محبت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ کتنے بچے دل سے اس کی قدر کرتی تھی۔ کتنے پاکیزہ ذوق کی مالک تھی اور ساتھ ہی

کس قدر رومان پسند :-

”..... میں نے آپ کی ایک پرانی نظم دیکھی ” جیون کا مڑ  
سوپن “ آہ ! نہ پوچھے کہ مجھ پر کیا گذر گئی ۔ سچ کہے ! کیا واقعی  
آپ اسی نامہنجاہ دنیا کے باشندے ہیں یا آکا ش پر رہنے  
بنے والا کوئی سندر دیوتا ہے جو اپنی مومن مرلی سے عشق کے  
سہاؤ نے گیت سنا سنا کر ساری دنیا کو سکون و راحت کا پیام  
سنا رہا ہے ۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ آپ  
بھی میری طرح گوشت و پوست والے انسان ہیں ، بہر کیف  
میرے لئے تو آپ انسان نہیں بلکہ ایک ایک ایسی فردوس  
ہستی ہے جو میرے خوابوں کے محل میں رہتی ہے اور جس کے  
تصور سے میں نے اپنے من کی دنیا اجاگر کر لی ہے ۔ سنائیے  
پریت کی آسودوں سے بھری کہانی ۔ سنائیے ! عشق کا کبھی نہ بھولے  
والی داستانیں ۔ میں ان پریمی آنکھوں کی سرگزشت سنا چاہتی  
ہوں جنہوں نے کبھی محبوب کا جلوہ نہ دیکھا ۔ اس دل کی دھڑکن

سنا چاہتی ہوں جسے محبوب نے ”ھکا“ دیا.....“

کئی گھنٹے گذر گئے اور وہ شاعری کے محبت بھرے خطوط میں غرق رہا ۔

آہ ! اس نے شاعری کی قدر نہ کی ۔ کیوں اس نے سلسلہ مراسلت نہ کیا ۔ کتنی  
مخوس تھی وہ گھر دی جب کہ شاعری کی جگہ طلعت سننے اس کے دل میں جگہ پائی  
وہ اطلعت تو شاعری کی پیزار کے برابر بھی نہیں ۔ لیکن نہ معلوم شاعری اب  
کہاں ہے وہ ”سٹ“ معرفت پورٹ ماسٹر لکھنؤ کو ایک دو نہیں بیسیوں خط  
لکھ چکا تھا لیکن کوئی جواب نہیں آیا ۔ کیا وہ آسانی ہستی ہمیشہ کے لئے سو گئی

نہیں اس کا دل کبھی اس کے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن پھر خطوں کا جواب کیوں نہیں آتا۔ ممکن ہے وہ ہندوستان کے کسی اور گوشہ میں چلی گئی ہو۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کا دل غم کے اتھاہ غار میں ڈوب جاتا۔ شانتی اس کے نزدیک مچکی تھی۔ زندگی بھر وہ اس کے متعلق کچھ نہ معلوم کر سکے گا۔ لیکن یہ خط۔ یہ کبھی نہ فضا ہونے والے نقوشِ محبت ہمیشہ اس کی یاد تازہ کرتے رہیں گے۔ اس نے ان خطوں کو کئی بار چوما اور پھر احتیاط کے دراز میں بند کر دیا۔

ایک سہانی صبح طلعت نے برآمدے میں ناشتہ کا انتظام کیا کچھ دن سے مولوی شمس صاحب بطور مہمان آئے ہوئے تھے طلعت ان کی خاطر دیر راستہ میں نمایاں حصے رہی تھی۔ اقبال ایک لحاظ سے مولوی شمس کا محنون تھا کہ ان کے آجائے سے گھر میں ذرا امن ہو گیا تھا دوسرے یہ کہ ان کے طفیل میں اس کی بھی ابھی خاطر بد رہی تھی۔

اقبال "سن رائز" کو ادھر ادھر سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر "پرنسپل کالم" پر پڑی اور وہ کرسی سے دو فٹ اونچا اچھل گیا۔ چار کی میز گرتے گرتے پکھی۔ بے انتہا چنبھے بیٹے انتہا خوشی اور بے انتہا حیرت نے بہ یک۔ وقت اس کے دماغ پر دھاوا بول دیا۔ ایک نمایاں جگہ پر خالص علی حروف میں یہ پیام درخشا۔

"شانتی بنام صحرائی" ————— "تم کہاں ہو؟"

دوست! ایک اقبال کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم کا تمام خون سمجھ کر دل میں جمع ہو گیا اور پھر ایک سیلابی کیفیت کے ساتھ اس کی سست نبضوں میں دوڑ گیا۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ حواس آہستہ آہستہ اوٹ ہو کر تھے

کس قدر رومان پسند :-

”..... میں نے آپ کی ایک پرانی نظم دیکھی ” جیون کا مڑ  
سوپن “ آہ ! نہ پوچھے کہ مجھ پر کیا گزر گئی ۔ سچ کہئے ! کیا واقعی  
آپ اسی نامہنجاہ دنیا کے باشندے ہیں یا آکا ش پر رہنے  
بنے والا کوئی سندر دیوتا ہے جو اپنی مومن مرلی سے عشق کے  
سہاوانے گیت سنا سنا کر ساری دنیا کو سکون و راحت کا پیام  
سنا رہا ہے ۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ آپ  
بھی میری طرح گونشت و پوست والے انسان میں بہر کیف  
میرے لئے تو آپ انسان نہیں بلکہ ایک ایک ایسی فرد و سس  
تہستی ہے جو میرے خوابوں کے محل میں رہتی ہے اور جس کے  
تصور سے میں نے اپنے من کی دنیا اجاگر کر لی ہے ۔ سنائیے  
پریت کی آسودوں سے بھری کہانی ۔ سنائیے ! عشق کو کبھی نہ بھولے  
والی داستانیں ۔ میں ان پریمی آنکھوں کی سرگزشت سنا چاہتی  
ہوں جنہوں نے کبھی محبوب کا جلوہ نہ دیکھا ۔ اس دل کی دھڑکن  
سنا چاہتی ہوں جسے محبوب نے ہکا دیا.....“

کئی گھنٹے گزر گئے اور وہ شائنتی کے محبت بھرے خطوط میں غرق رہا ۔  
آہ ! اس نے شائنتی کی قدر نہ کی ۔ کیوں اس نے سلسلہ مراسلت نہ کیا ۔ کتنی  
مخصوص نئی وہ گھر دی جب کہ شائنتی کی جگہ طلعت نے اس کے دل میں جگہ پائی  
وہ اطلعت تو شائنتی کی پیرازہ کے برابر بھی نہیں ۔ لیکن نہ معلوم شائنتی اب  
کہاں ہے وہ ” سٹ “ معرفت پوسٹ ماسٹر لکھنؤ کو ایک دو نہیں بیسیوں خط  
لکھ چکا تھا لیکن کوئی جواب نہیں آیا ۔ کیا وہ آسمانی ہستی ہمیشہ کے لئے سو گئی

نہیں اس کا دل کبھی اس کے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن پھر خطوں کا جواب کیوں نہیں آتا۔ ممکن ہے وہ ہندوستان کے کسی اور گوشہ میں چلی گئی ہو۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کا دل غم کے اتھاہ غار میں ڈوب جاتا۔ شانتی اس کے نزدیک مچکی تھی۔ زندگی بھر وہ اس کے متعلق کچھ نہ معلوم کر سکے گا۔ لیکن یہ خط۔ یہ کبھی نہ فضا ہونے والے نقوشِ محبت ہمیشہ اس کی یاد تازہ کرتے رہیں گے۔ اس نے ان خطوں کو کئی بار چوما اور پھر احتیاط سے دراز میں بند کر دیا۔

ایک سہانی صبح طلعت نے برآمدے میں ناشتہ کا انتظام کیا کچھ دن سے مولوی محمد صاحب بطور نہان آئے ہوئے تھے طلعت ان کی خاطر دیر رات میں نمایاں حصے رہی تھی۔ اقبال ایک لحاظ سے مولوی شمس کا محنون تھا کہ ان کے آجائے سے گھر میں ذرا امن ہو گیا تھا، دوسرے یہ کہ ان کے طفیل میں اس کی بھی ابھی خاطر ہو رہی تھی۔

اقبال "سن رائز" کو ادھر ادھر سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر "پرنسپل کالم" پر پڑی اور وہ کرسی سے دو فٹ اوجھا اچھل گیا۔ چار کی میز گرتے گرتے پچی۔ بے انتہا اچنبھے بیہ انتہا خوشی اور بے انتہا حیرت نے بہ یک۔ وقت اس کے دماغ پر دھاوا بول دیا۔ ایک نمایاں جگہ پر خالص علی حروف میں یہ پیام درخشا۔

"شانتی بنام صحرائی" — "تم کہاں ہو؟"

دوستِ تک! اقبال کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم کا تمام خون سمجھ کر دل میں جمع ہو گیا اور پھر ایک سیلابی کیفیت کے ساتھ اس کی سست نبضوں میں دوڑ گیا۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ حسِ آہستہ آہستہ ماؤں ہو کر تھے

کہ ایک دم سے اس کی نظریں طلعت کی فونخوار آنکھوں سے چار ہوئیں۔ اخبار اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور پھر وہ بادل ناخواب ستہ ناشتہ کی طرف مائل ہوا۔ جلدی جلدی چاء کی پیالی چڑھائی اور مولوی شمس سے معذرت کر کے اخبار اٹھاتا ہوا وہ روانہ ہوا۔

صاف سٹھری سڑک پر موٹر س کار برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی اور قابل کو ساری دنیا چکراتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے دماغ پر فالج کا سا اثر تھا۔ دنیا دانیہا سے بے خبر وہ اپنے دل کی دھڑکن صاف طور سے سن رہا تھا۔

”شانتی صحرائی — صحرائی شانتی!“

یہ ایک موٹر ریک اور اتالیق کے حواس مجتمع ہوئے۔ وہ تیز قدموں سے ڈاک خانہ میں داخل ہوا اور فوراً ہی ”سن رائز“ کے پرسنل کالم کے لئے ایک پیام بذریعہ تار روانہ کیا۔ بعد کا وقت کس طرح گزرا یہ بیان کرنے کے لائق نہیں سارے دن شانتی کا تصور اس کے دماغ میں گونجنے لگا۔ ہر وقت دہر لفظ برفستہ و ناجور دکا مجسمہ اس کے پیش نظر ہوتا۔ رات بھر اسے نیند نہ آئی۔

دوسرے دن علی الصبح اس نے سن رائز کے ”پرسنل کالم“ کو اپنی ناک کے قریب لاکر اپنا پیام پڑھا۔

”الم نصیب صحرائی کی طرف سے محبت کی دیدی شانتی کی خدمت میں“ ہدیہ الفت

”میں زندہ ہوں لیکن قریب امگ۔ جلد خبر لو۔ پتہ دیں“

دوسرے ہی دن سے اس نے پوسٹ آفس کے چکر لگانے شروع کر دیے

صبح سے شام تک کم از کم بیس پھرے ہو جاتے۔ بالآخر ایک دن جب کہ وہ بالکل مایوس ہو جانے والا تھا کہ کونے اس کے لرزے ہوئے ہاتھوں میں ایک بنفشی لٹافہ دیا اقبال کو ایسا معلوم ہوا گویا مدت کا کھویا ہوا خزانہ اسے اچانک مل گیا۔ وہی خط تھا! چہا اور چوئی کی مخلوط خوشبو میں بسا ہوا۔ بنفشی کا غدر لا جوڑ رشتہ نامی میں بہترین کتابت! اقبال کا سر جھکانے لگا۔ وہ سمجھا یہ زندگی کی آخری کش کش ہے وہ تیزی سے قریب کے ایک ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔ اور ایک کونے میں بیٹھ کر متعدد سگریٹ پینے کے بعد اس نے خط پڑھنا شروع کیا :-

”شام مراری کے چروٹوں کو پرنام!

آج میں کس قدر خوش ہوں — بے انتہا مسرور — کہ اپنی کلپتی ہوئی آتما کی زندہ گیس پکار کو پھر سہرہ دکاؤں تک پہنچانے کا موقع ملا — اس انوپہستی کو آج میں نے پھر پالیا۔ جو میرے لئے سب کچھ تھی۔ جسے میں نے عرصہ ہوا فراق کے گھٹا توپ میں کھودیا تھا۔ آہ! آج آکاش کے سارے دیوتا بچھڑے ہوئے دلوں کے ملاپ پر نشیے گیت گارہے ہیں :-

”پریم نے من کی لنگا جمننا کو — سکھ سنگم پہ ملایا!“

سچ کہئے اس منحوس بروگ کے ختم ہو جانے سے آپ کو کس قدر خوشی ہوئی؟ میں تو قریب قریب دیوانی ہو رہی ہوں۔ میں کوستی ہوں اس منحوس گھڑی کو جب کہ ہماری خط و کتابت منہ ہوئی۔ لیکن خیر۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ ہم جو ایک دوسرے کو مردہ سمجھتے تھے پھرتے۔

جو جو انقلابات مجھ پر ہو گزرے انھیں قلمبند کرنے کے لئے دفتر درکار  
میں مختصر یہ کہ — یہ سن کر شاید آپ مجھ سے نفرت کرنے لگیں  
کہ میری شادی ہو گئی۔ لیکن پھر یہی ہے۔ آپ کے جوشیلے گیتوں نے  
مجھے اس حد تک وحشی کر دیا تھا کہ آہ! میں ایک نامعقول درندہ سر  
محبت کر بیٹھی۔ اسی جرم کی پاداش میں مجھے ہمیشہ کے لئے اس بن  
مانس کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ شادی کے تھوڑے ہی عرصے  
بعد مجھ پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ محبت کا طمس چلا  
چرا ہو گیا۔ پھر وہ ارمان میرے دل کی حسرت سامنیوں میں  
غلیل ہو کر رہ گئے۔ وہ نذر مجھے بات بات پر کانٹے کو دوڑتا  
ہے۔ آہ! کہاں تک لکھوں۔ ایک مسلسل عذاب ہے بھصبت  
کی کہانی پھر کبھی سناؤں گی۔ برسوں کے بعد آج مجھے خوشی نصیب  
ہوئی اسے بھی دکھ کی داستان دوہرا کر کیوں ضائع کر دوں۔ مجھے  
آج دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔ رومانی آگ جو مسلسل جود کے  
سبب سرد ہو چکی تھی آج پھر بھڑک اٹھی۔ مجھے سرتاپا دوباہو  
ایک نعرہ لگا لینے دیجئے! اب انشاء اللہ آپ سے خوب دل  
کھول کر باتیں ہوں گی پہلے میں آپ کی زبانی یہ سن لوں کہ آپ  
خیریت سے ہیں اور یہ کہ مجھے بھی کبھی یاد کیا یا نہیں؟

ہاں میرا پتہ فی الحال "مش"۔ معرفت پوسٹ اسٹرا ل آباد ہے۔  
آپ چونک پڑے! کیوں؟ ہاں میں آپ ہی کے شہر میں ہوں۔  
لیکن آپ سے کتنی دور! میں بے چینی سے آپ کے خط کی منتظر  
رہوں گی! ہمیشہ آپ کی داسی "شانتی"

اقبال واقعی چونک پڑا۔ "شانتی الہ آباد میں! حیرت ہے! اور پھر بھی مجھ سے دور! ناممکن۔ میں اس سے مل کر رہوں گا۔" پہلوں وہ رومانی نشہ میں سرشار رہا۔ مدت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر بھڑک اٹھی تھیں۔ اس کے غمگین دل کو شانتی کے تصور نے ڈھارس دی۔ طلعت کی ایک ایک کج ادائیگی یاد آئی۔ تمام عیوب دن کی روشنی میں چمکتے نظر آئے۔ لیکن خیر۔ شانتی کا پیارا خیال ان سب کی تلافی کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے فوراً ہی ایک طویل و بسیط خط لکھ ڈالا۔ اپنے دل کی غمناک سرگزشت — ایک "بلیوں کی خالہ" بیوی — اس کے تمام عیوب مع مبالغہ — آرزوؤں اور اربالوں کی موت — گھر کی انجھینس — ہر لحظہ شانتی کا تصور — رومانی خیالات کا ہمیشہ کے لئے فنا ہو جانا اور پھر عرصہ کے بعد خواہیدہ حسرتوں کی بیداری اور ساتھ ہی:-

"..... لیکن اب "بلیوں کی خالہ" کے مظالم کی حد پہنچی  
خدا نے ہمیں پھر ایک دوسرے سے ملا دیا۔ تم نے اپنے کسی پرانے  
خط میں لکھا تھا "کہ میرے شریک زندگی کا رنگ تمہاری پریت  
کے گیت گاتا ہے"

میں انہیں الفاظ کو تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔ کیا  
اب بھی تمہارے یہی جذبات ہیں؟ شانتی! عجز کرو۔ یہ ظلم  
ہے کہ ہمیں ہم ایک ہی شہر میں رہیں اور پھر بھی ایک دوسرے سے  
سے نہ ملیں۔ امتداد زمانہ نے ہم دونوں کے معصوم دلوں پر ہزاروں  
چمکے لگا دیئے۔ یہ کتنا ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے سے مل کر  
اپنے دل کے زخموں کو کسی حد تک مندمل کر سکیں۔ ہم کو وہیں  
مزدور غلام چاہیے۔ ضرور۔ آخر کب تک ہم اپنے پاک عجز و است

کو خطوں پر ضائع کرتے رہیں۔ . . . . . ”  
تیسرے ہی دن شانتی کا بنگشی خط موصول ہوا۔ وہ کسی طرح صحرائی  
کی درخواست منظور کرنے کے لئے تیار نہ تھی :-

” . . . . . تم مجھ سے مل کر کبھی خوش نہ ہو گے۔ ایک مہرجانی  
ہوئی کھی میں رنگ و بو کی تلاش عبث ہے دوسرے یہ کہ میں پڑ  
”بن بانس“ سے حد درجہ متنفر ہوں۔ پھر بھی اس کے ساتھ  
بے وفائی کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ میں تم سے کبھی نہیں  
مل سکتی۔ یہ کافی سے زیادہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی محبت  
میں سرشار ہیں۔ اور ہر ہفتے ہمیں ایک دوسرے کی دلی کیفیا  
کا موقع ملتا رہتا ہے اسی سے ہمارے شوق کی تسکین ہو جاتی  
چاہیے۔ خدا را تم کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ . . . . . ”  
لیکن اقبال معصوم ارادہ کر چکا تھا کہ چاہے جو کچھ ہو وہ شانتی کو تلاش کر کے  
رہے گا۔ چنانچہ اس نے ایک سہ سہری جواب لکھ کر روانہ کیا اور دوسرے  
ہی دن پوسٹ آفس میں اڈا جمادیا۔ ایک دن صاف نڈر گیا اور کوئی بھی خط  
یہ نہ آیا۔ دوسرے دن مولوی شمس اندر داخل ہوتے نظر آئے اقبال  
نے دیوار کی آڑ میں اپنے آپ کو چھپایا کہ کہیں یہ خبیث مولوی اسے دیکھ  
لے۔ لیکن دیکھ بھی لے تو کیا ہے۔ آخر ڈاک خانہ میں آنا جانا کوئی جرم تو ہے  
نہیں۔ مگر یہ مولوی آخر کہاں کیوں آیا۔ کون سا ایسا کام ہو سکتا تھا۔ وہ مولوی  
شمس کی طرف برابر دیکھ رہا تھا۔ ہائیں! یہ کیا اسرار۔ شانتی کے نام کا خط اسے  
کیوں دے دیا گیا؟ یقیناً ڈاک خانہ والوں سے غلطی ہوئی۔ وہ دوڑ کر پوسٹ  
ماسٹر کے پاس جانا چاہتا تھا کہ مولوی شمس خوش خوش اس کی طرف آتے

نظر آئے ان کے ہاتھ میں وہی خط تھا۔ اقبال دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور جیسے ہی وہ اس کے پاس سے گزرے اقبال نے ان کی گہری میں ہاتھ دیا۔

”بد معاش! یہ خط تم کہاں لے جا رہے ہو؟“

مولوی شمس کو چکر سا آیا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ”یقیناً یہ تو میرا خط ہے۔ یہ۔ یہ۔ دیکھئے میرا پتہ ”سن۔ معرفت پوسٹ ماسٹر الہ آباد۔ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔

”تمہارا خط ہے؟ کیوں کہتے ہو۔ کس کے پاس سے آیا؟“ اقبال نے ڈانٹ کر پوچھا۔

”میرے دوست صحرائی قے پاس سے۔“ مولوی نے کہا۔

”کو مت جی! صحرائی میرا نام ہے۔ یہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا خط۔۔۔“

تم میرے خط چرا کر لے جاتے ہو اور پھر طلعت کو دکھا دیتے ہو۔ میں تمہیں ابھی پولیس کے حوالے کر تا ہوں۔“

”یہ آپ قے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ہے! کیا صحرائی آپ ہی کا کا نام ہے؟“

مولوی شمس کا دم ٹھہنے لگا۔ ”آپ مذاق کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟“

شمس نے دانت بکھرتے ہوئے کہا۔ ”میں مذاق کرتا ہوں۔ ہوں؟“

اقبال نے مولوی شمس کے ہاتھ کو بل دینا شروع کیا ”اوہ! میرا ہاتھ ٹوٹا۔ ہائے

رے اللہ۔ رحم اف۔“

”سچ سچ بتاؤ تم کب سے میرا خط چراتے ہو۔ بتاؤ جلدی۔“

”اچھا اچھا ابھی بتاتا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔ بات یہ ہے کہ

آپا جان کے پاس صحرائی قے خط بہت عرصے آتے ہیں۔ شادی سے پہلے سے ان کا خط خراب ہے اس لئے میں ہی یہ خط لکھتا رہا تھا اور ڈانٹ خانہ

سے بھی ہمیشہ میں ہی خط لانا تھا۔ خط کا معنوں وہ بناتی تھیں اور میں لکھا کرتا تھا۔ شادی سے پہلے لقصو کے ڈاک خانہ میں خط آتے تھے اور میں ہی لایا کرتا تھا۔ بہت عرصہ تک خط و کتابت بند رہی۔ گذشتہ ہفتہ آپا نے مجھے بذریعہ تار بلوایا خط و کتابت پھر جاری ہو گئی تھی اور — اور یہ تیسرا خط ہے جو میں یہاں سے . . . . .

”اچھا۔ اچھا۔ ختم کرو، اب اس لکچر کو۔ جاؤ اپنی آپا سے کہنا صحرائی مر گیا سمجھے۔“

زنگین و سہاؤ نے خوابوں کی کتنی حسرت ناک تعبیر! اس ناکامی، ناامیدی، حیات افروز رومان کا کس قدر حسرت ناک انجام۔ خوابوں کے سہرے دھندلکے کے پیچھے موت کا سا بھیاں اب غار۔ طلعت ”شانتی“ ہے۔ ”شانتی“ طلعت آہ ایہ ”بلیوں کی خالہ“ شانتی ہے۔ یہ ”مردوں کا تھیلہ“ اف! ہنشتہ دلا جو رجوئی اور چمپا کے زنجین و معطر پردوں کے پیچھے یہ منیر کا سوکھا ہوا ٹکڑا یہ ”پن کش“ ناممکن! اگر یہ سچ ہے تو صرف ایک ہی علاج ہو سکتا ہے موت یقیناً اسے مرجانا چاہیے۔ اس صدمہ کو وہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔ ”اپنی سذر مری سے عشق کے اداس گیت سننے والے شام مراری! مجھے پریم کی لالہ زار سہاؤنی وادیوں میں لے چل! — ہوں! کیا یہ اسی ”خیلا جھٹن“ کی آواز ہے۔ تو بہ! لیکن طلعت ہی اگر شانتی ہے تو اسے اپنی ”صحرائی“ کو اقبال کی ٹنکھل میں دیکھ کر کتنا رنج ہوا ہو گا — ٹھیک ہے دونوں قصور وار ہیں اور دونوں کو برابر کا صدمہ ہے۔“ اقبال اس خیال کے ساتھ ہی طلعت کے کمرے میں گیا۔ وہ کوچ پر منہ اوندھائے پڑی تھی۔

”تمہارا بن انس حاضر ہے اے بی۔ بیوں کی خالہ! اقبال نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔ طلعت نے آبدیدہ نظروں سے اقبال کی طرف دیکھا اور پھر منہ چھپا چھپا کر بھوٹ بھوٹ کر رونے لگی۔ اقبال نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں طلعت کی محبت بڑھتی جا رہی ہے۔ کمرے کی فضا میں بھی اسے خوبی اور چمپا کی مخلوط خوشبو آئی۔ ”شے شے شے.....“ اس نے طلعت کا شانہ ٹھیکتے ہوئے کہا ”اٹھو۔ یہ کیا حاکت ہے طلعت ہم دونوں رومانے گدھے ہیں اور بس محبت کی اصلیت سے ڈر کر ہم صرف خیالی عشق چاہتے تھے۔ اتفاق سے ہم دونوں کی خط و کتابت شروع ہو گئی اور ہمیں موقع ملا کہ وہ اپنی شدید دلی کیفیات ایک دوسرے پر ظاہر کر دیں جنہیں ہم دوبرو بھی ظاہر نہ کر سکتے۔ اس کے بعد ہم دونوں نے اور شادی ہو گئی۔ یہ اتفاق ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کو پہچانا نہیں۔ بس چڑے چڑیا کی کہانی ختم ہوئی۔ صرف اس کا رنچ ہے کہ میں طلعت کی شخصیت میں شائستگی کو نہ پاسکا.....“

”یہ ماحول کا قصور تھا۔ مجھے بھی اقبال میں صحرائی کا عکس نظر نہ آیا۔ آپ مجھے صرف ”بیوں کی خالہ“ سمجھتے رہے اور میں آپ کو — آپ کو — ایہم — بن انس! طلعت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لیکن اب کس قدر آسان ہے کہ ہم صحرائی اور شائستگی بن کر رہیں۔ شائستگی نے صحرائی کو اقبال کے تمام عیوب بتا دئے اور اب وہ ان عیوب کو دور کرنے کی کوشش کرے گا۔“

ادھر صحرائی نے شائستگی پر طلعت پر ساری کوتاہیاں ظاہر کر دیں۔ کیا وہ طلعت کی بجائے شائستگی بننے کی کوشش نہ کرے گی.....“

صحرائی !!!“ مسرت میں ڈوبی ہوئی ایک چنچ کے ساتھ طلعتِ اقبال کے آغوش میں گری .....

”شانسی !!!“ اقبال نے نرم و گرم لبوں پر ایک جوشیلی مہر ثبت کرنے کے بعد کہا — ”شانسی! تم نے اپنے خط میں دو دلوں کے ملاپ پر جو فقرہ اور گیت لکھا تھا وہ میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں“

طلعت بھرائی ہوئی آواز میں بولتی ہے۔ خوشی کے آنسو اس کی آنکھوں سے جاری ہیں۔ اقبال بھی اس کے ساتھ ہم آواز ہے ”آج آکاش کے سارے دیوتا بچھڑے ہوئے دلوں کے ملاپ پر نئی گیت گکار رہے ہیں پریم نے من کی گنگا میںا کو..... سکھ سنگم پہ ملایا.....“

رجھا ہوا، فخر اور مولوی شمس دروازوں میں سے جھانک رہے ہیں۔ محبت کے دیوانوں نے نکرہ سر پر اٹھا رکھا ہے۔

”پریم نے من کی گنگا میںا کو..... سکھ سنگم پہ ملایا“

سید انصاف ناصر

بی۔ اے، ایل، ایل، بی دہلوی۔

# جب زندگی

”میرے محبوب میں دنیا کے تمام لوگوں کا قصور معاف کر سکتا ہوں کیونکہ وہ لائق فراموش ہونے کے باوجود ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ مگر تیرے کسی ایک قصور کو بھی معاف نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ ناقابل فراموش ہونے کے باوجود ہمیشہ ذہن سے اتر جاتا ہے لیکن یقیناً تو اس رمز کو بھی سمجھتا ہو گا کہ کسی کی خطا کا ذہن سے اتر جانا ہی اس کی اصل معافی ہے۔“

”اگر حسن و جمال کے ساتھ دولت و ثروت بھی ہو تو شوہروں کی کمی نہیں خواہ سچی محبت کرنے والے میسر آئیں یا نہ آئیں۔ لیکن اگر غربت و افلاس کے ساتھ حسن و جمال بھی ہو تو عاشقوں کی کمی نہیں۔ خواہ مناسب شوہر نصیب نہ ہوں۔“

”جس شخص میں عمدہ شوہر بننے کی صلاحیت موجود ہے کبھی صدق

دل سے محبت نہیں کر سکتا اور جس کے قلب میں قدرت نے حقیقی محبت کر نیکی  
 دادہ ودیعت کیلئے شوہر بننے کی صورت میں ناکامیاب زندگی بسر کرے گا۔  
 ”حسن و عشق کا جھونپڑوں میں اتصال ممکن ہے اور محلوں میں افتراق  
 یقینی“

طویل جدائی کا صدمہ بھی کچھ زیادہ شاق نہیں گذرتا اگر اس امر کا یقین  
 ہو کہ ہمارے محبوب کو بھی ہم سے عشق صادق ہے۔ برخلاف اس کے ہر  
 وقت کا اتصال باہمی بھی سوہان روح بن جاتا ہے۔ جب یہ محسوس کر لیا  
 جائے کہ اظہار محبت میں تسنّع سے کام لیا جا رہا ہے۔ اعمال غیب سے  
 نکلی ہوئی صدائے ”الوداع بدرجہا بہتر ہے اس ”خوش آمدید“ سے جس کو  
 صرف لڑک زبان سے ادا کیا گیا ہو۔

یہ تھے وہ نقوش زرین جن کو رتن بانی کے معجز ہنگام قلم نے اپنے ایک  
 شعریت سے لبریز فلسفیانہ مضمون میں رسالہ میکش کے اوراق پر رقم کیا اور  
 میری نظر انتخاب نے اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے ان سطور کو سوغامیس  
 سے زیر خط کر دیا۔ تمام مضمون نجی شیت مجرعی صنف ادب میں ایک نعمت  
 غیر مترقبہ تھا جس کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے اپنے اندر ایک عجیب  
 تبدیلی محسوس کی۔ اور خاص طور پر مندرجہ بالا سطور نے میرے دماغ پر ایسا  
 اثر کیا کہ کئی روز تک سوائے ان کے کوئی دوسرا خیال میرے ذہن پر مسلط  
 نہ ہو سکا۔ رتن بانی دنیائے ادب میں کوئی نئی ہستی نہ تھی۔ میں متعدد بار اس  
 کے مضامین کا مطالعہ کر چکا تھا اور ہر دفعہ کوشش کرتا تھا کہ تبادلہ خیالات  
 کے لئے کوئی سلسلہ شروع کروں۔ مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ لیکن اس مضمون

کانشہ اس قدر خفیف نہیں تھا کہ خیل انسانی پر طاری ہو کر باسانی اتر جاتا۔ چنانچہ میں نے تہیہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح اس خاتون سے شرف تعارف حاصل کرنا چاہیے۔ پہلے میں نے ارادہ کیا کہ اس مضمون پر ایک تقریفی تبصرہ کر کے خود اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروں۔ مگر عورت کا سوال بہت ڈیڑھا تھا۔ قارئین خیال کرتے کہ محض چھڑنے کی غرض سے یہ صورت اختیار کی ہے۔ بہت کم لوگ یہ سمجھ سکتے کہ درحقیقت اس مضمون نے میرے احساسات پر گہرا اثر کیا ہے۔ اس لئے میں نے پہلا خیال ترک کر کے فیصلہ کیا کہ ذریعہ خط مدبر میسجس کی معرفت رجوع کروں۔ یہ سب سے زیادہ ہلکے طریقہ تھا۔ لیکن کیا لکھوں سی کے سوچنے میں کئی دن گزر گئے۔ خود میری ہستی بھی ایک ادیب کی حیثیت سے روست ناس خلق تھی۔ کئی تخیلی افسانوں میں مفروضہ خطوط میں نے درج کئے تھے۔ لیکن جب حقیقت کی دنیا میں رتن بانی کو خط لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو ایک عجیب کیفیت تمام بدن پر طاری ہو گئی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی مغائرت نہیں ہے۔ وہ مجھ سے واقف ہے اور میں اس سے آشنا۔

کافی دماغ سوزی کے بعد میں نے ذیل کا خط لکھا اور رتن بانی کو مدیر میسجس کی معرفت روانہ کر دیا :-

محترمہ! تسلیم  
معاف کیجئے! میں بغیر کسی سابقہ تعارف کے آپ سے سلسلہ مرامت  
شروع کر رہا ہوں۔ لیکن غالباً دنیا کے ادب میں یہ کوئی عجیب  
جسارت نہیں ہے تاہم میں نے یہ جسارت لکھیوں کی؟ اس کا جواب

خود آپ کا مضمون دے گا۔ مجھے سخن شناسی کا دعویٰ نہیں۔  
 لیکن خوب درشت میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ضرور رکھتا  
 ہوں۔ اچھی چیز کو ہر شخص پسند کرتا ہے اور اظہار پسندیدگی میں  
 داسخن نہ دنیا بد ذوقی کا ثبوت بلکہ ایک حد تک نا انصافی ہے۔  
 لہذا آپ کی ادبی کامیابیوں کو سراہتے ہوئے مبارکباد پیش  
 کرتا ہوں کہ آپ کا مضمون نہایت کامیاب اور قابل قدر ہے  
 ایک ہندو خاتون سے ایسی پاکیزہ اردو لکھنے کی توقع رکھنا محال نہیں  
 تو مشکل ضرور ہے۔ لیکن میں دریافت کرتا ہوں کہ محبت کے عنصر  
 میں آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے کیا وہ آپ کے ذاتی تاثرات کا  
 نتیجہ ہے! غالباً میرا یہ استفسار نا زیبا نہیں۔ کیونکہ اپنے قیاسات  
 کی تکمیل چاہتا ہوں جو صرف آپ ہی کی ذات سے ممکن ہے۔  
 فی الحال میرا کوئی مستقل پتہ نہیں ہے۔ اس لئے آپ مدیر مکش  
 ہی کی معرفت جواب سے سرفراز فرمائیں بہر ذریعہ خط مجھے مل جائیگا۔  
 نوٹ :- غالباً میرے مضامین کا بھی مطالعہ فرمایا ہو گا۔

آپ کا

انجم جمالی

خطرہ روا نہ کر دیا۔ لیکن اس کے بعد۔ سے میری روح جس اضطراب سپہیم  
 میں مبتلا ہوئی اس کا اظہار غیر ممکن ہے۔ میرے تصورات کی دنیا ہی بدل  
 گئی تھی۔ ہر وقت رتن اور صرف رتن ہی کا خیال رہنے لگا۔ عام خواب میں  
 بھی یہی نظر آتا۔ گویا وہ میرے سامنے کھڑی مسک رہی ہے۔ میرے جذبہ  
 تخلیق نے اس کے مادی حذر و خال کو ان ادبی نقوش کے سانچوں میں ہال

لیا تھا۔ جھپٹو وہ اپنے مضامین میں پیش کرتی تھی۔ فلسفیوں  
کی متانت و سنجیدگی۔ شاعروں کا کیف و بخودی۔  
مخلوق سہادی کی الوہیت۔ دکھے ہوئے دلوں کا سوزہ دروں۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور دسویں دن ایک گلابی رنگ کا لفافہ  
ملا۔ تاخیر کی وجہ یہی تھی کہ وہ براہِ راست نہیں آیا تھا۔ بلکہ مددِ میکش کی...  
معرفت۔ طرزِ تحریر سے صاف ظاہر تھا کہ عبارتِ سوانی دستِ نازک کی...  
شاعرانہ جنبشوں کا نتیجہ ہے۔ لفافہ چاک کیا۔ خط پڑھا۔ لکھا تھا :-  
مکرمی! تسلیم۔

نوازش نامہ پیش نظر ہے۔ آپ نے جن الفاظ میں میری مضمون  
کی تعریف کی ہے ان کا دلی شکریہ۔ مگر وہ اس قدر تعریف کا مستحق  
نہیں۔ یہ صرف آپ کا حسنِ ظن ہے۔ لیکن حذار یہ تو بتائے کہ  
آپ کس بنا پر ایک ہندو خاتون سے پاکیزہ اردو لکھنے کی توقع  
نہیں رکھتے۔ کیا ہندوستانی زبان انگریزی میں قادرِ الکلام  
نہیں ہوتے؟ دنیا کی کسی زبان کو اور علم کے کسی شعبہ کو اگر علم کی  
غرض سے حاصل کیا جائے تو ہر فرد بشر اس میں مہارت تمام  
حاصل کر سکتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہندو ہو یا مسلمان  
میں نے عربی اور فارسی کا وسیع مطالعہ کیا ہے اس لئے اردو  
میرے لئے کچھ مشکل نہیں۔

آپ یہ کیوں دریافت فرماتے ہیں کہ محبت کے ضمن میں میرے  
تنازع و افکار دلی تاثرات پر مبنی ہیں یا نہیں؟ آپ خود بھی حقا

قلم ہیں۔ اپنے دل سے پوچھ لیجئے۔ البتہ میں آنا عرض کر دیتی کہ شاعر کے کلام کی شعریت محض الفاظ تک محدود ہوتی ہے اور وہ اس کیفیت یخودی سے نا آشنا ہوتا ہے جس کا اظہار غزل کے شعر میں کر دیتا ہے۔ الحمد للہ! کہ مجھے کسی سے محبت نہیں اور نہ اسکی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر بھی میرے خیالات کی پرواز اس نگرانی تک ہو سکتی ہے۔

جی ہاں! میں نہایت ذوق و شوق سے آپ کے مضامین کا مطالعہ کرتی ہوں۔ لیکن یہ نہ پوچھئے کہ ان سے کیا اثر لیتی ہوں۔

راقمہ :- رتن بانی

نوٹ :- آپ کے نام میں اعلیت معلوم نہیں ہوتی کیا میں صحیح اسم گرامی معلوم کر سکتی ہوں ؟

دل مسرت سے بھر پڑ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک ایسی دنیا میں پہنچ گیا ہوں جس کی تمام فضائیں شعر و رومان کے امتزاج سے ترکیب پاتی ہے کائنات کا ہر ذرہ میری نظر کے سامنے سے رقص کرتا ہوا گزرنے لگا اس وقت زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اس امر کا احساس ہوا کہ میں جوان ہوں رتن بانی کے خط کا ایک ایک لفظ میرے دل میں پیوست ہوتا چلا گیا۔ میرے تخیلات کی دنیا میں ایک نئی تعمیر کا اضافہ ہو رہا تھا۔ بہت سوچ سمجھ کہ خط کا جواب لکھا اور روانہ کیا۔

رتن !

میں بیان نہیں کر سکتا کہ تمہارے خط نے عین عالم انتظار میں پہنچ کر میرے دل کو کس کس نوع سے سکون بخشا۔ آپ شاید محسوس بھی نہیں کر سکتیں کہ انتظار کے لمحے کس قدر کھٹن کھٹو ہیں۔ خدا را جواب کے لکھنے میں تعویق نہ کیا کرو۔

نظریہ محبت کے ضمن میں مجھے آپ سے کسی قدر اختلاف ہے۔ محبت کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کو ضروریات زندگی میں شمار کیا جاسکے۔ پھر آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں نہ وہ انسانی چیز ہے جس کو حاصل کیا جاسکے۔ نہ ایسی شے کہ

لاحق ہو جانے کے بعد اس سے احتراز ممکن ہو۔ عشق پر زور نہیں ہو یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے اچھا میں آپ کے نظریہ کا تجزیہ بعد میں کر دے گا یہ بتائیے کہ آپ ازدواجی زندگی بسر کر رہی ہیں یا منہ زدن و شیرازی کے زیر سایہ محو خواب ہیں۔ میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ کی عمر کیا ہے تاکہ آپ کے قیاسات ذہنی کی بابت استنتاج کر سکوں کہ ان میں کجگلی ہے یا خامی۔

تم نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ شاعر کے کلام کی شعریت صرف الفاظ تک محدود ہوتی ہے اور اسی لئے وہ طبع کیف بخود ہی سے نا آشنا رہتا ہے۔ اگر اسے درست تسلیم کر لیا جائے تو آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ محبت کے بغیر خیالات کی پرواز ناممکن ہے

لے دئے تم اور آپ کے مختلف زرخیز اطباء کو غلط نہ سمجھا جائیو کہ انتہائے جذبہ کی کشمکش دکھانا مقصود ہے

تک ممکن ہے پہلے کسی سے دل لگا کر دیکھو پھر اصل شعریت سے  
لطف اندوز ہونا۔

بیشک میرا اصل نام کچھ اور ہے۔ تم اس کو معلوم کرنے کی کوشش  
نہ کرو اس کو جان لینے سے تمہیں کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہوگا  
البتہ اگر میرا موجودہ نام تم کو ناپسند ہے تو حسبِ مشاکسی دوسرے  
لفظ سے مخاطب کر سکتی ہو۔

میرے افسانوں کا ایک مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے تمہاری  
نظر سے نہ گذرا ہو تو ایک جلد بھیج دوں۔  
جواب کے لئے کب تک منتظر ہوں؟

تمہارا  
(حسبِ منشاء)

میں نے بہت ڈر ڈر کر خط لکھا تھا کہ کہیں کوئی جملہ ایسا رقم نہ ہو جائے  
جو برہمی مزاج کا باعث ہو۔ اپنے استفسارات کو بھی ایسے پیرایہ میں لکھا کہ  
اصل مقصد واضح نہ ہو سکے۔ مگر رتن بہت دقیقہ رس تھی۔ وہ سب کچھ سمجھ  
گئی۔ اس خط کا جواب حسبِ ذیل تھا:-

انجم جمالی!

تم بڑے شرمیل اور شوخ معلوم ہوتے ہو اور اپنے پنہار میں یہ سمجھتے  
ہو کہ دنیا کے باقی لوگ یتیم العقول اور کم فہم ہیں۔ کیا خوب! میری عمر  
کی بابت کتنے عجیب پیرایہ میں استفسار کیا ہے اور یہ بھی کہ میں  
انفرادی زندگی بسر کر رہی ہوں یا کسی کی شریکِ حیات بن کر میرے

خیالات کی چنگی یا خامی خود نفس مضمون اور طرز بیان سے واضح ہو سکتی ہے۔ عمر معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم معلول سے علت کا پتہ لگانا چاہتے ہو جو سراسر غلط ہے۔ میں تمہاری منشاء کو بخوبی سمجھتی ہوں۔ بس رہے بھی دو۔ کبھی ہرگز نہ بتاؤ گی کہ کچھ عرصہ سے میرے قلب کی دھڑکن، نبض کی حرکت اور تنفس کے سہجان میں غیر معمولی سرعت ہو گئی ہے ورنہ تم ضرور اندازہ لگا لو گے کہ میں زندگی کے کس دور سے گزر رہی ہوں میں یہ بھی نہیں بتاؤں گی کہ میرے بستر کی سلوٹس صرف میرے ہی اعضاء کی جنبشوں سے عالم وجود میں آتی ہیں۔ ورنہ تم یقین کر لو گے کہ رات کی تاریکی شروع ہونے کے بعد میں اپنی خوابگاہ میں اکیلی رہتی ہوں اور شاید ابھی تک دوشیزگی کی فضا میں سانس لے رہی ہوں۔ مجھے کسی عنوان پسند نہیں کہ یہ راز تم پر منکشف ہو جائیں۔ براہ کرم اب کوئی سوال ایسا نہ کرنا جو میری جسمانی شخصیت سے متعلق ہو۔ آخر تم کو ان باتوں سے کیا سروکار ہے؟

میرے خیالات میں تضاد سہی۔ مگر تمہارے اصول میں بھی یکجہت نہیں پائی جاتی۔ یہ کہہ دینے کے بعد کہ محبت اکتسابی شے نہیں، تم مجھ کو مشورہ دیتے ہو کہ کسی سے دل لگا کر محبت کی اصلی شہریت سے لطف حاصل کروں۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے معلوم ہوتا ہے کہ عملی زندگی سے ابھی تم کو بھی واسطہ نہیں پڑا۔ اور نہیں جانتے کہ دل لگا کے اور دل لگانے لگ جانے میں کیا

فرق ہے۔ خیر تمہارا یہ قصور قابل درگزر ہے۔ مگر آئندہ احتیاط رہے۔

مجھے یہ اختیار کسی طرح نہیں مل سکتا کہ میں ایک دوسرے نام سے تم کو مخاطب کروں۔ یہ حق صرف اس ہستی کے لئے مخصوص ہے جس کی زلفیں تمہارے بازوؤں پر منتشر ہونے کے لئے موزوں ہوں۔ لیکن یہ سن کر شاید تم کو تعجب ہو گا کہ میرا اصل نام بھی وہ نہیں جو اب تک تمہیں معلوم ہے۔ یہ عموماً ہوتا ہے کہ ارباب علم اپنی ادبی کاوشوں کو ایک فرضی نام سے پیش کرتے ہیں۔ کیا سمجھے؟

تمہارے انسانوں کا مجموعہ! نہیں وہ ابھی تک میری نظر سے نہیں گذرا۔ ممکن ہو سکے تو ایک جلد بذریعہ وی۔ پی۔ روڈانہ کر دو۔ میں قیمت ادا کر کے وصول کر لوں گی۔ مگر پھر بھی اپنے دستخط ضرور ثبت کر دینا تاکہ یادگار قائم رہے۔

جواب کی منتظر

رتن بانی

خط کی دلاویزری انداز بیان سے ظاہر تھی۔ ایک ایک جملہ عمیق قلب میں اتر گیا۔ میں نے زیادہ دیر تک سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ فوراً قلم اٹھا کہ خط لکھنا شروع کیا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس دفعہ مضمون خط میں میرے جذبات کو بھی دخل حاصل تھا :-

میری پیاری رتن!

خوش رہو۔ مجھے غم و اندوہ بخشنے کے لئے آرام و چین سے زندگی بسر کرو۔ مجھے مصائب و آلام میں مبتلا کرنے کے لئے سنو اور خوب سنو، مجھے خون کے آنسو رلانے کے لئے بقیہ حیات رہو۔ مجھے تلخی مرگ سے لذت آشنا کرنے کے لئے۔

کیونکہ یہی زندگی ہے، اور یہی زندگی کا مقصود میں نے سلسلہ مراسلت شروع کیا تھا، محض داؤ سخن دینے کے لئے تبادلہ خیالات کرنے کے لئے۔ لیکن چونکہ اس سے قبل تمہارے مضامین کا گہرا اثر میرے دل و دماغ پر طاری تھا۔ اس لئے احساسات کی دنیا ہی بدل گئی۔ گویا نقوش پہلے سے مرتسم تھے، اب تم نے ان کو ابھار کر نمایاں کر دیا۔ اس کیفیت نامتام کی تکمیل تمہارے ہاتھ ہے تم مجھے شوخ بنگار بتائی ہو حالانکہ شوخ فطرتی تمہاری زندگی کا بھی ایک جزو ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمہارے پاس ایک شان استغیا ہے اور میرے ہاں ایک آرزوئے سیرگی۔ میری استغیا کا جواب جس ادائے خاص کے ساتھ دیا گیا ہے اس کے لطف بیاں پر جان و دل صدقے کر دینے کے بعد بھی سب دوستی خراج ممکن نہیں۔ تم نے کچھ نہ بتاتے ہوئے گویا سب کچھ بتا دیا۔ اب جب کہ تم زندگی کے اس دور سے گزر رہی ہو جس کی منزل اول میں قدم رکھتے ہی تبادلہ صہبا کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ تم اپنے قلب کی دھڑکن نبض کی حرکت اور تنفس کے بیجاں میں تسکین پیدا کرنے کے



کا اندازہ لگا سکوں۔ ہرگز نہیں۔ یہ توجہ بات کی تنگ نظری ہے۔  
 جو مسلک عشق میں روتا نہیں۔ علاوہ ازیں حسن ظاہری سریع الزوال  
 ہوتا ہے اور اس کی رعنائیاں گریز پا۔ پھر جس شے کو خود ثبات  
 حاصل نہ ہو۔ اس پر اپنی تناؤوں کے نقوش کندہ کر کے استقرار  
 و جد کی تمنا رکھنا سراسر غلطی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ عارضی طور  
 پر تمہاری تصویر ہی کی جلوہ فرمایوں سے اپنے قلب مضطر کو  
 تسکین دے لیا کروں۔ یا اگر تمہارا غور و غور و غور کو اجازت  
 دے تو کسی جگہ شرف ملاقات کا موقع دو۔ کیوں رتن! کیا تم  
 مجھ سے ملنا پسند کرو گی؟

تمہارے دیدار کا منتہی  
 انجم جمالی

دل لگی ہی دل لگی میں دل کی لگی ہو گئی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ قبضوں کا انجام  
 بھی سوزن قلب کے آغوش میں ہو سکتا ہے۔ پہلا خط لکھنے کے وقت میں  
 یہ نہ جانتا تھا کہ اس کا نتیجہ محبت کی شکل میں برآمد ہو گا۔ سب سے زیادہ  
 جذبات میں براہِ غفلت اس وقت ہوئی جب مجھے اس امر کا علم ہوا کہ ابھی رتن  
 کے چمن حسن کا کوئی گل چین پیدا نہیں ہوا اور نہ اگر وہ دوشیزگی کی حدود طے  
 کر چکی ہو تو یہی امر قاطع امید بن جاتا۔ کیونکہ دل کو صبر دے لیتا کہ شریف  
 منہ و خالون ایک مرد کی ہو جانے کے بعد دوسرے شخص کے لئے آسودگی،  
 آغوش نہیں بن سکتی۔ رتن بانی کے جواب بھی یہ یقین دلا رہے تھے کہ غالباً  
 خود اس کی توجہ بھی پہلے سے میری طرف منقطعی ہے۔ لیکن مندرجہ بالا خط کا

جو جواب آیا اس سے میری روح کو ایسا صدمہ شدید پہنچا کہ بیان نہیں کیا جاسکتا  
لکھا تھا :-

جمالی !

میں سمجھتی تھی کہ تمہاری تمام باتیں معصومیت سے لبریز ہوتی ہیں  
لیکن پیش نظر خط سے میرے توقعات کی دنیا بدل گئی۔ تم نے  
خوب دل کھول کر اظہار عشق کیا۔ برا کیا۔ تمہاری یہ جسارت میرے  
لئے نہ صرف ناگوار خاطر ہے بلکہ بڑی حد تک میرے جذباتیت  
کی توہین بھی۔ میں محبت کا احترام کرتی ہوں۔ لیکن صرف محبت کی  
حد تک۔ تم اس سے زیادہ کے متمنی ہو میری آرزو ہے کہ اس جذبہ  
کو زیادہ سے زیادہ دیر پا بنایا جائے۔ تم چاہتے ہو کہ چٹکی کو پنچنے  
سے قبل ہی اس کو مائل بہ زوال کر دیا جائے بالفاظ دیگر میں  
چاہتی ہوں کہ کلیاں پھولوں کے دور حیات تک شادابے میں  
تم چاہتے ہو کہ شگوفہ بننے سے قبل ہی ان کو مل کر پامال کر دیا  
جائے۔ اسی لئے میں اپنی شادی کے خلاف ہوں۔ چاہتی  
ہوں کہ دوشیزگی کی نغمہ پرور کیفیات عرصہ دراز تک میری روح  
پر طاری رہیں۔ میرا عزم راسخ ہے۔ میں یقیناً اس پر کار بند  
رہوں گی۔ کیونکہ ”میرا دعویٰ ہے کہ میں دنیا میں ایک شاعرانہ  
زندگی گزارنے آئی ہوں“ میں جنس قوی کی معیت سے متغیر  
نہیں مگر اس کی حرلیانہ لغزشوں سے بخوبی محسوس کر لینے کے

باعث اس سے اجتناب ضروری سمجھتی ہوں۔ مرد بہت زیادہ خود غرض اور نفس پرورد ہوتے ہیں۔ وہ لطیف جذبات کی نزاکت کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنی خواہشات کی اہرنی قوتوں سے سوانی شمریت والوہیت کا خون کر دیتے ہیں۔ ان کی تخلیق تو ایک ایسی فضا میں ہوئی چاہیے تھی۔ جہاں نہ شفق کی رنگینی ہوتی نہ پھولوں کی تنگہٹ نہ چاند کی صیا ہوتی نہ شبنم کی 'طراوت' نہ پرندوں کا ترنم ہونا نہ چشموں کی لطافت۔ بلکہ ایک ویران جنگل، سبزی و شا والی سے محرا، رنگینی و طراوت سے خالی، نور و بھت سے بے نیاز، البتہ ایک ایسی ہستی بھی ان کے سپرد کر دی جاتی جس کی جسمانی ساخت تسکین خواہشات کے ضمن میں عورت سے مشابہ ہوتی۔ پھر یہ مرد — غیر شاعرانہ ذہنیت رکھنے والا مرد — قسام ازل سے کسی دوسری شے کا طالب نہ ہوتا۔

تم مجھ سے میری تصویر طلب کرتے ہو۔ آخر کیوں؟ مسلمان ہو۔ ہر وسیط سے بے نیاز ہو کر بارگاہ ایزدی میں سرسجود ہونے کی تعلیم تم کو دی گئی ہے۔ اس فلسفہ مذہب کو اپنا ایمان سمجھو۔ کاغذی یا سنگین بت کو سامنے رکھ کر شاید مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرنا وسعت خیال نہیں تنگ نظری ہے۔ حصول مقاصد کے اس طریقہ کار کو ترک کر دیا۔

اگر تم کو مجھ سے واقعی محبت ہے تو میں اس تلاش کے لئے شکریہ گزار ہوں۔ مگر مجھ سے تصویر طلب نہ کرو۔ بلکہ اپنے تصورات کو اس قدر تکمیل دو کہ خود تمہارا ذہن رسامیرے حقیقی پیکر کو تخلیق کر لے

اور کائنات کی لامحدود فضا میں سوائے میرے کوئی دوسری شے  
 تم محسوس نہ کر سکو۔ میرے جلووں کے علاوہ تم کو کچھ نہ دکھائی دے  
 صرف میرے ہی نغمے تمہاری سامعہ پر اثر انداز ہو سکیں۔ تم میری  
 تصویر کو سامنے رکھ کر اظہار جذبات کر دو گے۔ لیکن میں نہ تمہاری  
 گفتگو کو سن سکوں گی نہ تمہارے چہرے کی رنگت دیکھ سکوں گی  
 تم اپنے خیالات میں ایک کشش پیدا کرو۔ مجھے اس قدر یاد کرو  
 کہ خود میں تم کو یاد کرنے کے لئے مجبور ہو جاؤں۔ اگر تمہارے دل  
 کا سوز اتنا بھی نہیں کہ اس کی تپش سے میرا جسم جل اٹھے تو دعویٰ محبت  
 غلط ہے۔ تم ایک ایسے معنی بن جاؤ۔ جو مصراہ کو جنبش دے بغیر  
 تاروں میں ارتعاش پیدا کر سکتا ہو۔ تم اپنے ترنم خاموش سے  
 تمام فضا میں ایک ایسا سکوت نغمہ پیدا کر دو۔ جو کسی کے کانوں تک  
 نہ پہنچے۔ مگر میں اور صرف میں — ان کو سمجھ کر سننے کے لئے  
 اور اس کی داد دینے کے لئے مجبور ہو جاؤں۔

تم سلسلہ مراسلات کو جاری رکھنا اور ضرور جاری رکھنا لیکن  
 یہ ملحوظ رہے کہ میرے جذبہ نشاطیت یا احساس شعریت کو کوئی  
 صدمہ نہ پہنچے، جواب کی منتظر

رتن بانی

میں نے اس خط سے کیا اثر لیا میرے جواب سے ظاہر ہے جو میں  
 نے اولین فرصت میں رقم کیا :-  
 معصوم شاعرہ ! خوش رہو۔

تمہارا گرمی نامہ جو ایک شاعر کا دیوان اؤ

واعظ کے دفتر پند و نصائح سے کم نہیں، اس وقت پہنچا جب کہ میں بطور یاد دہانی دوسرا خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اسے پڑھا اور بار بار پڑھا۔ اگرچہ خط کے ہر جملہ سے بے نیازی ظاہر جملہ کے ہر لفظ سے شان استغنا واضح اور لفظ کے ہر حرف سے غرور حسن ٹپک رہا ہے۔ مگر پھر بھی اس میں سے بوئے محبت آتی ہے اور صرف اسی احساس نے مجھے اب تک بقید حیات رکھا۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تم ابھی کمسن ہو، عملی زندگی سے ابھی واسطہ نہیں پڑا۔ ورنہ اس شاعرانہ موٹنگا فیوں سے احتراز کرتیں۔ جو اصول کی حد تک رنگین ہیں اور اصول وہی قابل قدر ہوتے ہیں جو دائرہ عمل میں نہ آسکیں۔ لیکن جیسا کہ مہارے ایک خط سے پتہ لگ گیا ہے، وہ وقت قریب ہے جب کہ احساس شباب تمہاری شہریت و نسائیت پر غالب آجائے گا۔ اس وقت میں تم سے پوچھوں گا کہ تم اس دنیا میں شاعرانہ زندگی گزارنے آئی ہو یا ایک آرزوئے پردگی کے ساتھ کسی کی حد درجہ غیر شاعرانہ خلوتوں میں بالکل مجرمانہ طور پر ایک سہا ہوا سانس لیتے۔ تم مرد کی حریصانہ لغزشوں سے خائف ہو کہ وہ لطیف جذبات کی نزاکت کا خیال نہ رکھتے ہوئے اپنی خواہشات کی اہرمنی قوتوں کو سنواری شہریت والوہیت کا خون کر دیتے ہیں۔ بجا ارشاد ہوا۔ لیکن خدا را بھمے یہ قوت باؤ کہ عریز مصر کے قصرات کی فضا میں یوسف کا دامن کس کی حریصانہ انگلیوں سے کھینچا تھا؟ اور ردو نیل کی موسیقیت سر بریز لہروں پر لنگر انداز ہو کہ حسن کی کرشمہ ساز یوں سے انظونی کو

دارفہ تخیل کر کے سلطنتِ روما کو غیر شاعرانہ حد تک متزلزل کر دیں  
 والی ہستی کس صنف سے تعلق رکھتی تھی؟ اسی طرح کسی ملک کی  
 تاریخ ایسے واقعات سے خالی نہیں۔ اگر تمہارے اندر ذوق  
 تجسس ہے تو میرے بغیر کہے ان کو سن لو اور پھر فیصلہ کر دو کہ  
 جو غیر شاعرانہ ماحول تم نے جنسِ قوی کے لئے تجویز کیا ہے۔ وہ  
 صنفِ نازک کے لئے بھی کس حد تک موزوں ہے اگر عورت کی  
 فطرت میں شہریت و الودہیت ہوتی تو اس کی ترغیب پر غریب  
 آدم کو جنت کی پرامن فضا سے جلا وطن ہونا نہ پڑتا اور میں تم  
 سے بھی پوچھوں گا کہ اگر شاعرانہ زندگی ہی بسر کرنی تھی تو مخلوق  
 سماوی کے ساتھ تاروں کی جھمت بار فضا میں کیوں نہ قیام کیا  
 کہ کشیدہ دامنِ فطرت کہ میاں و من آدمی؟ تو بہارِ عالم دیگر می تو کجا بایں جن آدمی  
 بیشک میرے مذہب نے بھہ سکھایا ہے کہ بغیر کسی وسیط کے بارگاہ  
 ایزدی میں سر بسجود ہو جاؤ لیکن محبت کے ہاتھوں اب تو تمہارا  
 مذہب میرا مذہب ہے، تمہارا دین میرا دین ہے۔ اسی لئے  
 پت پرستی کو میں نے اپنا شعار بنا لیا کیونکہ تم بھی بت پرست  
 ہو۔ کیوں رتن! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ میرا خیال ہے  
 کہ تم کو تصویر بھیجے میں اب کوئی عذر نہ ہو گا!  
 اچھا یہ بتاؤ کہ تم کو موسیقی سے بھی کچھ ذوق ہے یا نہیں؟  
 تمہارے پیانہ ناسیت کو بادۂ شہریت سے لبریز دیکھئے کا متنی  
 انجمِ جمالی

میں سمجھتا تھا کہ رتن بائی اس خط کا کوئی معقول جواب نہ دے سکے گی مگر اس کی ادبیانہ شان مجھ سے بازی لے گئی۔ ہر چند اس کی باتیں ضد اور ہٹ پر مبنی تھیں — مگر طرز ادا دلربائی کی حد تک حسین تھا اور یہی وہ چیز تھی جس نے میرے دل کو موہ لیا تھا۔ درحقیقت مجھے اس کے ادبی نقوش سے محبت تھی۔

دارفتہ تخیل !

کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم کسی چیز کا مطالعہ بنظر غائر نہیں کرتے۔ تمہارے خیال کی وسعت صرف سطح سمندر پر تڑپنے والی موجوں اور ان موجوں کے ساتھ بہنے والے خس و خاشاک تک محدود ہے اور میرا ذوق تجسس اس اضطراب پیہم کے عمق میں بھی کال سکون و طمانیت کے گہوارہ کے اندر پرورش پانے والے صدف کے شکم سے گو ہر بے بہا نکال لیے گا آرزو مند۔ بدیہی چیزیں بھی اکثر سراب ہوتی ہیں اور اسی لئے تم ہر قسم کے فریب میں مبتلا ہو۔ تم پھول کی رنگینی کو دیکھتے ہو اس کی نکہت سے لطف اٹھاتے ہو اور بس۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہوں اگر رنگینی اور نکہت کو پھولوں سے جدا کر کے ان میں شبنم کی تھوڑی سی طراوت بھی کسی طرح ملا دی جائے تو ان کے امتزاج باہمی سے کس نوع کا تلذذ حاصل ہوگا۔

خالق حقیقی نے آدم کے جزد بدن سے حوا کو پیدا کیا تھا۔ لہذا شمع تباہ ہو گئی۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر حوا کے جزد بدن سے آدم کو پیدا

کیا جاتا تو صورت واقعات بالکل برعکس رہتی۔ بے شک یوسف کے دامن کو ایک عورت نے لٹھپیا تھا۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ یوسف سے قبل اسی عورت کے دامن کو ایک مرد کی حریمیانہ خواہشات نجس کر چکی تھیں۔ اس لئے شعریت کا فقدان تھا۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ خود کو تباہ و برباد کرانے کے لئے انطوائی ارض مصر میں آیا تھا یا کلیتہً پیڑمے روم کی شعریت کو تباہ کرنے کے لئے ترک وطن کیا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ اپنی آنکھ کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا۔ دیکھ کی آنکھ کا تنکا نظر آ جاتا ہے۔ صنف نازک کو برا کہنے والے نہیں سمجھتے کہ خود ان کی جنس کس قدر قابل نفیس ہے کیوں جالی! تم بھی کچھ سمجھے یا نہیں؟

تم میرے خیالات کو شاعرانہ تعلیوں سے تعبیر کرو یا جو جی چاہے سمجھو! مگر میں ان پر جان دیتی ہوں۔ میری روح کی تسکین جنس میں مغمم ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ شعریت ذہن انسانی پر ہمیشہ مستولی رہتی ہے۔ ہر چیز کے لئے زوال لا بد ہے ۵

بچے معلوم ہو جو حسن کا انجام ہوتا ہو مری آنکھوں نے دیکھا ہو عرواۃ مآباً میں یہ بھی سمجھتی ہوں کہ عملی زندگی کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ایک نہ ایک دن ہر شخص کو گرنا ہوتا ہے۔ انسان کے مقاصد حیات میں یہ چیز ضرور شامل ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ رتن بائی بھی باقتضائے شباب کسی نوجوان کی زینت آغوش بننے کے لئے آسانی سے مجبور ہو جائے اور خود اپنے ہاتھوں اپنے جسم کی شعریت اور روح کی الوہیت کو تباہ کر لے۔ تاہم حذر انخواستہ

اگر ایسا ہوا بھی کہ میرے بلند آہنگ دعوے باطل ہو گئے اور میں نے اپنے نصب العین کی تکمیل میں ناکامیاب رہ کر ہارمن لی تو پھر بھی وہ میری زندگی کا آخری حصہ ہو گا۔ میرے عہد شباب کے زرین دور کو جنس قوی کی دست درازیاں کبھی پاپا نہیں کر سکتیں۔ میں اس کے تحفظ میں جان تک دیدینا گوارا کر لوں گی۔

کیوں جالی! تم میری محبت کی خاطر اپنے مذہبی عقائد کو ٹھکرا کر بتوں کی ہیکل گلے میں ڈال لینا باعث فخر سمجھتے ہو۔ آخر کیوں مجھے اندیشہ ہے کہ تم اس سے زیادہ زرین شے کو حاصل کرنے کی غرض سے کہیں محبت کو قربان کرنے کے لئے تیار نہ ہو جاؤ۔ بتاؤ! میں تمہارے جذبات کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھوں؟ انسان کو چاہیے کہ لوہا نہ بنے بلکہ خود اپنے اندر مقناطیسی کشش پیدا کرے۔ کسی شے کی طرف کھینچ جانے میں وہ لطف کہاں جو دوسری چیز کو اپنی طرف کھینچ لینے میں ہے مادر گیتی نے سب سے پہلا سبق ہمیں یہی دیا ہے۔ میری خاطر اپنے دہرم کو نہ چھوڑو بلکہ کوشش کرو کہ خود میں تمہاری ہم مذہب ہو جاؤں۔ مجھے موسیقی سے ذوق ہی نہیں بلکہ وہ میرے روزانہ انہماک کا بہترین جزو ہے۔ رات کے آخری پہرے سے طلوع آفتاب تک میں اسی فعل میں رہتی ہوں لیکن کوئی دوسری ہستی اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی میرے نعموں کی دنیا صرف میرے ہی وجود تک محدود ہے۔ لیکن تم کو ان شاعرانہ باتوں سے کیا اثر کا

یہ تو کچھ ہم ہی لوگوں کے لئے موزوں ہیں۔

جواب کی منتظر  
رتن بانی

اس کے بہت عرصہ تک ہم دونوں کے درمیان سلسلہ مراسلت جاری رہا مگر رفتہ رفتہ وہ رنگینی کم ہوتی گئی۔ محض الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ وہی پرانی باتیں کہی جانے لگیں۔ جن میں فرسودگی کے باعث کوئی مخصوص جاذبیت باقی نہ رہی۔ ادھر میں نے یہ سوچا کہ جس چیز کا کوئی نصب العین نہ ہو، اسے اختیار کرنے سے کیا حاصل؟ رتن بانی نے مضامین لکھنے ترک کر دئے تھے جس کا سبب باوجود دریافت کرنے کے کچھ نہ بتایا گیا۔ وہ عموماً میرے دریافت طلب امور کو ٹال دیتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اس کے خطوں سے کسی قدر بے اتفاقی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ خواہ مخواہ میری طرف سے کچھ رہی تھی۔ غرض یہ کہ دونوں طرف سے بے توجہی اور ایک حد تک معاشرت کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ہم ایک دوسرے سے ناواقف ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ہم دونوں کا بعد ناقابلِ عبور ہو گیا۔ وہ مجھے بھول چکی تھی میں نے اسے .... فراموش کر دیا۔

انہی دنوں میں فارغ التحصیل ہو کر وطن واپس چلا گیا۔ چونکہ والد لاٹ صاحب کے دفتر میں ایک اعلیٰ عہدہ پر مامور تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر مجھے ایک معقول اسامی مل گئی۔ برسرِ روزگار ہونا تھا کہ گھر والوں کو شادی کی فکر ہو گئی۔ ہر چند میں نے مخالفت شروع کی مگر والد کا اصرار مجبور کرنے

لگ۔ چنانچہ ادھر ادھر رتھے بھیجے گئے۔ تحقیقات کی گئی۔ مگر کوئی رشتہ سمجھ میں نہ آیا۔ میں چاہتا تھا کہ لڑکی ایک عمدہ ادیبہ کی حد تک تعلیمیافتہ ہو حسین ہونا نہ ہو شریف النفس ضرور ہو۔ شعر و موسیقی سے شغف رکھتی ہو۔

معاملہ ابھی لیت وصل ہی میں تھا کہ والد صاحب کے ایک دوست لاہور سے تبدیل ہو کر دہلی آ گئے۔ چونکہ تعلقات دیرینہ تھے اور کچھ رسم بھی ہے۔ اس لئے ایک روز دعوت طعام کے لئے ان کو مع جملہ عزیزان کے مدعو کیا گیا۔ ظہیر خوش اخلاق اور با وضع آدمی تھے۔ مجھے ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ ان آدمیوں میں سے تھے جو بہت جلد بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ انوار کا دن تھا، فرصت تھی اس لئے سارا دن ان سے شطرنج کھیلنے میں گزارا۔ برسبیل تذکرہ روزمرہ کے کوائف پر بھی گفتگو ہوتی رہی۔ نوجوان ادیبوں میں انھیں انجم جالی کا طرز تحریر..... بہت پسند تھا۔ لیکن اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ ان کے سامنے بیٹھا ہوا سیم ہی انجم جالی کے نقاب میں رقم طراز ہوتا ہے یہ لازم خود میرے والد پر بھی منکشف نہ تھا۔

ان کے رخصت ہو جانے کے بعد جب مجھے زمانہ حصر مکان میں جانا کا موقع ملا تو ہمیشہ کی زبانی معلوم ہوا کہ ظہیر صاحب کی صاحبزادی نے اپنی وضع قطع اور عادات اطوار سے والدہ کا دل موہ لیا ہے۔ "صابرہ خاتون جوان اور خوب صورت ہے۔" اس کے علاوہ بچے کچھ نہ بتایا گیا۔ جو یقیناً میرے لئے ناکافی تھا۔ دوسرے لوگ بھی لاعلم تھے۔ مگر مزید تحقیقات سے معلوم ہوا کہ صابرہ نے گذشتہ سال ہی منشی فاضل کی ڈگری حاصل کی ہے اور چند فنون لطیفہ میں بڑی ماہر ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کس چیز کی ضرورت تھی چنانچہ اپنی رضا مندی ظاہر کی یہی دو عناصر ایسے ہیں جو مجھے ایک عورت کی پرستش کرنے

کے لئے مجبور کر سکتے ہیں۔ علم و ادب اور فنون لطیفہ۔

شادی کا پیغام بھیجا گیا جو خطیر صاحب نے معمولی پس و پیش کے بعد قبول کر لیا چنانچہ اس کا رخیڑ کا اہتمام دونوں طرف سے شروع ہو گیا۔ لیکن مجھے جس قدر خوشی ہو رہی تھی اتنا ہی رنج بھی تھا۔ ہر چند خط و کتابت کا سلسلہ جاری نہیں تھا مگر پھر بھی رتن بانی کی یاد میرے لئے سوہان روح تھی۔ رہ رہ کر اس کے فلسفیانہ خیالات اور اس کی ادیبانہ شان بوجہ قلب پر اتر رہی تھی۔ عرصہ تک میرے تخیلات کے سندر میں اس نے ایک مقدس دیوی کی حیثیت سے جلوہ فرمائی کی تھی۔ فراموش کر دینے کے بعد بھی اس کو بھلا دینا مشکل تھا۔

ابھی ترکِ محبت بھی کیا محبت ہو بھلاتے ہیں انھیں وہ یاد آئے بھلاتے ہیں خاص طور پر شادی سے ایک روز قبل میرے قلب کی کیفیت عجیب تھی میں نے سنان رات کے خاموش سنائے میں رتن بانی کے تمام خطوط میز کی درج سے نکالے۔ ایک ایک سطر کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے بعد ان سب کو چاک کر کے نذر آتش کر دیا۔ ہر چند میرا یہ عمل متعین نہیں تھا مگر مجھے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ ایک شرابِ حیات کی موجودگی میں کسی دوسری ہستی کے نفوسِ محبت کو اپنے محفوظ میں شامل رکھوں۔ صبح ہوئے تک میری طبیعت بہت زیادہ مکدر ہو گئی۔ کیونکہ دُورِ جوش میں آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اگر کچھ دیر رو لیتا تو دل کی بھڑاس نکل جاتی۔

خیر شادی ہو گئی اور میں صابرہ خاتون کے ساتھ عیش و نشاط کی زندگی بسر کرنے لگا۔ ہماری خلوت کے بیشتر لمحے ادبی گفتگو میں صرف ہوتے تھے۔ بسا اوقات کسی شعر کے مطالب و مفہوم پر بحث و تخیل بھی ہوتی۔ کبھی وہ ہار جاتی اور کبھی مجھ کو اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑتا۔ میری طرح وہ بھی غالب کی بڑی مداح

تھی۔ اور حلقہ کے صدر ہاشم زبانی یاد تھے۔ اکثر برسات کی سہانی راتوں میں اسکی نازک انگلیاں ہمارے مونہم کے پردوں پر رقص کرتیں۔ اور میں۔ بیلے کے ساتھ مضرب برسا رہتا۔ وہ مجھ سے زیادہ بہتر گانا جانتی تھی۔ کیونکہ میرے پاس سنوائی گانے کا شیریں بوج نہیں تھا۔ لیکن غور و نحوث کے نہ عم باطل میں اس نے کبھی برتری کا دعویٰ نہیں کیا۔ وہ صدق دل سے میرا احترام کرتی۔ اور حقیقی معنوں میں اپنا سہ تاج تقویٰ کرتی تھی۔ ہماری مشترکہ زندگی دوسروں کی نظر میں بھی رشک کی حد تک خوشگوار تھی۔

میرے ساتھ اس کے اندر بھی مضمون نگاری کا شوق پیدا ہو گیا۔ لیکن سب سے پہلے افسانہ کا مطالعہ کر کے میں نے رائے قائم کی کہ وہ ایک کہنہ مشق ایسا ہے۔ ہماری کاوشیں مشترکہ طور پر تاریک راسخ کے سامنے پیش ہونے لگیں۔ میں افسانہ لکھتا اور وہ ایک سرسری نظر ڈالتی۔ یا وہ افسانہ لکھتی اور میں ایک سرسری نظر ڈال لیتا۔ مگر تمام افسانے اور مضامین صابرہ شیم کے نام سے شائع ہوتے۔ بعض اوقات میں سوچتا رہ جاتا کہ اگر رتن بانی میری طرف ملفت ہو کر مصروف عمل ہو جاتی تو شاید ہمارے مضامین وغیرہ رتن جہالی کے مشترکہ نام سے شائع ہوتے۔ لیکن یہ ایک آرزو تھی انتہائی دلکش۔ دلکش اس لئے کہ پال ہو چکی تھی۔

شادی کے تقریباً دو سال بعد کا ذکر ہے کہ دہلی کی شدید گرمی سے آلتا کر ہم نے سوچا کہ عارضی طور پر کسی پہاڑی مقام پر منتقل ہو جانا چاہیے۔ نظر انتخاب ارض کشمیر کی طرف اٹھی اور فیصلہ کر لیا کہ بلاشبہ اس سے زیادہ بہتر ماحول دوسری جگہ نصیب ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ اس سنجیدہ نوع عملی جامعہ پہنایا گیا اور بقول صابرہ

خاتون ہم جلدی ہی ایک شاعرانہ مقام کی موسیقیت سے لبریز خنایں سانس لیے گئے۔

سری نگہ میں جھیل ڈل کے کنارے ہم نے ایک چھوٹی سی کشتی میں قیام کیا۔ وہ ہم دونوں کی رہائش کے لئے کافی تھی۔ سیلاب آسا ترپے والی سطح آب نیلگوں اطلس کی چادر آسمان درختوں کی تباہ زمردیں مختلف الاوان پھولوں کے تختے رنگ برنگ کے پرندے۔ کچھ فاصلہ پر برف پوش چٹیاں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور ان سب سے زیادہ سرشام جب کہ مہفت اقلیم کی دیویاں افق مغرب میں جمع ہو کر ہولی کھیلتی ہیں۔ دوشیزگان کشمیر کا پھولوں کے گجرے پہن کر سرخ سناریوں میں ملبوس ملحقہ باغوں کی روشنوں پر محو خرام ہونا۔ یہ وہ عناصر ہیں جن کی کمرہ سازیوں سے اس مقام کی تمام نقصان نگہت و صباحت لطافت و رنگینی، نور و نزاکت، ترم و موسیقی، نقص و سرور اور ماضی شعریات و سماوی الوہیت سے ہر وقت معمور رہتی ہے منظر کشی کے لئے کیمرا ہمارے ساتھ تھا۔ تاکہ ہر گوشہ چمن سے کیفیات قدرت کی تسخیر کر سکیں۔ مگر اس طرح کہ ہر تصویر میں شامل ہونے کے لئے میں یا صابرہ کیمرا کے سامنے آکر کائنات کو پس منظر میں لے لیتے تھے اس لئے کہ ہمارے سفر کی یادگار قائم ہو سکے۔

ایک دن جب کہ ہم نشاط باغ میں نہیں رہے تھے۔ صابرہ خاتون بارہ دری کی شاہی نشست گاہ پر جا بیٹھی اور مجھ سے کہا کہ یہ فرض کر کے تصور کھینچو گویا میں نور جہاں ہوں اور تم جہانگیر۔ کتنا حسین تخیل تھا کہ میں کیمرا کی عقلی دبانے سے قبل اس کے لبوں پر ایک مہر الفت ثبت کرنے کے لئے مجبور ہو گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی کسی کی یاد مجھے تسالے لگی۔

رتن بانی ات رتن بانی! — اگر اس موقع پر وہ موجود ہوتی تو اس کی شاعرانہ طبیعت خدا جانے کس کس انداز سے مجز بیان ہوتی ہرچند میں محسوس کرتا تھا کہ صابرہ اس کا بہترین نعم البدل ہے۔ لیکن پھر بھی اسکا ہر وقت کا قرب زندگی کو ایک رنگ بنادیتا تھا۔ جب تک فراق کے پرہیز لھے نہ ہوں حقیقی لطافت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ صابرہ نے مجھ سے کئی بار کہا کہ وطن واپس چل کر اس سفر کے دلچسپ کوائف کو بہت رنگین زبان میں قلمبند کر کے شائع کر دیا جائے۔ مگر مجھے یہ تجویز ناپسند تھی۔ حقیقت میں رومان پیدا کرنے کی کوشش تاریخی میں روشنی کی تلاش کے مترادف ہے۔ چنانچہ اسی اختلاف پر ہم دونوں میں کئی مرتبہ معمولی جھیلش بھی ہو گئی۔

ایک روز دوپہر میں کچھ زیادہ دیر سو لینے کی وجہ سے کافی دیر تک نہیں نیند نہ آئی۔ اس لئے کشتی کے کھلے حصہ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ — آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے۔ چاند کی روشنی تمام سطح آب پر چٹکی ہوئی تھی۔ کائنات کا ہر ذرہ اکتساب نور کر کے چمک اٹھا تھا۔ ہوا کے جھونکوں میں بھی ایک شوخ حسینہ کی طرح اٹھکیلیاں کرنے کی قوت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ زندگی کا مقصد صرف یہی ہے کہ چاندنی رات دور یا جھیل کا کنارہ، چھوٹی سی کشتی، شعر و موسیقی اور ان سب سے زیادہ ایک نسوانی پیکر آغوش میں ہو اور بس۔ صابرہ کی زلفیں منتشر ہو ہو کر بازوؤں پر بکھر رہی تھیں اور سادی کے پلو بار بار سرک کر سیٹھے کو عریاں کئے دیتے تھے۔ اس کی ہر چیز میری اور صرف میری ملکیت تھی۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے جائزہ چیزیں بھی ناجائز ہو کر رہ جائیں۔ میں اپنے

نفس پر جبر کئے بیٹھا تھا کہ انضباط جذبات کی کیفیات سے بخوبی لطف اندوز ہو سکوں۔ مگر اس کے جسم کی متفاطیسی قوتیں مجھے اپنی طرف بھینچ رہی تھیں اور میں ایک خواب بیداری کے دیکھنے میں محو ہو گیا تھا کہ اچانک اس نے میرے اٹھنا کہ کو توڑ دیا۔ وہ کہنے لگی۔

”آسمان کی طرف تکتے تکتے میری گردن میں درد ہونے لگا ہے۔ میں لیٹ جاتی ہوں اور تم بھی میرے قریب لیٹ جاؤ۔ لیکن خبردار! کسی قسم کی غیر شاعرانہ دست درازی نہ کرنا۔ آج کی سہانی رات میں نیند کی کیفیات طاری ہونے سے قبل میرے جسم کے کسی حصہ کو چھونا تمہارے لئے ناجائز ہے۔ اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا تو میں بگاڑ جاؤں گی۔“

سناٹا کرنے؟

یہ کہہ کر وہ اپنے ہی بازو پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور نظر جاکر قدرت کی لامحدود فضا میں رقص کرنے والی آسمان کی غیر مرئی مخلوق سے ہمکلام ہوتے ہوئے گنگنا لے لگی۔ کائنات کا ہر ذرہ اس سے ہم آہنگ ہو کر داد موسیقی دینے لگا۔ اس وقت مجھے جگہ کا یہ شعر یاد آ گیا۔

فضا یہ نغموں سے بھر گئی ہے کہ مون دریا ٹھہر گئی ہو

سکوت نغمہ بنا ہوا ہر وہ جیسے کچھ گنگنا رہے ہیں

میری روح کی خوابیدہ حسرتیں ایک ایک کر کے بیدار ہونے لگیں ہیں نے آرزو کی کہ اپنے وجود کو ایک باب کی شکل میں تبدیل کر کے اس کے ان ہاتھوں میں پہنچا دوں جو خاموش نغموں کو تال دینے کے لئے چٹکی جچانے میں مصروف تھے۔ مگر اس کی برہمی کے خیال سے ہمت نہ پڑی اور صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کیا۔

”میری جان! ذرا اونچے سروں میں گاؤ تاکہ میں بھی تمہارے لحن عبودیت سے لطف اندوز ہو سکوں۔“

”او نہہ!“ اس نے گردن موڑتے ہوئے کہا۔ ”پھر کسی وقت دیکھا جائے گا فی الحال میں اپنے ہی نفس کو محفوظ کرنا چاہتی ہوں، تم بھی الگ لیٹ کر کیوں نہیں گنگنا لگتے؟“

عین اس وقت مجھے کچھ دل لگی سوچی اور فوراً تال اور سر سے قطع نظر نہایت بے ہنگام آواز میں الاپنے لگا۔ اس قدر بلند آواز سے کہ قریب کے گھوسلوں میں بسیرا لینے والے کسی پرندے ڈر کر اڑ گئے۔ مجھے خود اپنی اس حرکت پر سہسی آگئی۔ قہقہوں سے تمام فضا گونج اٹھی۔ صابرہ تیوری پر ہل ڈال کر اٹھی اور کمرے کے اندر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور آغوش میں لے کر اس زور سے بھینچا کہ وہ سسکایا بھرنے لگی اور اس کے ساتھ ہی میرا شوق بنیابی وہ سب کچھ کرنے لگا۔ جو خلوت سے متعلق ہونے کے باعث اس سرگزشت میں قلمبند نہیں کیا جاسکتا اس نے سختی کے ساتھ میرے ہاتھ کو جھٹک دیا اور تڑپ کر پہلو سے مکل گئی، ہیجان تنفس سے اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ غصہ کے مارے تمام چہرہ ممتا اٹھا۔ ”نہیں خشکیاں، تیوری پر ہل، نہایت ترشرویٰ سے بولی :-۔“

”تم مرد لوگ کس قدر خود غرض ہوتے ہو۔ موقع و محل کی نزاکت کا کبھی خیال نہیں کرتے۔ نفسانی خواہشات تم کو بہت جلد مغلوب کر دیتی ہیں تم فضا کی شعریت و الوہیت کا احترام نہ کرتے ہوئے اس کا خون کر ڈالتے ہو۔ غیر شاعرانہ حرکتیں تو اپنے وطن میں بھی ہو سکتی تھیں۔ پھر کشمیر آئے گا کیسا مقصد ہے۔ اچھا دو روز تک مجھ سے ہم کلام ہونے کی کوشش نہ کرنا۔“

میں چونک پڑا۔ صابروہ کی برہمی مزاج سے ڈر کر نہیں بلکہ قوت تخیل سے بچے کسی دوسری نگری میں لے گئی۔ اس نگری میں جہاں میری روح کی میتیاں سیاہ آسودہ خواب تھیں وہ اظہارِ ناراضگی کہہ رہی تھیں۔ مگر میں الفاظ کی کڑکھی پر توجہ نہ کرتے ہوئے اس کے صرف نفسِ مضمون میں کسی دوسری ہستی کا اندازِ محکم محسوس کرنے لگا تھا۔ بالکل رتنِ بانی کے سے خیالات تھے اس کا فلسفہ حیات بھی ایسی ہی شعریّت سے لبریز ہوتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ صابروہ نے بھی ضرور رتنِ بانی کے ادبی مضامین کا دقیق مطالعہ کیا ہے یہی وجہ ہے کہ خیالات میں اس قدر ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

جب میں اپنی محویت کے استغراق سے ابھرا تو وہ کشتی کے اندر دنی خند میں جا چکی تھی مجھے اپنی غلطی کا کچھ کچھ احساس ہوا اور اسی لئے کہ اس کو مناووں لپک کر اس کے پیچھے گیا۔ مگر کمرے کے کواڑ اندر سے بند ہو چکے تھے اور صرف سسکیوں کی آواز باہر آرہی تھی۔ ایک محبوبِ ہستی کی گریہ دزاری کوئی سخت سے سخت دل انسان بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور تمام جسم لرز کر رہ گیا۔ میں سخت نادوم تھا۔ میں نے اس کے معصوم جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔ ات! وہ رو رہی تھی۔ بیشک مرد خود غرض اور نفس پرور ہوتے ہیں۔ ————— ملعون مرد —————

خبیث مرد ————— میں اپنے آپ کو ملعون کرنے لگا اور اعترافِ جرم کے طور پر اپنی اس کلانی پر کاٹ لیا جس نے صابروہ کی گردن میں حائل ہو کر کے لئے دستِ درازی کی تھی۔ لیکن یہ پاداشِ ناکافی تھی۔ انقباضِ روح کے مقابلہ میں جسمانی تکلیف کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اس کا علم ہوا کہ عورت کی ذہنیت سمجھنی مرد کے لئے

دشوار ہے۔ خواہ وہ اس کی شریک حیات ہی کیوں نہ ہو۔ از دو اجی زندگی بسر کرتے ہوئے مجھے دو سال ہو گئے تھے اور صابرہ کی طبیعت سے ہنوز نا آشنا تھا۔ لہذا میں نے وہیں کھڑے کھڑے مصمم ارادہ کر لیا کہ اسی روز بلکہ اسی لمحہ سے اس کی ذہنیت کا مطالعہ شروع کر دینا چاہیے اس ضمن میں مجھے یہ راز معلوم تھا کہ عورت کے ساتھ جس قدر زیادہ محبت کا اظہار کیا جائے اتنا ہی وہ اپنی ہستی کو خود بے نقاب کرنی چلی جاتی ہے۔ پہلے میں نے یہ خیال کیا کہ اس کو کچھ دلاسہ دینے کے لئے کسی طرح کو اڑوں کو کھول لینا چاہیے۔ مگر پھر خاموش ہو گیا کہ ایسے وقت جب کہ اس کے جذبات برا بھلا سمجھتے ہوں اس کو اسی کے حال پر چھوڑ دینا مناسب ہے۔ کیونکہ یہ ایک نفسیاتی نقطہ ہے کہ آنسوؤں کے بہ جانے سے دُور جوشش سرد پڑ جاتا ہے۔

دوسرے روز اس نے میرے ساتھ ناشتہ کیا نہ کھانا کھایا۔ میں نے جی غاہری بے رخی سے کام لیا اور کوئی بات نہیں کی۔ تمام دن وہ اپنے پننگ پر دوڑنے سے منہ ڈھانکے پڑی رہی اور میں کتاب کے ایک ہی صفحہ کا بار بار مطالعہ کرتا رہا۔ کیونکہ توجہ دوسری طرف ہونے کے باعث ایک لفظ بھی ذہن نشین نہ ہوتا تھا۔ شام کی چہل قدمی کا وقت آیا اور گزر گیا وہ لباس تبدیل کر کے باہر نہ نکلی۔ میں بھی تفریح کے لئے کہیں باہر نہ گیا۔ کیونکہ یہ کسی طرح گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اس کو تنہا چھوڑ کر خود چلا جاؤں۔ ایسی بے رنگ اور خاموش زندگی سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ میری طبیعت آگتا سننے لگی۔ اب میں مجبور ہو گیا کہ کسی طرح صابرہ کو رضا مند کر لیا جائے۔

شام کا کھانا کھا کر وہ شتی کے کنارے کھڑی ہوئی موجوں کے سنگاؤں میں رقص کرنے والی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کا خاتمہ دیکھ رہی تھی۔ میں بے پاؤں اس کے پیچھے گیا اور نارنجی کے چھلکے کو دبا کر عرق سے اس کی آنکھوں کو بہا شوبہ کر دیا۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا — مسکرائی — پھر تیوری پر بل ڈالے اور کہا :-

میں تم کو منع کر چکی ہوں کہ دور و زنا گفتگو نہ کرنا ۛ

”بجا ارشاد ہوا ۛ میں نے ظاہری سنجیدگی سے کام لیتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے کہ نارنجی کے چھلکے کا پھوڑنا گفتگو کے تحت میں نہیں آ سکتا جبکہ کہ لب بھی نا آشنا ہے جنبش رہے ہوں ۛ

”ہاں میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ یہ گفتگو نہیں مگر موضوع گفتگو ضرور ہے“ اس نے ظاہری برہمی سے مسکراتے ہوئے کہا -

”خیر اس بحث کو ترک کر دو“ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

اور مجھے اس شعر کا مطلب سمجھا دو ۛ

لبوں پہ موج تبسم نگہ میں برق غضب کوئی تباہی یہ انداز برہمی کیا ہے اس کی ظاہری ناراضگی کا نقاب آنا دبیز نہیں تھا کہ اس میں سے تبسم کی جھلک نمایاں نہ ہوتی - میں نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگالیا کہ وہ خود صلح کر لینے کے لئے آمادہ ہے۔ مگر بات کی بیچ میں خود داری مانع کلام ہے۔ میرا بر محل شعر سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ پھر اس کے آلسو بہہ نکلے اور ایک آرزوئے سپردگی کے ساتھ میری طرف بڑھی۔ میں نے غصے میں بائیں ڈال کر اسے گود میں اٹھالیا — عورت کو منانے کا یہی بہترین طریقہ ہو سکتا ہے — میں اس کے شانہ کو

تھپک تھپک کر اس طرح پیار کرنے لگا گویا وہ ایک کمن بچی ہے جس کو خاموش کرنے کے لئے بہلایا جا رہا ہے بہت جلد اس کے دل کا غبار اتر گیا اور وہ پہلے کی طرح ایک غنچہ بہار کی مانند بشاش و شگفتہ ہو گئی۔ اس لذت بازیافت کو وہی لوگ خوب محسوس کر سکتے ہیں جن کو اپنے کسی محبوب سے برہم ہونے کے بعد صلح کر لینے کا موقع نصیب ہوا ہو۔

بڑا فراس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کہ

اس کے بعد وہ بڑی دیر تک میرے آغوش میں رہی اور خوشی مجھے اجازت دیدی کہ میں ان آرزوؤں کی تکمیل کروں جن کی محض ابتدا سے وہ ایک روز قبل برہم ہو کر ناراض ہو گئی تھی۔ شاید تنہائی کے لمحات میں اس نے خوب غور کر کے یہ فیصلہ کر لیا ہو گا کہ زندگی کا اصل لطف اسی میں ہے اور اگر یہ کیفیات انسان پر طاری نہ ہوں تو اس کی نگاہ پر کلکتا کے ہرزوہ کو گھن لگ جاتا ہے۔

میں نے محض چھڑنے کی غرض سے پہلو میں گدی گدی کرتے ہوئے اس سے پوچھا ”بتاؤ آج“ شعریت و موسیقیت“ کی فضا کا خون کس نے کیا؟ تم نے یا میں نے؟“

اس نے شرمناک پہلے میری طرف دیکھا۔ کچھ مسکرائی۔ پھر نظریں جھکا کر گھونگٹ کے اوٹ میں کروٹ بیٹے ہوئے منہ پھیر لیا۔ گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ گئی ”کہ اس کے ذمہ دار دونوں ہیں“

رات کو سونے سے قبل صابرہ نے مجھ سے دوبارہ کہا :-  
”پہلے میرا خیال تھا کہ اس سفر کے واقعات کو ایک انسانہ کی شکل

میں لکھا جائے۔ لیکن اب میں سمجھتی ہوں کہ کئی رومان ایسے پیدا ہو گئے اور آئندہ بھی بہت سے مزید واقعات کے ظہور پذیر ہونے کا امکان ہے۔ اس لئے کیدیاں نہ ایک مکمل ناول لکھا جائے جس میں تم میر و بنو اور میں میر و سن، اصل واقعات کے ساتھ افسانوی رنگ پیدا کرنا ضروری ہو گا۔ ہماری بہت سی تصویریں جو یہاں اتاری گئی ہیں اس میں کام آجائیں گی۔ لیکن دیکھو کل اور آج کے واقعات کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ کیونکہ ان سے تمہاری کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ ہمارے ناول کے دو بڑے باب ابھی پر مشتمل ہوں گے اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ تمام ناول تم اکیلے لکھ دو، اور میں معمولی طور پر دیکھ لوں۔ یا میں تنہا تحریر کر دوں اور تم سہ سہی نظر ڈال لو۔ بلکہ ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ بیٹھ کر ہم دونوں مشترکہ طور پر لکھا کریں گے۔ اس میں ہمارے ذاتی تاثرات ہوں گے اس لئے ایک دوسرے کا مشورہ ضروری ہے۔ منظر کشی کا کام میرے ذمہ ہو گا۔ میں طرزیان میں نطق سے لبریز شعریت اور بندش الفاظ میں خاموش ساقبت پیدا کر دوں گی۔ مزاجیہ رنگ کی چاشنی تمہارے سپرد ہے کیونکہ تم اس میں کمال رکھتے ہو۔ تمہارے بعض چھبے ہوئے جملے ادب کی معراج مچتے ہیں۔ فی الحال ہماری کوئی اولاد نہیں اور نہ ہم کو اس کی تمنا ہے مگر فحش طور پر ہمیں اپنے دو چار بچے بھی ظاہر کرنے ہوں گے تاکہ ان کی شوخیاں اور شرارتیں بیان کی جاسکیں۔ بسا اوقات بچے بھی ایسا رومان پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کی توقع بڑوں سے ناممکن ہے.....

اس کے بعد بھی خدا جانے وہ کیا کہتی رہی اور کب تک کہتی رہی ہیں سوچا تھا چنانچہ جب اس نے گھر دن پکڑ کے مجھے اٹھا کر بٹھا دیا، تب

مجھے معلوم ہو سکا کہ مجھ سے کس قسم کی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ تاہم اس نے ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہ کہا بلکہ خاموشی کے ساتھ صرف محسوس کر دیا کہ اس کی گفتگو کے دوران میں مجھے نیند آگئی تھی۔ میں نے یقین کر لیا کہ آئندہ موقع پر اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ صابرہ کی یہ عادت تھی کہ وہ کسی بات کو بدلے لئے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ اس کی ایک سزا تو یہی ملی کہ میں صبح تک کہ وہ بیٹس بدلتا رہا۔ اگر کچھ نیند میں بیدار کر دیا جائے تو میں دوبا نہیں سو سکتا۔ تاہم وہ مجھے بھی بیکار نہیں گذرے۔ میں خوب عجز و خوص کرتا رہا کہ واقعی ناول لکھا جائے یا نہیں۔ خود میرا اشتیاق اور صابرہ کی فرمائش اس کے حق میں ترغیب تھی۔ لیکن یہ خیال زبردست طریقہ پر مانع تھا کہ رتن بانی کا کہ دار اس کے اندر کس شکل میں پیش کیا جائے بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں ان لمحات کو یکسر نظر انداز کر دوں جن میں اس کی یاد نے بچے لذت درد پہنچا کر بے چین کیا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اگر ناول لکھا گیا تو ان تاثرات قلبی کو ضرور ظہور میں لائے گا خواہ صابرہ بظن ہو کہ اپنے اندر رقابت کی آگ ہی کیوں نہ بھڑکالے۔ ہر چند وہ میری شریک حیات تھی مگر میری روح پر اس کا قبضہ نہیں تھا۔ یہ حق صرف رتن بانی کا تھا۔ میری نادیدہ رتن بانی کا۔ جس کے شاعرانہ فلسفے میں مجھے زندگی کے راز پہنچانے نظر آتے ہیں۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اگر وہ میری شریک حیات ہو جائی تو اس کی ہم جیسی سے لطف اندوز ہو کر میں سماوی مخلوق کی باہمی گفتگو کو سن لیا کرتا۔

شام کا وقت تھا۔ آفتاب کی سنہری کرنیں پہاڑیوں کے عقب میں آنکھ جھولی کھیل رہی تھیں۔ کبھی نظر آئیں کبھی روپوش ہو جاتیں۔ دن کا آخری جلوہ

مبند درختوں کی ہوا سے تھر تھراتی ہوئی پھنگلوں پر ہنوز رقص کر رہا تھا۔ کہیں کہیں جھیل کے پر سکون پانی پر شعاعیں منعکس ہو کر چکا چوند پیدا کر رہی تھیں صابرہ کی طبیعت کسی قدر ناساز تھی۔ اس لئے میں گشتی سے نکل کر جھیل کے کنارے کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے ٹہل رہا تھا چچوٹ کے افسانے اپنی نوعیت کے لحاظ سے دنیائے ادب میں بے مثل ہوتے ہیں۔ واقعات روزمرہ کے نفسیاتی پہلوؤں کو اس عمدگی سے بے نقاب کرتا ہے کہ انداز بیان داد سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ میں مطالعہ میں اس قدر محو تھا کہ قرب و جوار کی رنگینیاں میری توجہ کو اپنی طرف مائل نہ کر سکیں۔ میں ایک استغراق کے عالم میں دوزخ میں گیا اور یہ معلوم بھی نہ ہو سکا کہ کس قدر فاصلہ طے کر لیا ہے۔ کہ اچانک مجھے ایک ہلکی چیخ سنائی دی۔ میں چونک پڑا۔ نظر کے سامنے کچھ نہیں تھا۔ البتہ بائیں جانب پتوں کی اوٹ میں کوئی حرکت کہ تاہوا دکھائی دیا۔ میں جلدی سے ڈالیوں کو ہٹا کر قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک خوب صورت نوجوان خاتون گلاب کے پودے کے پاس گھٹنے ٹیکائے کھڑی تھی وہ اپنی انگلی کو ————— جس میں غالباً کانٹا چبھ گیا تھا ————— دبا دبا کر آرام پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دامن میں چنے ہوئے تمام پھول گھاس پر کچر گئے تھے۔ میں نے بطور ہمدردی حادثہ کی نوعیت دریافت کی۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ صرف انگلی کو میری طرف بڑھا کر نظریں نیچی کر لیں۔ کوئی بڑا زخم نہیں تھا۔ معمولی خراش تھی۔

میرا معمول ہے کہ دوران سفر میں ہمیشہ ایک جیبی ادویاتی بجس اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ لہذا اس کو کھول کر تھوڑا ٹیچر اس کی انگلی پر لگا دیا اور کس کر پٹی باندھی۔



مختلف رنگ کے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ میں متعجب ہوا کیونکہ صابروہ خود قریب کی کیار یوں سے پھول توڑ لاتی تھی۔ اس سے قبل کبھی بانڈا رے نہیں خریدے گئے تھے اور نہ اس قدر نفاست کے ساتھ ٹوکری میں سجا کر رکھے گئے تھے۔ میں نے دریافت طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جس کے جواب میں وہ بولی :-

”تمہارے لئے تحفہ آیا ہے“

”تحفہ! اور میرے لئے؟“ میں نے تعجب سے پوچھا ”کس نے

بھیجا ہے؟ اس سرزمین پر مجھ سے کوئی واقف نہیں“

”مجھے قبل اے قریب مت کہو۔ اگر کسی سے شناسائی نہیں

تو بتاؤ کہ پرسوں شام تمہاری نوازشوں سے کون فیضیاب ہوا تھا؟“

اٹ! مجھ پر گویا بجلی سی گم پڑی۔ اپنی حماقت کا افسوس ہوا کہ آخر وہ معمولی واقعہ پہلے ہی سے صابروہ کے گوش گزار کیوں نہ کر دیا۔ میرے حواس مختل ہو کر رہ گئے۔ قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔

”زبان سے کچھ نہ کہا جائے تب بھی آنکھوں کی وحشت اور چہرے

کے اڑے ہوئے رنگ سے کیفیت قلب معلوم ہو جاتی ہے۔ تم نہیں

بوتے نہ بولو لیکن یہ پیام ضرور سن لو“ اور یہ کہہ کر اس نے کاغذ کا چھوٹا

سا پرچہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے لے کر پڑھا۔ لکھا تھا :-

”پرسوں شام آپ کی نوازشات کا شکریہ ادا کرنا یاد نہیں رہا۔ معاف

کیجئے۔ آج ایک حقیر تحفہ اظہار تشکر کے طور پر ار سال خدمت ہے قبول

فرمائیے۔

میری قسمت سدا ہنی پائیں یہ رنگ تبول پھول کچھ میں نے چنے ہیں انکے اس کیلئے

تمام حقیقت واضح تھی۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اب صابراہ کو اس تاریکی میں رکھوں۔ لہذا بے کم و کاست سب واقعہ بیان کر دیا اور ساتھ ہی یقین دلایا کہ میرے دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ میری باتوں سے اس کے چہرے کے لال میں کمی ہو گئی۔ مگر تیوری کے بل بانی رہے اس کا دل صاف نہیں ہوا تھا۔

چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک لڑکا بھاگا ہوا آیا۔ معاف کیجئے! میں غلطی سے پھولوں کی ٹوکری آپ کو دے گیا۔ میرے مالک نے تو برابر کی کشتی میں بھیجے تھے۔“

میں نے دوبارہ پرچہ پڑھا۔ کسی جملہ کی ترکیب سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ مخاطب مرد کی طرف سے عورت کے نام ہے یا عورت کی طرف سے مرد کے نام۔ صرف شعر کے نفس مضمون سے یہ کہا جاسکتا تھا کہ پھول عورت کے دامن کے لئے موزوں دل ہوتے ہیں اور اس لئے تحفہ مرد کی طرف سے ہو۔ افسانہ نگار نے بدست غلط فہمی تھی۔ میں پشیمان تھا کہ محض مغالطہ کی بنا پر پرسوں شام کے راز کو کیوں منکشف کر دیا۔ مجھے سخت غصہ آ رہا تھا میں نے گلاسٹون کو نوچ کر پانی میں پھینک دیا۔ پرچہ کو بھاڑ ڈالا اور اس لڑکے کو خوب زد و کوب کر کے دل کی بھڑاس نکالی اور اگر خود صابراہ مانع نہ ہوتی تو میں جا کر اس کے مالک کو بھی دھمکاتا۔

صابراہ کا دل صاف ہو گیا تھا مگر پھر بھی وہ میری طرف سے بدظن ہو گئی اور ان ہی شکوک کی بنا پر بہت جلد وطن واپس چلنے کی ٹھہرادی علاوہ انہی رات کو کئی بار اس نے دبے پاؤں اپنے پلنگ سے اٹھ کر مجھے دیکھا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ میں موجود ہوں یا نہیں، مجھے بھی نیند نہیں

آئی تھی اس لئے اس کی نقل و حرکت کو محسوس کرتا رہا۔

ارض کشمیر کی ترنم ریز موسیقی اور شعر و رومان سے لبریز فضا کو خیر باد کہہ کے ہم واپس آگئے تو میری ڈاک پر "سنسر" ہونے لگا۔ جب تک میرے خطوط کو صابرہ نہ پڑھ لیتی وہ مجھ کو نہ دے جاتے۔ پہلے تو میں نے خیال نہ کیا بعد میں بہت ناگوار محسوس ہونے لگا۔ آخر میں اس کے تابع ہو کر زندگی کیوں بسر کروں؟ لہذا ایک دن میں نے سختی کے ساتھ تنبیہ کر دی کہ وہ میرے خطوط کا جائزہ نہ لیا کرے۔ چونکہ اب تک کسی خط میں کوئی بات قابل گرفت نہ تھی اس لئے صابرہ محسوس ہو گئی اور اپنے رویہ کو تبدیل کر لیا۔

روزمرہ کے ان تنازعات کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ آپس میں کشیدگی شروع ہو گئیں۔ بظاہر وہ مجھ سے خوش تھی اور میں اس سے مسرور۔ لیکن درحقیقت ہم دونوں ایک دوسرے سے اکتا گئے تھے۔ اکثر میں اور صابرہ کچا بیٹھ کر ان مسائل پر غور بھی کرتے لیکن بے سود۔ وہ مجھ کو قصور وار ٹھہراتی اور میں اس کو ذمہ دار۔ تاہم ہماری بس ان بن کا چرچا ہمیں تک محدود رہتا۔ عزیز اقارب میں سے کسی کو کالوں کا نہ خبر نہ ہوتی۔ کیونکہ ہماری رنجش دیر پا نہ ہوتی تھی۔ صبح کو لڑائی ہوتی تو شام تک صلح ہو گئی اور شام کو جھگڑا ہوا تو صبح مل بیٹھے البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اس نے اپنے میکے کے قیام میں اضافہ کر دیا۔ لوکل سٹریل سے بڑا نقص یہی ہوتا ہے۔

کبھی کبھی جب ہم دونوں میں زیادہ صلح ہوتی تو صابرہ مجھ سے فرمائش کرتی کہ سفر کشمیر کے حالات کو ردائیت کے رنگ میں تحریر کر کر ناشر شروع کر دیا جائے لیکن میں اس کی شرکت نہیں چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں تنہا اس

روماد کو قلمبند کروں۔ اس لئے ہمیشہ ٹال دیتا۔ وہ بہت بگڑتی لیکن میں کسی نہ کسی طرح اس کی برہمی کو عارضی طور پر دور کر دیتا۔ چنانچہ ایک دفعہ اس موضوع پر جھگڑا ہوا وہ میرے چلی گئی اور مجھ سے کہہ گئی کہ ایک ماہ سے قبل واپس نہیں آؤں گی۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ اعتراض کرتا۔ اس میں میرا کیا نقصان تھا بلکہ الشافئہ ہوا۔ یعنی مکان پر یار دوستوں کی نشست و برخاست زیادہ رہنے لگی۔ فرصت کا وقت لطف و نشاط کے ساتھ گزرنے لگا اور مصنون نگاری کے لئے بھی خوب موقع مل گیا۔

انہی دنوں میں نے سوچا کہ یہ فرصت کا وقت غنیمت ہے۔ صابراہ کی غیر موجودگی میں کشمیر کا افسانہ شروع کر دیا جائے اس کی واپسی تک ختم ہو جائے۔ دل میں ارادہ کا پیدا ہونا تھا کہ اس لئے عملی صورت اختیار کر لی۔ سفر کی غرض و غایت، راستہ کی دلچسپیاں، سری نگر کا قیام، وہاں کی دلفریب فضا، قدرتی مناظر، صابراہ کے ساتھ شاعرانہ مکالمے، چاندنی رات کی تقویٰ شکن کیفیات، میری درست درازیاں اور اس کا بگڑ جانا، ناز واداعشوہ وانداز، صابراہ کی موسیقی پر تقریبی تبصرہ، پھول توڑنے والی خاتون سے ملاقات، تحفہ گل کی غلط فہمی اور ان سب سے زیادہ رتن بانی کی روح فرسا یاد۔۔۔۔۔ غرض یہ کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ میں نے اپنی طرز تحریر کے تمام رنگ ان نقوش میں بھر دئے منظر کشی کے وقت اچھوتے استعاروں اور جدید تشبیہوں کے ذریعہ نثر میں شاعری کا لطف پیدا کر دینا اہم مسائل کا تجربہ کرتے وقت فلسفیانہ مسانت و سنجیدگی خوش مذاقی کی باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے نہایت مزاحیہ اور ظرافت سے

بریز تر پادینے والے جملے، باہمی مکالموں اور گفت و شنید میں ڈرامائی کش مکش، ضرورت وقت کے لحاظ سے لیند یا یہ اشعار کا استعمال، نیز جو قصائد نفس معنوں سے متعلق ہو سکتی تھیں ان کے بلاگ بنوائے۔

سب کام تیار تھا، صرف دیباچہ کی ضرورت تھی۔ مناسب سمجھا کہ صرف یہ خدمت صابرہ کے سپرد کی جائے۔ انتساب کی بابت بھی سوچ لیا تھا کہ اس خاتون کے نام معنوں کروں جس کے ساتھ محض خط و کتابت کے ذریعہ غائبانہ تعارف کا شرف حاصل ہوا۔ اور جو نشو و نما پاکر محبت کی حد تک پہنچ گیا۔ مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ جس کو بھول چکا مگر بھر بھی یاد باقی ہے جس کو نظر سے نہیں دیکھا مگر صورت آشنا ہوں۔ جس کی آواز نہیں سنی مگر لب و لہجہ کی نزاکت کا علم ہے۔ جملوں کی ترکیب اور الفاظ کی تبدل اس طرح قائم کی تھی کہ صابرہ اور دوسرے قارئین کو بھی معلوم نہ ہو سکے کہ اس میں حقیقت جلوہ گر ہے۔ بلکہ ہر شخص اس تہد یہ کو بھی ایک افسانوی رنگ میں لیتا۔

اپنے کام سے فارغ ہو کر میں نے صابرہ کو بلائے کے لئے پیغام بھیجا۔ وہ شاید اسی کی منتظر تھی۔ فوراً چلی آئی۔ عارضی جدائی کا صدمہ بہت جلد غبارِ کدورت کو صاف کر دیتا ہے۔ نہایت گرم جوشی کے ساتھ ہم آپس میں نفل گیر ہوئے اور لذتِ التّشام حاصل کرتے ہوئے تجددِ محبت کر لی۔

رات کے وقت تمام مصروفیتوں سے سبک دوشی حاصل کرنے کے بعد میں نے اس طویل افسانہ کا مسودہ اس کے سامنے پیش کیا۔ وہ پہلے تو بالکل نہ سمجھی اور نہ سمجھنا چاہیے تھا۔ کیونکہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ کہ میں وہ افسانہ لکھ لوں گا جب کہ کئی بار اس کی فرمائشوں کو رد کر چکا تھا۔ میں

نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا کہ وہ ایک قصیدہ ہے خود اس کی ثناء میں۔ ایک سراپا ہے اس کے پیکر ناز کا، ایک حقیقت ہے انسان کے رنگ میں اور ایک رومان ہے اصلیت کے انکشاف کا۔

اس نے نہایت بے تابی کے ساتھ مسودہ کے اوراق اٹے کہیں کہیں سے چند سطور کا مطالعہ کیا، میں نے دیکھا اس کے چہرے کا رنگ اڑ رہا تھا اس کی تیوری پر بل آ رہے تھے۔ آنکھوں سے غصہ ٹپکنے لگا۔ ہونٹ کھینچنے لگے۔ تمام جسم میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ سینہ کا شیب و فراز بتا رہا تھا کہ اس کے تنفس کا پیچان قلب کی حرکت کو بند کر دینے کی حد تک تجاوز کر گیا تھا اٹ! اس کے جذبات کی براہِ بخشنی ناقابلِ بیان تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے زندگی میں پہلی مرتبہ میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا۔

”شیم! اس انسان کو لکھنے کی تجویز میری تھی۔ تم اس کو دائرہ عمل میں لے آئے اس طرح کہ اس میں حصہ لینے کا مجھے حق بھی نہ دیا۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ یہ مشروط طور پر قلم بند کیا جائے گا۔ کیا میں تمہاری رفیق حیات نہیں ہوں؟ پھر کیا وجہ ہے کہ تم نے مجھے نظر انداز کر دیا؟ میری شخصیت کی مطلق پرواہ نہ کی میرے سینے میں بھی ایک دل ہے ایک روح رکھتی ہوں۔ تم چاہتے ہو کہ میں صرف دیباچہ لکھ دوں تم نے مجھے ٹھکر دیا ہے میری تمناؤں کو پامال کر دیا۔ اور میں تمہارے اسلوب بیان کی تعریف کروں۔ میری آرزو تھی کہ اس کے سرورق پر تمہارے ساتھ میرا بھی نام ہو ہمارے مضامین اب تک مشترکہ طور پر لکھے گئے تھے۔ اب افتراق کیوں ہو میں اس رمز کو سمجھتی ہوں۔ میں کچھ عرصہ سے تمہارا مطالعہ کر رہی تھی۔ مجھے

اصل حقیقت کی اطلاع مل گئی ہے کہ شادی سے قبل تمہاری نظر انتخاب نے کسی دوسری خاتون کو اپنا مرکز بنا رکھا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون تھی اور کیا تھی۔ تمہارے خاندان کا ایک رکن تھی یا غیروں میں اس کا شمار تھا وہ اب کہاں ہے؟ مجھے اس کا بھی علم نہیں۔ میرا قیاس ہے کہ ارض کشمیر میں تحفہ بیچنے والی خاتون ہی تمہاری منظور نظر تھی۔ تم نے اپنی چالاکی سے مجھے فریب دیا۔ ایسی ترکیب کی کہ وہ گلدستہ واپس منگایا گیا اور میرے شکوک عارضی طور پر رفع ہو گئے۔ لیکن اب تمہارے پلٹے ہوئے تیور، پھری ہوئی نظریں، تمہاری بے رخی، بے التفاتی بتا رہی ہے کہ تم کسی نئی دنیا کی سیر کے آرزو مند ہو۔ شادی کے بعد دو سال تک میرے جسم سے تم اپنی خواہشات کی تسکین کرتے رہے۔ اب تمہارے جذبات تھک چکے ہیں۔ تمہارا جوش و ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ تم ایسی ہستی کے متنی ہو جو دوبارہ ان میں حرارت پیدا کر دے۔ بیشک میرے اندر کوئی جاذبیت نہیں رہی۔ کوئی کشش باقی نہیں۔ مگر ان رعنائیوں کو پا مال کرنے والے بھی تو تم ہی ہو۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ اپنے عیش و نشاط کے لئے دوسری شریک حیات حاصل کر سکتے ہو خدا کا شکر ہے میرے بھائی زندہ ہیں۔ میرے والدین حیات ہیں۔ میں اپنے دیرینہ عزیزوں میں زندگی بسر کر سکتی ہوں۔ تم خوش رہو۔ تمہارے لبوں کے تبسم پر اپنے آنسوؤں سے جلا دیتی رہوں گی۔

وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے اور میں بت بنا خاموش کھڑا تھا۔ میرا دماغ ماؤٹ ہو چکا تھا وہ اپنے فعل سے معذور تھا۔ قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ بولنا چاہا مگر زبان نے جنبش نہ کی۔ سوجھا

رہا سوچتا رہا۔ کہ آخر یہ کیا ہو گیا۔ مگر عقل کام کرنے سے عاجز تھی۔  
 رات کے ناقابل برداشت لمحے میں نے آنکھوں میں سہرے اور شاہ  
 وہ بھی تمام شب روئی۔ اس کی سبکیاں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ علی الصبح  
 وہ اٹھی اور مجھ سے گفتگو کے بغیر ملازم سے "انگہ منگا کر اپنے میکے چلی گئی۔"

صاحبہ کے چلے جانے کے بعد میں عجیب کش کش میں مبتلا ہو گیا۔ کئی  
 بار ارادہ کیا کہ اپنے قصور کا اعتراف کر کے اپنی غلطی کو تسلیم کر کے اسوئلاؤں  
 کیونکہ دو سال سے زیادہ عرصہ میں اس کے جسم و روح کا مالک رہا تھا۔ عورت  
 تن کا پتھر نہیں ہوتی جس کو استعمال کر لینے کے بعد جسم سے علیحدہ کر کے پھینک  
 دیا جائے اس کی ہستی قابل احترام ہوتی ہے۔ وہ شرابِ حیات کہلاتی ہے  
 اسے "نصف بہتر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن ضمیر کی اس آواز کو  
 خود داری کا احساس کچل ڈالنا۔ عورت کے مقابلہ پر ہار مان لینا ایک قسم کی سبلی  
 تھی جس کو دل نے گوارا نہ کیا۔ نیز یہ بھی سوچتا تھا کہ باہمی کشیدگیاں اس قدر  
 بڑھ گئی ہیں کہ اب مستقل مصالحت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے احتیاد  
 کی کوششیں بے سود سمجھی اور صرف اس امید پر خاموشی اختیار کر لی کہ شاید  
 طویل جدائی سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو جائے۔

یہ اصول ہے کہ جب انسان مسرت و انبساط کی خوشگوار فضا میں سانس  
 لیتا ہے تو اسے شاندار مستقبل خواب نظر آتے ہیں۔ لیکن برخلاف اسکے  
 جب اس کی روح مبتلائے آلام ہوتی ہے، جب مصیبتوں کا پہاڑ اس کے  
 سر پر ٹوٹ پڑتا ہے تو اسے عہد گذشتہ کے واقعات اس طرح دکھائی دیتے  
 ہیں جیسے گنبد میں صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ماضی کی ہر بات

اس کے لئے ایک افسانہ پارینہ بن جاتی ہے۔ وہ انھیں یاد کر کے آنسو بہاتا ہے۔ حادثات زندگی بھی اسے نعامِ دنیوی معلوم ہوتے ہیں۔

اس دفعہ صابرہ کے چلے جانے کے بعد میری آنکھوں میں دنیا اندھیر تھی۔ نہ سیر و تفریح کو جی چاہتا نہ دوست احباب کی صحبتوں میں مسرت حاصل ہوتی۔ ہر وقت تفکرات کے عالم میں غرق رہتا۔ سوچتا تھا کہ زمانہ کارنگ کیا تھا اور اب کیا ہو گیا۔

ایک بار پھر رتن بانی کی یاد مجھے ستانے لگی۔ اپنی اس کوتاہ اندیشی پر نادم تھا کہ میں نے اس کے لطیف خط و کتابتوں کو بھلا دیا۔ اگر وہ موجود ہوتے تو میرے زخمِ دل کی میحالی کرتے۔ انھیں بار بار پڑھتا اور عہدِ شباب کی ان رنگینیوں سے خطا اٹھاتا جو کبھی میرا بھی حصہ رہی تھیں۔ لیکن نہ وہ خطوط باقی تھے اور نہ رتن بانی کا کچھ پتہ معلوم تھا۔ وہ کس شہر کی رہنے والی تھی۔ کس خاندان کی رکن تھی میں لاعلم محض تھا۔ اس سے دوبارہ ملنے کی کوئی امید بھی نہیں تھی کیونکہ رسالہ میکش سبڈ ہو چکا تھا جس کی معرفت ہماری خط و کتابت ہوتی تھی ایڈیٹر کے متعلق بھی کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ رسالہ کی اشاعت ترک کر کے کہاں گئے؟ بقیدِ حیات ہیں یا اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ کوئی دوسری ترکیب سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کس طرح اس معبود خیال کی بارگاہ میں پہنچوں بس تصورات کی دنیا میں ہر وقت اس کی یاد کو قائم رکھنا مقصدِ حیات بن گیا تھا گزارے تھے خوشی کے چند لمحے انھیں کی یاد میری زندگی ہے

ایک دن طبیعت بہت گھبراہٹ تو محض وقت گزارنے کی غرض سے چوک چلا گیا۔ اخبار والے کی دکان پر بے شمار رسالے رکھے تھے۔ ان میں سے چند

اٹھا کر میں نے درق گردانی شروع کر دی۔ اور کارلائل کے اس زرین قول کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ ”انسان کے احساسات اس قدر بلند و وسیع ہونے چاہئیں کہ وہ دوسروں کے کہنے ہوئے فرضی افسانوں میں خود اپنی زندگی کا مطالعہ کر سکیں میں نے کوشش کی کہ کوئی افسانہ یا مضمون ایسا نکل آئے جو میرے حسب حال ہو تو ایک رسالہ میں بھی خرید لوں

تجسس ہو تو مل جاتا ہر سب کچھ دار امکاں میں

اچانک میری نظر رسالہ رحیل کے ایک صفحہ پر پڑی۔ عرصہ دراز کے بعد رتن بانی کا مضمون شائع ہوا تھا اور یقیناً وہ صرف میرے لئے لکھا گیا تھا ظفر کی کی مشہور و معروف غزل کا یہ مصرعہ اس کا عنوان تھا۔

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بجلی کی ایک لہر تمام بدن میں دوڑ گئی۔ و فور شوق میں آنسو مچل جانے کے قریب تھے کہ میں نے ضبط سے کام لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پاس کھڑے ہو نیوالے لوگ میرے جذبات قلب کو سمجھ جائیں۔ مسکاشتق میں روا نہیں کہ اپنے درد دل کو سوائے درماں کے کسی دوسرے کے رد برو ظاہر کیا جائے۔ میں نے رحیل خرید لیا اور فوراً گھر کی راہ لی۔ تاکہ تنہائی میں اس کا مطالعہ کروں:- رتن بانی کا مضمون ایک خط کی شکل میں تھا۔ ————— نہایت دروہا

اور سوز سے لبریز —————

میرے لاپتہ معبود! کیا تو حقیقی معنوں میں معبود ہے؟ جو نظر نہیں آتا۔ تیرا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ شاید تو نے مجھے فراموش کر دیا لیکن میرے دل میں ابھی تک تیری یاد باقی ہے۔ تیرے نقوش محبت میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان کا وجود میرے لئے حیات انسا

ہے اگر اس دنیا میں تو کہیں ہے تو مجھ سے کیوں نہیں ملتا؟  
کیوں میرے محبوب؟

آہ! وہ بھی کیا دن تھے جب عہد شباب کی رعنائی خیال مجھ پر طاری  
تھی۔ میں اپنے اودام شریعت میں مبتلا تھی سمجھتی تھی کہ کائنات  
کا ہر ذرہ جو آج رنگین نظر آ رہا ہے ہمیشہ ایسا ہی رنگین رہے گا۔  
یہ میری کچھ فہمی تھی جس کا خیا زہ بگبت رہی ہوں۔

ہر چیز پر بہا رہتی ہر شے میں حسن تھا دنیا حسین تھی مجھے عہد شباب میں  
تو نے مجھ سے التجا کی کہ دونوں ایک ہی رشتہ میں منسلک ہو جائیں  
میں نے تیری تجویز کو ٹھکرا دیا اور شاید اسی پاداش میں آج میری  
آرزو میں پامال ہو رہی ہیں۔ اس وقت میں اپنے غلط پسند و  
میں از دو انج محبت کی قائل نہیں تھی سمجھتی تھی کہ شادی قاطع  
محبت ہے۔ اس لئے میں نے منظور نہیں کیا یہ رمز مجھے پہلے  
سے واضح تھی کہ شباب ہر لحاظ سے پامال ہو جاتا ہے ع

جوانی جذب ہو جاتی ہے آغوش جوانی میں  
لیکن عمیق النظری سے اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا تھا اب اس حقیقت  
کو سمجھی ہوں کہ غیر کے آغوش میں جذب ہو کر بھی جوانی بھل گئی ہو جاتی ہے  
مگر مجھ کو آغوش میں جب ہو کر بھی لڑج قلوب ترمیم دیتی ہو اور ان ت کا امکان ہونا کہ وہ پھر بھی  
نا نازک کا تخت اتر آئے اگر محبت ایک لا علاج مرض ہے تو یقیناً  
ایک مرتبہ ختم ہو جانے کے بعد بھی اس کو دوبارہ عود کرنا چاہیئے۔  
میرا فلسفہ تھا کہ جس شخص میں عمدہ شوہر بننے کی صلاحیت موجود  
ہو کبھی صدق دل سے محبت نہیں کر سکتا اور جس کے قلب میں قدرت

نے حقیقی محبت کا کرنے کا مادہ ودیعت کیا ہے شوہر بننے کی صورت میں ناکامیاب زندگی بسر کرنے کا۔ اس قول کا ابتدائی حصہ میری عملی زندگی میں ثابت ہو گیا۔ مگر دعویٰ ہے کہ باقی نظریہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ میرے شوہر میں سب خوبیاں موجود ہیں مگر وہ میرے جذبات کی قدر نہیں کرتا۔ وہ تصنع اور بناوٹ سے کام لیتا ہے اس کو مجھ سے حقیقی محبت نہیں اور وہ اس لحاظ سے کہ اس کی منظور نظر کوئی دوسری ہستی ہے جس سے میں واقف نہیں ۛ

میرے محبوب! اب میں تجھ سے صرف اس قدر چاہتی ہوں کہ میرے لئے کوئی ذریعہ تسکین پیدا کر دے تو ایک بار پھر میرے خاموش ساز دل کو اپنے مضراب خیال سے پھیل دے تو خود شعر نہ کہہ۔ لیکن میرے لئے موضوع شعر بن جا۔ تو اپنے فلک پیمائیاں سے مجھے اس نگری میں پہنچا دے جس کی فضا میں سانس لیکر مصلوب الحجابات لوگوں کے قلب میں بھی احساس شباب پیدا ہو جاتا ہے ۛ

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے  
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شرب کر دے  
بتا! میری روح کے مالک! کیا تجھ سے لئے کی کوئی تدبیر ہو سکتی۔ کیا  
میں دوبارہ اسی رومانیت کی فضا میں زندگی بسر کر سکتی ہوں آج  
میری شاعرانہ ذہنیت نغمہ بہار الاپنے کے بجائے خزاں کے  
ماتم میں مرثیہ خواں ہے۔ میری ترم دیزیاں سوز قلب میں ڈوبی

ہوئی ہیں۔ میرے تہقہ آنسوؤں میں جذب ہو کر رہ گئے ہیں میری  
 سہاگ کی راتیں سوگوار ی میں گذرتی ہیں تو ان میں تغیر پیدا  
 کر دے۔ میں اپنی زندگی میں زبردست انقلاب کی متمنی ہوں  
 — لیکن بغیر کسی محرک کے یہ ناممکن ہے — بتا! میرے  
 مالک تو میرے لئے کیا کر سکتا ہے۔ اگر تو مجھ سے مل سکا تو میں  
 ایک ایسے راز کا انکشاف بھی کر دوں گی جو آج تک تجھ کو معلوم  
 نہیں۔

تیری  
 ایک وارفتہ تخیل داسی

خود میرے آلام حیات ہی کیا کم تھے کہ رتن بائی کی داستان غم نے اور بھی  
 سوز قلب میں اضافہ کر دیا۔ میرا جی چاہا کہ اس کو اپنے ساتھ لے کر اس سرزمین  
 سے دور ایک ایسی مقدس نگری میں پہنچ جاؤں جہاں فرشتوں کے معصوم تبسم  
 کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ چونکہ سب سے پہلے اس سے ملاقات کرنی ضروری تھی  
 اس لئے تمام کام چھوڑ کر مدیر رحیل کی معرفت حسب ذیل سطور لکھ کر روانہ کر دیں  
 پیاری رتن!

رحیل نظر سے گزرا تھا تمہاری داستان غم سے جولنت درو میں نے  
 حاصل کی وہ احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ تم خود بتاؤ کہ میں تم سے  
 کہاں مل سکتا ہوں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ تمہارا وطن کہاں ہے  
 تمہارا قیام دنیا کے کسی حصہ میں کیوں نہ ہو میں بسرِ چشم پہنچ جاؤں گی  
 میں بھی تم سے ملنے کا متمنی ہوں چاہتا ہوں کہ ایک بار حقیقی طور

پر تمہاری شہریت اور موسیقیت سے لطف اندوز ہو سکوں۔  
 شاید یہ سن کر تم کو تعجب ہو گا کہ میری ازدواجی زندگی بھی نہایت  
 کوفت کے ساتھ گزر رہی ہے۔ درحقیقت میری بیوی تمہارے  
 شوہر کے لئے مناسب بھتی اور تم میرے لئے موزوں۔ مگر تمام  
 ازل کو یہ منظور نہ تھا۔ قدرت نے ایسے واقعات پیدا کئے۔  
 کہ معاملہ برعکس رہا۔ میں تم سے ملنے کے بعد تمہارے شوہر سے  
 بھی ملنے کی کوشش کروں گا۔ خدا کرے وہ میری مساعی سے  
 راہ راست پر آجائیں۔ عورتوں کی طرح مرد ضدی اور ہٹ دھرم  
 نہیں ہوتے وہ بہت جلد رام ہو جاتے ہیں۔ اگر میں تمہارے  
 تعلقات کو خوشگوار بنانے میں کامیاب رہا تو سمجھوں گا کہ میں نے  
 حق انسانیت ادا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے قوی امید ہے  
 کہ تم بھی میری شریک حیات کو اپنی بہن تصور کرتے ہو گے  
 سمجھاؤ گی۔ اچھا اب وقت تھوڑا ہے۔ لہذا مفصل گفتگو  
 کو اسی وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں جب کہ ہم دونوں ایک  
 دوسرے کے سامنے بیٹھ کر مسائل زندگی پر غور کریں گے  
 بناؤ میں تم سے کہاں ملوں؟

تمہارا نادیدہ بھائی

انجم جالی

خطرہ اُنہ کر کے یہ سوچنا شروع کیا کہ آئندہ سے لاکھ عمل کیا رہے۔  
 صابرہ سے واقعی علیحدگی گوارا نہیں تھی اور یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ رتن بائی  
 اپنے موجودہ خاوند کو چھوڑ کر میری شریک حیات نہیں بن سکتی کیونکہ مذہبی

رسوم کی قیود مانع آزادی تھیں۔ صرف یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ اسے اپنی تصور کرتے ہوئے ہر طرح کی امداد پہنچاؤں اور اگر ایشیا کی ضرورت ہو تو روح کی قربانی سے بھی دریغ نہ کروں۔

دوسرے روز میں کھانا کھا کر لیٹا تھا کہ مکان کے باہر تانگہ کے پہیوں کی آواز سنائی دی۔ اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر صابرہ اندر داخل ہوئی۔ مگر اس نے میری طرف بالکل التفات نہ کیا اور نہ حسب عادت سلام ہی کیا۔ بلکہ کمرے کے اندر جا کر لیٹ گئی۔ میں حیران تھا کہ آخر اس سے آنے کا مقصد کیا ہے۔ خود اس لئے مخاطب نہ ہوا کہ جب وہ بے رخی برت رہی ہے تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ رجوع کروں اگر وہ ناراض ہے تو میری برہمی بھی کچھ کم نہیں۔ میں نے سوچا کہ خاموشی اختیار کر لی جائے اور دیکھنا۔ چاہیے کہ کب تک اس کا غصہ فرو نہیں ہوتا۔ اب دل میں کوئی تمنا باقی نہیں تھی جو خوشامد کر کے اسے منالینے کی کوشش کرتا۔ میرے جذبات کو سخت صدمہ پہنچ چکا تھا اس لئے اس کا آنا یا نہ آنا برابر تھا۔ بلکہ حقیقت اس کے واپس چلے آنے سے روح کو کسی قدر اضطراب نصیب ہوا۔ کیونکہ گذشتہ واقعات کی یاد دل میں تازہ ہو گئی اس کا بار بار لڑنا جھگڑنا۔ معمولی باتوں پر ناراض ہو جانا، اس کی خشمگیں آنکھیں، تیوری کے بل، بے رخی بے التفاتی اور کچھ غور حسن بھی۔ یہ باتیں تھیں جن کا خیال کرتے ہی میرے دل میں نفرت کا مادہ پیدا ہو گیا اور میں نے تنبیہ کر لیا کہ ہرگز گفتگو نہیں کروں گا۔ تاوقتیکہ وہ خود اپنے مذموم طرز عمل کی بابت اظہارِ ندامت کرتے ہوئے آئندہ کے لئے تائب نہ ہو۔

رات زیادہ ہو گئی تو میں دوسرے بستر پر جا کر دراز ہو گیا۔ مگر نیند نہ آئی خاموش لیٹا کر ویٹس بدلتا رہا یہاں تک کہ نصف شب ہو گئی۔ میں اپنے خیالات میں محو تھا کہ صابروہ کے کمرے سے کچھ آہٹ سنائی دی۔ معافیاًں آیا کہ وہ بھی بیدار ہے۔ لیکن کیوں —؟ میری مشکوک طبیعت نہ مانی ارادہ کیا کہ اس کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔ وہ بستر پر لیٹی ہے یا کسی اور کام میں مشغول ہے۔ میں بہت احتیاط کے ساتھ بستر سے اٹھا اور اس دروازے کے قریب جو میرے اور صابروہ کے کمروں کے درمیان تھا جا کر کھڑا ہو گیا بھری میں سے جھانکا وہ بیدار ہی نہیں تھی بلکہ اپنی سنگار میز کے سامنے بیٹھی کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ اپنے زیورات لیے آئی ہے۔ جن کو یکے جاتے وقت یہیں چھوڑ گئی تھی لیکن اس کو زیورات کی کیا ضرورت — میری غیر موجودگی میں اس کا تزئین حال کس کے لئے ہو گا۔

ابھی میں اپنی خیال آرائیوں میں تھا کہ وہ کہ سی سے اٹھی اور میں نے چراغ کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کاغذات ہیں خط کی شکل میں۔ وہ مختلف رنگ کے لفافے تھے جن کو الٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی وہ پلنگ کی طرف بڑھی اور تمام پلندہ تکیے کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی میرے قلب میں تشنیک وارتیاب کا مادہ جو ش میں آ گیا۔ آنش رشک بھڑک اٹھی وہ کس کے خطوط تھے جہاں تک میرے علم کا تعلق تھا از دو اجی زندگی میں اس کے نام ایک کارڈ بھی نہیں آیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس راز کو معلوم کئے بغیر چین نہ لوں گا۔ چنانچہ شکار کے تھیلے میں سے ایک لمبا تیز چاقو نکال کر جیب میں چھپا لیا اور بھری کے قریب آنچھ لگا کر منتظر رہا کہ وہ کب

آسودہ خواب ہو اور میں اس کے کمرے میں داخل ہو کر ان خطوط پر قبضہ کروں میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو اسی رات اس کی زندگی کا خاتمہ کر دوں گا اور رتن بائی سے ایک بار ملنے کے بعد اپنا بھی۔ بہت رات گزر جانے کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ بیدار نہیں ہے تو کھڑکی کے راستے اس کے کمرے میں داخل ہو گیا اور چراغ کی مدھم روشنی میں ایک سایہ کی طرح حرکت کرتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا وہ بے خبر سو رہی تھی۔ چہرے پر اطمینان بلکہ ایک حد تک شگفتگی تھی۔ یا میرے تعصبات دماغی نے اس کو اس رنگ میں دکھایا۔ میرے ہاتھ نے دست عیب کی طرح بہت آہستہ جنبش کی۔ میں نے کہاں احتیاط سے اس کے تکیہ کو سرکا نا چاہا۔ وہ ایک دم چونک پڑی۔ ابھی اس کی نیند کچی تھی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اس نے کزخت لہجہ میں پوچھا:-

”تم! — تم میرے کمرے میں رات کے وقت بلا اجازت کیوں آئے؟“

”مجھے اس کا حق ہے“ میں نے تشریف سے جواب دیا۔  
”حق حاصل ہے۔ لیکن تکیہ کیوں اٹھا رہے تھے؟“ اس نے طنز کے طور پر کہا۔

”وہ خطوط جو تم نے اس کے نیچے چھپائے ہیں فوراً مجھے دیدو۔“ میں نے تحکمانہ لہجہ میں کہتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔  
”ہرگز نہیں۔ تم ان پر قبضہ نہیں کر سکتے۔“

”خاموش رہو ورنہ اس کا نتیجہ برابر ہے گا۔ میں عرصہ دراز سے تمہارے کردار کا مطالعہ کر رہا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ آج کامیاب ہو گیا۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کو ایک طرف دھکا دینا چاہا مگر وہ سینہ سپر ہو کر میرے مقابل آگئی۔

”مجھے مار ڈالو۔ لیکن میری زندگی میں تم ان کو نہیں چھو سکتے۔“

ایک عورت بکمزور عورت کے یہ الفاظ مجھے ناگوار معلوم ہوئے۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور پھر اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ مقابل کے کونے میں دیوار سے ٹکرائی۔ میں نے پک کر تمکبہ کے نیچے سے خط نکال لئے۔ وہ بھی بھوکھ شیرنی کی طرح میری طرف آئی اور ہم دونوں میں چھینا بھٹیٹی شروع ہو گئی۔ حتیٰ کہ میں ایک خط حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیا میں بھاگ کر چراغ کے قریب گیا اور اس کی مدھم روشنی میں پڑھا۔ اے! غضب خدا کا میرے اوپر گویا بجلی گر پڑی۔ میں سکتے کے عالم میں کھڑا کھڑا رہ گیا وہ میرا ہی خط تھا۔ میرے دستخط موجود تھے۔ ”انجم جالی“۔ القاب کی جگہ پیاری رتن“ تحریر تھا۔

اتنے میں صابرہ اپنے حواس درست کر کے قریب آگئی اور التجا کی کہ خط کا مضمون نہ پڑھوں۔ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔

”صابرہ! اس خط کا مکتوب الیہ کون ہے اور کہاں ہے؟“

”خود میں ہوں۔“ اس نے اپنی ضرب خوردہ کلائی کو دباتے ہوئے

جواب دیا۔ ”یہ میرا ہی نام ہے۔ خدا کے لئے مجھے واپس کر دو۔ ورنہ میں اپنا خون کمرہ ڈالوں گی۔“

”کیا تم ہی رتن بانی کے نام سے مضامین لکھتی رہی ہو؟“ میں نے پرشوق لہجہ میں دریافت کیا۔

”ہاں!“ اس نے حسرت بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں رتن

بانی کے فرضی نام سے مضامین لکھتی تھی۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“  
میرا کلا خشک ہو گیا۔ بڑی مشکل سے آواز نکل سکی ”صاحبزادہ! میں تمہارا  
انجم جمالی ہوں۔“

”ہیہ! انجم جمالی“

”ہاں میری پیاری رتن! تمہارا انجم جمالی۔ صاحبزادہ کا شبیم نہیں۔“  
ہم دوڑ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور سیلاب اشک سے غبار  
کہ درست کو دھو دیا۔ اس حجاب زندگی کا دور ہونا تھا کہ ہم پھر ایک ہو گئے۔ لیکن  
زیادہ استحکام اور یگانگت کے ساتھ اور آئندہ ہمارے افسانے ”رتن جمالی“  
کے نام سے شائع ہونے لگے۔

فضل حق قدشی دہلو

# تمسک حیات

..... ! شانتا !  
 تمہیں یاد نہیں شاید بھول گئیں دریاے راوی کے کنارے کی  
 ملاقات تم گارہی تھیں اور میں سن رہا تھا۔ تمہاری آواز کار  
 میرے کان پی رہے تھے اور میری روح اس کی کیفیت سے  
 مست ہو رہی تھی..... ایسی مستی جس کا آج تک آثار نصیب  
 نہیں ہوا۔ گیت تم نے خود سنا یا تھا میری فرمائش کے بغیر.....  
 پھر اب کیا ہو گیا ہے۔ وہی تم شانتا ہو اور وہی میں پریتی جب  
 شام کی سیاہی پھیلتے ہی کائنات ایک ٹھنڈا سانس لے کر خاموش  
 ہو جاتی ہے۔ میرا دل آرزوؤں سے لبریز دل اپنی ناکامیوں  
 کے افسانے دہراتا ہے۔ آنکھیں بند کر لیتا ہوں.....

تہا را خیال بندہ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم میرے پاس پہلو میں ..... دل میں بیٹھی ہوئی مسکرا رہی ہو۔ مگر جب آنکھ کھولتا ہوں سائیں سائیں کرتی ہوئی رات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا .....  
 مایوس تنہا

پریمی

لالہ فام اپنے فخر سے آراستہ کمرے میں لیٹی ہوئی یہ خط بڑی لمحسپی کے ساتھ پڑھ رہی ہے۔ ہر لفظ اور ہر فقرے پر اس کے چہرے کی شان بدل جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کہ اس خط کے لکھنے والے سے اسکا کوئی گہرا تعلق ہے "کس قدر دلفریب خط ہے یہ مصنوعی محبت کہیں رنگ نہ لائے۔ خدا معلوم یہ کون ذات شریف ہیں ..... خیر جو کچھ بھی ہو یہ کہتی ہوئی مسہری سے اٹھی۔ مسکرائی، انگڑائی لی اور ایک چھوٹی سی خوب صورت میز پر بیٹھ کر کچھ لکھنے لگی۔

لالہ فام اپنی زندگی کی چودہ منزلیں طے کر کے پچھلے ہی سال شباب کے طلسم میں داخل ہوئی ہے۔ آزاد خیال ماں باپ کی لاڈلی بیٹی، حسن و جمال کی ملکہ اور تعلیم یافتہ ہے۔ اچھے لباس کا شوق ہے۔ ساری خاص طور پر پسند ہے۔ شاعرانہ طبیعت پائی ہے۔ ہر وقت ادب لطیف کا شغل رہتا ہے۔ ملنے جلنے کی چور ہے۔ ہوا خوری کو بھی کسی کے ساتھ نہیں جاتی۔ کتاب کے سوا کوئی صحبت نہیں۔ مختلف ادبی رسالوں میں فطرت کے مصوروں کی "شاہکاریاں" دیکھ دیکھ کر اس کو بھی شوق ہوا۔ چھوٹے چھوٹے افسانے شروع کئے پھر "یلے کے خطوط" راجنھا کے سندیے

پڑھتے پڑھتے دماغ نے اس طرف توجہ کی۔ فرضی نام سے ایک فرضی طبیب قرار دے کر مصنوعی جذباتِ حسن و عشق پیدا کئے اور خطوں میں ان کا انجیل ہونے لگا۔ دو چار ہی ایسے خط بکھلے تھے کہ ایک صاحبِ جواب دینے والے بھی پیدا ہو گئے رفتہ رفتہ اس مجاز میں کچھ حقیقت کی جھلک بھی پیدا ہونے لگی۔

تنہا عشق از دیدِ اَرخیزد بسا کیس دولت از گفتارِ خیزد  
کے رومی مقولے کے مصداق گفتار تو گفتارِ قلم کی ادبی رفتار نے دلوں میں ایک چٹیک سی لگا دی۔ بغیر دیکھے، بلا تعارف، بے سمجھے بوجھے محبت کا آغاز ہو گیا اور ان ہی فرضی ناموں سے بذریعہ ڈاک نگاہوں اور دلوں کا تبادلہ ہونے لگا۔

پریم بھاری !  
مجھ کو کیا یاد نہیں؟ سب کچھ یاد ہے۔ کہو تو کہوں۔ سنو تو سناؤ  
کاش یہ پردہ اٹھ جائے۔ کتنے خوش قسمت کہانیوں کے  
دہ لوگ ہوں گے جن کی زبان سے تم بولتے ہو جو اپنی محبت کا  
خراج تم سے لے رہے ہیں..... تم سے بھی! انہیں  
کیا معلوم کہ تم کون ہو۔ کسی کو نہیں معلوم میں بھی نہیں جانتی۔  
بتا دو..... بتا دو گے؟..... تشبیہوں، استعاروں  
اور گیتوں میں کب تک باتیں ہوں گی..... تم نے  
کبھی کوئی خواب دیکھا ہے ایسا خواب جو سچا ہوا ہو.....  
میں نے آج تک ایسا خواب نہیں دیکھا دنیا بھی ایک خواب

ہے۔ دلجو شکن بھی اور پریشان بھی۔ لاعلمی کے اندھیرے میں  
اپنی بھی آنکھوں سے اوجھل تھی۔ مگر مجھ کو تم سے ایسی باتیں  
نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ مانا کہ افسانوی باتیں میں پھر بھی تم مرد  
ہو میں عورت۔ . . . . کہیں خفا نہ ہو جانا۔  
تمہاری افسانوی  
شناخت

..... تخیل کی دنیا میں باتیں کرتی ہو یا قلم سے چٹکیاں بیتی  
ہو۔ جی چاہتا ہے اور بے اختیار چاہتا ہے۔ . . . . تم ہو  
اور میں ہوں۔ افسانوں کی خلوت میں نہیں۔ . . . . مگر تم۔ . . .  
بڑی ظالم ہو۔ آخر یہ نقاب کیوں نہیں اٹھتی۔ یہ برقع کیوں نہیں  
اترتا۔ آج کل یہاں بہار ہے۔ ہماری چار دیواری تک بھی  
ہوا۔ غریبوں کی سہنوا پھولوں کی خبریں لے آتی ہے تم تو خود  
پھول ہو۔ تم ہی سے بہار کا نام ہے۔ . . . . ایک باغ ہو  
پھولوں سے لدا ہوا۔ رنگینوں کی نمائش گاہ۔ نکھتوں کا عطر  
دان۔ بلبیل چہچہا رہے ہوں۔ کوئی پھول چن رہا ہو اور کسی کی  
گود میں ڈالتا جاتا ہو۔ . . . . پھر کیا چاہیے۔ اللہ میں  
سب قدرت ہے۔ . . . . دعا۔ . . . . آمین

پریم کا پیاسا  
پریمی

”من موہن !

بہار اس طرف کہاں ؟ ہوگی جہاں ہوگی . . . . . میں نے اب  
سے مہنارانا م برف رکھ دیا ہے ۔ برف ! . . . . . خدا نے میرا  
دل بھی ایسا بنایا ہوتا ۔ نہ کسی چیز کا اس پر اثر ہوتا ۔ نہ محبت کا رنگ  
اس پر چڑھ سکتا ۔ عورت ذات ہوں کمزور ۔ اندر باہر ہر طرف سے  
کمزور ۔ جب افسردہ ہوتی ہوں ، جب اپنے جذبات کا قدر دان  
نہیں ملتا تو مجھے اپنی بچا رگی اور مایوسی پر رونانا آتا ہے بڑی آسانی  
سے میری اس بیکسی اور صغنی کمزوری سے کہیں کوئی نا جائز فائدہ  
نہ اٹھالینا ۔ کبھی شرمندہ ہونا پڑے ۔ اس لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم کیا جالو کہ  
میں کون ہوں ؟ کیسی ہوں ؟ اور . . . . . تم اپنا رومانی پردہ  
کیوں نہیں اٹھا دیتے . . . . . ماشاء اللہ مرد ہو ۔ جرأت مردانہ  
سے کام لو ۔ محبت کی بھکارن

شانتا ۔

” . . . . . ایک محبت کے راستے سے بھٹکے ہوئے کو زیادہ  
نہ بھٹکاؤ ۔ ٹوٹے ہوئے دل کو بجا کر نہ دیکھو ۔ حسرتوں سے لبریز ماضی  
نے میرے مستقبل کو بھی تاریک کرنے کی ٹھان لی ہے . . . . .  
مجھے مہاری ضرورت ہے ۔ سنتی ہو شانتا میرے پریم مندر کی  
دیوی ۔ لیکن تمہیں میری کیا ضرورت . . . . . پیاس کو پانی  
کی ضرورت ہوتی ہے ۔ پانی کو پیاس کی کیا امسا ۔ ببل کو پھول کا  
عشق ہے ، پھول کو ببل سے کیا ۔ چکو ر چاند پر صدقہ ہوتا ہے ۔

چاند کو چکور سے کیا۔ میں تمہارا اور تمہاری یاد کا شکر گزار ہوں۔ تم مجھے بھلا سکتی تھیں۔ تمہارے گرد و پیش ایسے اسباب ہوں گے مجھ کو یقین ہے تمہاری طرف سے آنے والی ہو ایسے خوشبو سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں جاگتے ہیں بھی اور سوتے میں بھی۔ دور۔ بہت دور۔ کہیں جہاں میری نظر نہیں پہنچ سکتی کہ دو کٹورہ سی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ چھلکنے کی دیر ہے۔۔۔۔۔ تم بھرا گئی ہو۔ مایوس اور مالوں کی بھیڑ سے محبت کی پیرحمیوں سے اجائی کی طوالت سے بے قرار ہو کہ اس روحانی خواب کی تعبیر ہے۔ رو نہیں شانتا رو نہیں۔ یہ آنکھیں رونے کے لئے نہیں بنائی گئی ہیں۔ یہ بنائی گئی ہیں کسی آپری کے لئے کی خواہش میں مسکرائے کو۔ اس افسانے کو بڑھ جانے دو اس کہانی میں اثر آنے دو۔ ہم ملیں گے ایک دن ضرور ملیں گے دلوں میں راہ پیدا ہو چکی ہے۔ وقت کی دیر ہے جس کا انتظار کرنا چاہا

تمہارا

پریمی ”

یہ اور اس قسم کے اکثر خطوط شانتا اور پریمی کے فرضی ناموں سے گل و بلبل میں ہر پہنچے شائع ہوتے رہے۔۔۔۔۔ لوگوں نے مزے لے لے کر پڑھے۔ لیکن جن دودلوں میں ان افسانوی شاہکاروں نے ایک خاص تعلق پیدا کر دیا تھا اس سے دنیا بے خبر تھی۔ گل و بلبل کے شاعرانہ راز و نیاز سے تسخیر کرنے والے کیا جانیں کہ خیالی آگ بھی شعلے دیے نکلتی ہے۔ فرضی عشق بھی۔۔۔

حقیقت بن جاتا ہے۔ بیکایک خاموشی چھا جاتی ہے۔ یہ سلسلہ خود بخود سنبھل جاتا ہے کیوں؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔

چند روز بعد الہ آباد کے اسٹیشن پر ایک نوجوان خوب صورت سبزہ آغاز کوٹ پتلون پہنے، ہیٹ لگائے آنے والی ٹرین کا منتظر ہے۔ کبھی ادھر جاتا ہے کبھی اُدھر کہ ایک حسینہ سرخ ساری میں ملبوس وینگ روم سے نکلتی ہے اور نوجوان کے سامنے سے گزر جاتی ہے چکیں میس قدم جسا کر پھر واپس آتی ہے اور نوجوان پر ایک سرسری نگاہ ڈالتی ہوئی وینگ روم میں چلی جاتی ہے۔ نوجوان کی نظریں اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ وہ ایک پھر پری لیتا ہے اور دل میں پیدا ہونے والے کسی جذبہ کو دبانے کے لئے جلدی جلدی ٹہلے لگتا ہے۔ اتنے میں قلبیوں کا شور مچتا ہے۔ بیٹھے ہوئے مسافر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ٹرین آتی ہے۔ آنے والے مسافر اترتے ہیں، جانے والے سوار ہوتے ہیں۔ یہ نوجوان بھی سامنے کے بیچ سے اپنا مینیڈ بیگ اٹھاتا ہے اور سکند کلاس کے ایک درجہ میں سوار ہو جاتا ہے۔ درجہ خالی ہے اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے اور پلیٹ فارم پر مسافروں کی چغلیش کا تماشا دیکھنے لگتا ہے ساری والی حسینہ قلی کے سر پر سامان رکھوا کے وینگ روم سے نکل کر آتی ہے اور گاڑیوں میں جگہ تلاش کرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ اس درجہ کے سوا جس میں یہ نوجوان ہے سکند کلاس کے کسی درجہ میں جگہ نہیں ملتی یا لیڈیز کمپارٹمنٹ کی جتو ہے جو نظر نہیں آتا۔ آخر کار قلی اس نوجوان والے درجہ کے سامنے لا کر تھاتا ہے کہ حضور زمانہ ڈبہ تو یہی ہے۔ وہ درجہ پر لگے ہوئے بورڈ کو پڑھتی ہے جو صرف عورتوں کے واسطے ہے مگر نوجوان کو اس میں دیکھ کر پریشان ہے۔

”آپ اس میں کس طرح بیٹھ گئے۔ یہ تو زمانی گاڑی ہے۔ کیا آپ نے اس پر لگے ہوئے تختے کو پڑھا نہیں؟“ انجن سیٹی دیتا ہے۔ ٹرین کو جنبش ہوتی ہے۔

”معاف کیجئے گا مجھ سے غلطی ہوئی۔ لیکن اب وقت نہیں ہے۔ آپ تشریف لے آئیں۔ میں اگلے اسٹیشن پر دوسری گاڑی میں چلا جاؤں گا۔“ سامان جوں توں کر کے رکھا جاتا ہے اور حسینہ بھی سوار ہو جاتی ہے اب ایک سیٹ پر نوجوان ہے دوسری پر حسینہ۔ نوجوان شرمندہ سا معلوم ہوتا ہے اور حسینہ پریشان سی۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ چند منٹ کی بات ہے غالباً آپ کو تکلیف نہ ہوگی۔“ حسینہ نے نوجوان کی طرف غور سے دیکھا۔ ساڑی بنگالہ رومال سے منہ پونچھا ”کچھ ہرج نہیں۔ اسی غلطی اکثر ہو جایا کرتی ہے۔ آپ کہاں تشریف لے جائیں گے؟“

نوجوان :- ”بنارس“ یہ کہہ کر نوجوان نے ”گل وبلبل“ کا تازہ رسالہ اپنے ہینڈ بیگ سے نکالا اور بے توجہی کا اظہار کرنے کے لئے اسے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن یہ نظر بازی کا صرف بہانہ تھا۔ دل اور نگاہیں دونوں حسینہ کی طرف تھیں۔

حسینہ :- ”یہ کیا رسالہ ہے؟ گل وبلبل! کیا آپ اس کے خریدار ہیں؟ نوجوان :- ”جی ہاں! خریدار بھی اور ....“

حسینہ :- ”اور کیا؟“

نوجوان :- ”میرے افسانے بھی اس میں نکلا کرتے ہیں۔“

حسینہ :- ”اوہو! آپ افسانہ نگار بھی ہیں؟“



حسینہ:- لیکن! کہیے رک کیوں گئے؟  
نوجوان:- لیکن..... رفتہ رفتہ شاعری مصوری بن گئی۔ خیالی جذبات  
نے واقعی صورت اختیار کر لی۔

حسینہ:- یعنی؟

نوجوان:- آپ کو یاد ہو گا کہ پہلا خط شانتا کے نام سے شائع ہوا تھا۔  
حسینہ:- ہاں پہلے تین خط شانتا ہی کے چھپے تھے۔

نوجوان:- چوتھا خط پریمی کا نکلا۔ گویا شانتا کے رومانی جذبات میں ایک اور  
شخص نے بھی حصہ لیا اور پھر دونوں طرف سے محبت کا تبادلہ ہوتا رہا۔

حسینہ:- کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی شخص دو مختلف ناموں سے لکھتا رہا۔  
ہو یا اگر دو الگ الگ شخصیتیں ہوں تو یہ کیا ضروری ہے کہ ایک مرد ہو اور ایک  
عورت نوجوان اس استدلال کے کسی قدر جھپینا اور زانو بدل کر مسکرایا۔

نوجوان:- آپ کا یہ اعتراض صحیح ہے۔ یہ دونوں باتیں ہو سکتی ہیں مگر یہ تو  
میں دعوے سے کہوں گا کہ پریمی اور شانتا ایک نہیں ہیں۔ ہاں اس کی بظاہر  
میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ شانتا مرد ہے یا عورت۔

حسینہ کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ لیکن فوراً ہی اس نے اپنے تئور پر بل  
ڈال لئے۔

حسینہ:- بظاہر کوئی دلیل نہیں ہے تو آپ کی ساری منطق بیکار ہو گئی۔  
نوجوان:- منطق تو میں جانتا نہیں۔ لیکن جس طرح مجھے یہ یقین ہے کہ شانتا  
اور پریمی ایک نہیں ہیں اسی طرح میرا دل گواہی دیتا ہے کہ شانتا مرد نہیں ہو  
ہے اور عورت بھی نوجوان حسین اور پریمی کی جوڑ۔

حسینہ نے ایک ایسی نظر سے نوجوان کی طرف دیکھا جس میں ہزاروں

شرارتیں لاکھوں کرشمے اور وار دات قلب کا ایک خزانہ مخفی تھا۔ نوجوان پر بھی ایک مذہبی کیفیت طاری تھی دونوں ہاتھوں سے کیبجہ پکڑے بیٹھا تھا حسینہ:- آپ کے اس بے دلیل دعوے کو میں کس طرح مان لوں۔  
نوجوان:- میں ثابت کر سکتا ہوں۔

حسینہ:- بسم اللہ ثابت کیجئے۔ پھر مجھے مان لینے میں کیا عذر ہوگا۔  
نوجوان:- آپ صبر کرتی ہیں تو سنئے۔ پریمی میں ہوں۔ انسانوں کے لئے میں نے اپنا نام پریمی اختیار کیا ہے۔

حسینہ کے دماغ میں نامعلوم خوشیوں۔ مودوم امیدوں۔ خیالی اربابوں اور مستقبل کے حسین تصورات کا ہجوم ہو گیا۔ وہ سوچتے لگی کہ اس غیر مترقبہ ملاقات کا کیا نتیجہ ہوگا۔ اس کے دل میں یہ شک بھی پیدا ہوا کہ کہیں مجھے دھوکا تو نہیں دیا جا رہا ہے اور اس خیال کے آتے ہی وہ چونک پڑی۔ انتہائی روحانی اذیت محسوس ہوئی۔ اس نے نوجوان کو بغور دیکھا۔ پھر دیکھا۔ یہ جیل پکریہ معصوم آنکھیں، یہ شیریں آواز فریبی نہیں ہو سکتی۔  
اس نے فیصلہ کیا کہ اگر ان پیارے پیارے ہونٹوں سے محبت کا سوا

کیا جائے تو جواب بھی محبت سے دینا چاہیے۔

حسینہ:- پھر تو آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں اور میں خوش قسمت کہ رہا چلتے ایک روحانی ہستی سے ملاقات ہو گئی۔

نوجوان:- لیکن ریل کی ملاقات ہے اس کی ساری باتیں صرف تفریحا ہوا کرتی ہیں۔

حسینہ:- عموماً۔ اگر آپ چاہیں گے تو اس میں خصوصیت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

نوجوان :- ایسے میرے کہاں نصیب کہ آپ جیسی خاتون مجھے نیاز مند کا موقع دے۔ میرا اصلی نام آفتاب ہے اور نمبر ۱۱ لائوسٹن روڈ الہ آباد میرا پتہ ہے اگر اس برسرِ راہے لاقات کو آپ کوئی اہمیت دینا پسند کریں تو....  
حسینہ :- میں دہلی جا رہی ہوں۔ وہی میرا وطن ہے۔ آزاد ہوں اپنی مرضی کی مالک اور دولت مند بھی، لاکھ فام میرا نام اور خط پر صرف ”گلستان دہلی“ لکھ دینا کافی ہے۔

گاڑی رکی اور نوجوان پر تپتی آفتاب جلدی سے اتر ا اور ایک مردانہ درجہ میں سوار ہو گیا۔ آفتاب ایک ہندوستانی ایرانی نسل کا نوجوان تھا۔ بی اے کے بعد کچھ تو غور و حسن اور کچھ فراح کی دار فنگی نے تعلیم کا سلسلہ بند کر دیا اور اب تقریباً ایک سال سے دن اسبابِ تفریح کی فراہمی اور رات حسن و عشق کی جلوہ گاہوں میں گزرتی تھی۔ لیکن آوارگی کے تمام سامان کافی سے زیادہ مہیا ہونے کے باوجود آفتاب کی جوانی اب تک بے داغ تھی۔

آفتاب کو بنارس سے الہ آباد آئے ہوئے کئی دن گزر چکے ہیں چہرے پر وہ پہلی سی بشارت نہیں۔ معمولات میں بھی فرق ہے۔ یاروں میں بیٹھ کر چہچہاؤں اور قہقہوں کے بدلے اب چپکے چپکے اپنے دل سے باتیں ہوتی ہیں سارا سارا دن اپنے کمرے میں تنہا کوڑے بند کئے بیٹھا رہتا ہے۔ رات رات بھر اپنی وسیع کوٹھی کے چمن میں ٹہلا کرتا ہے۔ کبھی رات کو کبھی دن میں کچھ لکھنے بیٹھتا ہے۔ غالباً خط لکھتا ہے۔ پڑھتا ہے اور پھاڑ ڈالتا ہے۔ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور کبھی کبھی آنسو کا ایک قطرہ بھی ٹپک جاتا ہے۔ آخر ایک روز جرأت کر کے خط لکھ ہی ڈالا۔ مضمون تھا :-  
”آپ کو کس طرح مخاطب کروں۔ محترمہ لکھ نہیں سکتا کہ جنیت

ظاہر ہوتی ہے۔ ڈیر کی عمومیت میری نیاز مندی کا درجہ بہت کم دے گی۔ نام اور صرف نام کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ مزاج شناس ہوں اس لئے ڈرتا ہوں۔ آئندہ اگر آپ نے جرات دلائی اور میں بے تکلف بھی ہو گیا تو دیکھا جائیگا۔ میں بنارس اترا اور ٹرین آپ کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے دہلی روانہ ہوئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ ”جھونکا تھا اک نیم کا آیا گزر گیا“ میرے جسم میں ایک نئی روح پیدا ہوئی تھی چند گھنٹوں کے لئے اور وہ نکل گئی۔ یہ عقل و ہوش کی دنیا بھی کس قدر تکلیف و آزار کی دنیا ہے۔ راحت اور شناسی کے لئے احمق اور بوقوف بن کر رہنا چاہیے۔ سکون کی ضرورت ہے تو آؤ دل و دماغ کا سرمایہ ایک ”ہو“ سے بدل ڈالیں..... خدا کرے کہ ”برسرِ راہے“ ایسا موقع پھر ملے۔ اچھا سلام

منتظر جواب

آفتاب

تیسرے دن جواب آیا:-

آفتاب! نام لے کر مخاطب کرنا مجھ کو پسند ہے۔ لیکن نام لینے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں تمہارا نام لے کر تمہاری خوشی کو پورا کرتی ہوں آپ کی مسانت بھی مجھے اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ تم، میں جو بے تکلفی اور مزہ ہے وہ آپ، میں کہاں؟..... بہر حال یاد آوری کا شکریہ..... حسن رہگذر رے، کو دوبارہ دیکھنے کے لئے کس کا دل نہیں چاہتا اور جب روشناسی بھی ہو جائے تو پھر؟ تم مرد ہو جس کا دل صنفِ قوی۔ میں عورت ہوں ناقص، نازک۔ تم کو

یہ کہتے ہوئے کچھ وہم نہیں آیا کہ آؤ دیوانے بن جائیں۔ دیوانوں کی سی باتیں کریں۔ . . . . جاؤ بھی مختار ہو کر مجبور بنتے ہو۔ تدبیر سے پہلے تقدیر کے حوالے ہوئے جاتے ہو۔ . . . . دل میں اگر خواہش ہے اور خواہش میں صداقت تو ”مکنا“ دیکھ لیا دل شاد کیا اور چل نکلے۔ . . . . کیا سب کچھ ممکن ہے مگر تم انسانوی آدمی۔ . . . . جرأت رندانہ کیا جالو۔ . . . . اچھا اب رخصت۔ . . . .

لالہ فام

لالہ فام! بے تکلفی اور سمیات کی پابندیوں سے آزادی کا فیصلہ ہو ہی چکا ہے وہ بھی میری طرف سے نہیں تمہاری طرف سے لیکن کیا کہوں جو کچھ دل کہنا چاہتا ہے جس کو دل کی ترجمانی کہنا چاہیے۔ وہ بات۔ . . . . کیونکر کہوں کہ جی ڈرتا ہے کیا تم اجازت دو گی کہ میں تم کو اپنے افسانوں کی کوئی۔ . . . . تصور کروں۔ اپنے افسانوں کی روح رواں تم کو سمجھ لوں۔ اگر یہ چیز میسر ہو جائے تو میرے افسانوں میں حقیقت پیدا ہو سکتی ہو کچھ تم نے سنا؟ جواب دو۔ مسکرا نے کی سہی نہیں۔ افسانوں کی دنیا سے باہر آؤ تو جمال کا جمال سے مقابلہ ہو۔ درنہ زندگی گونگے کا خواب ہے اور کچھ نہیں۔ والسلام۔

تمہارا  
آفتاب

آفتاب! خدا سے ڈرو۔ مجھ کو اپنے جھوٹے من گھڑت افسانوں سے حسین مخلوق بنانا چاہتے ہو۔ مجھ کو میری جنس کی تمام عریانیوں میں دیکھنا پسند کرتے ہو۔ یہ تمہارا افسانوی مطلع نظر ہے۔ ذرا اپنے گمربیان میں تو منہ ڈالو۔ . . . . بڑے ستم ظریف ہو آفتاب . . . . . میں خوب صورت ہوں۔ ہوں تو کیا ہوا۔ مجھے کسی محبوب کی ضرورت نہیں۔ جمال کا جمال سے مقابلہ۔ یہ تم نے خوب کہا۔ تم اپنی جوانی اپنے حسن کا مجھ پر رعب ڈالنا چاہتے ہو۔ تمہارے خیال میں شاید میں کسی کے . . . . . کسی کے دل کو اپنا بنانا چاہتی ہوں۔ اور وہ بھی ایسے رومانی شخص کے دل کو جس کی دنیا افسانہ ہی افسانہ ہو۔ سن لیا . . . . . افسانہ نویس حسن و محبت کو کھلونا بنا کر ان سے کھیلنا اپنا کمال سمجھتے ہیں یہ ان کی نادانی ہے اور تمہاری بھی۔

”لالہ فام“

لالہ فام! غصہ کا کیا کام اور پھر غصہ بھی ایسا حسین دیکھ لے تو ہونٹ پھڑکنے لگیں۔ محبت کیا ہے؟ میں واقف نہیں۔ حسن کو اسکی کس حد تک ضرورت ہے میں نہیں جانتا۔ مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ دلربائی کے وہ کیا انداز ہیں جن سے دوسروں کو پھنسایا جاتا ہو لیکن بایں ہمہ لاعلمی میں یہ سمجھتا ہوں اور یقیناً صحیح سمجھتا ہوں کہ زندگی کبھی تنہا بسر نہیں ہو سکتی . . . . . کیا تم نے کبھی اس مسئلہ پر غور نہ کیا ہو گا۔ ٹھنڈے دل سے جواب دو . . . . . رفیق حیات کا پیدا کرنا انسانی فطرت ہے۔ میں بھی اگر اس کا متلاشی

ہوں تو کیا گناہ ..... تمہاری نظر میں میرا یہ نیا افسانہ تخیل  
ہے تو تم اپنے معصومیت کے صدقے اس میں اصلیت کا رنگ  
بھردو .....

”آفتاب“

..... آخر ان کج بختیوں کا مطلب ؛ کیا اپنے کسی افسانہ  
کے لئے مواد فراہم کر رہے ہو۔ یا یہ منشا ہے کہ میں تمہاری باتوں  
پر کچھ کہ تمہاری محبت کا اقرار کر لوں اور تمہارے جذبات کا  
شکار ہو جاؤں۔ اگر پہلا مقصد ہے تو صاف کہہ دو اور جواب  
بھی سن لو کہ میں تمہارے رومان کی دلچسپی کا سامان نہیں بن  
سکتی۔ ہاں دوسری صورت میں مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔ بشرطیکہ  
تم اپنی صداقت اور پاکیزگی کا ثبوت پیش کر سکو۔ جوانی کی ترنگ  
اور حسن کی شوخیاں تم پر مسلط نہ ہوں۔ مجھ کو مجبور محبت سمجھ کر  
خوش نہ ہو جانا۔ محبت کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا کرتا۔ ..... پھر  
کہیں ملاقات ہو۔ آئے سائے بیٹھ کر تبادلہ خیالات کی ضرورت  
ہے۔ مجھ سے دریافت کرنا فضول ہے۔ جب چاہو .....  
مجھے ہر وقت تیار پاؤ گے ..... بس اب تو چین آیا۔

لالہ فام

دو ہفتے کی خاموشی کے بعد آفتاب کی طرف سے لالہ فام کے نام یہ مختصر  
خط آتا ہے :-

..... ”پندرہ دن تک میرا خاموش رہنا تمہارے شبہات

کے لئے کافی ہے۔  
 گرمیں اپنے اندر ایک فیصلہ کن جنگ کا آخری نتیجہ دیکھنا چاہتا  
 تھا۔ . . . . میرا مصمم ارادہ ہے کہ اپنی خواہشات اصالاً پیش  
 کروں۔ آج سے آٹھویں روز دھلی پہنچوں گا۔ کیا تم میرا انتظار  
 کرو گی ؟

”آفتاب“

لالہ فام نے سینکڑوں مرتبہ اس خط کو پڑھا۔ ہر مرتبہ اس کے چہرے  
 کی کیفیت بدل جاتی تھی۔ وہ اپنی اس فتح پر مغرور ہو چلی۔ لیکن  
 صنفی کمزوری نے اس کی آنکھیں سنجی کر دیں۔ وہ اپنے جذبات  
 سے مغلوب ہو گئی۔ اس خط کا جواب دینا ضروری نہ تھا اور نہ اس  
 میں جواب طلب کوئی بات تھی۔ لیکن اس کی بیقرار یوں نے  
 اس کا جواب بھی لکھوایا۔ اس نے لکھا :-

”..... تم نے اس خط میں وہ بات لکھی ہے کہ اب کیا  
 کہوں نہ آنکھوں کو اعتبار نہ دل کو یقین۔ چاہتی ہوں کہ پھر  
 تصدیق ہو جائے۔ کیا سچ مچ آ رہے ہو۔ میرے لئے۔ مجھ کو  
 ملنے کو..... مذاق تو نہیں کر لے۔ میرا امتحان تو نہیں  
 لیتے..... تمہاری نہانی کی ہمت نہیں۔ تمہارے دیدار  
 کی طاقت نہیں۔ لیکن پھر بھی آرزو ہے کہ آؤ اور جلدی آؤ.....  
 تمہیں معلوم ہے کہ میرے پچھلے دن کیسی مایوسی میں گزرے  
 ہیں اس لئے مجھے تو شاید اس وقت بھی یقین نہ آئے جب تم  
 میرے سامنے ہو۔ آنکھیں تمہیں دیکھیں اور کان تمہاری باتیں

نہیں۔ اچھا تو بتاؤ کس دن کس وقت یہ نعمت مجھے ملے گی؟

”لالہ فام“

دوپہر کو آفتاب کا تار لالہ فام کو ملتا ہے اور رات کے نو بجے کوٹھی کے احاطے میں موٹر کے ہارن کی آواز آتی ہے۔ پانچ منٹ بعد غمخلی صوفے پر آفتاب اور لالہ فام حسن و محبت کے دو پیکر پہلو بہ پہلو بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ملاقات کا یہ دور حمیں یا شوق و ارمان کا تصادم۔ دھڑکتے ہوئے دلوں مسکراتی ہوئی آنکھوں۔ پھڑکتے ہوئے ہونٹوں سے شروع ہوتا ہے اور بالوں رنگین بالوں۔ چمن کی گلشنوں۔ آرزوؤں کے سبز باغوں۔ فر دوسی زندگیوں کی تمناؤں اور محبت کی خوشنمائیوں سے گزرتی ہوئی ایک مختصر محفل میں ایک چمچہ دربر، عمامہ بر سر مولوی صاحب کی آمد پر پھولوں کے سایہ میں ختم ہوتی ہے اور ازواجی رشتوں میں قید ہو کر ایک منہت کے اندر اندر میاں آفتاب اپنی دلہن لالہ فام کے ساتھ دہلی سے الہ آباد روانہ ہو جاتے ہیں۔

حسن و عشق ہم آغوش ہو چکے ہیں۔ ظاہر و باطن تصورات کی دنیا آباد ہے۔ موانعت کے بعد مواصلت نے سارے حجاب اٹھا دئے ہیں۔ آفتاب کے بنگلہ کے ہر گوشہ میں زہرہ کا معبد بن گیا ہے۔ ہر وقت حسن کی پرستش ہوتی ہے۔ کائنات کی مسرتیں لالہ فام کے جبین میں آگئی ہیں ہنسی ہے، چہل ہے، پیار کی باتیں ہیں۔ عید کے دن ہیں شبِ بارات کی راتیں ہیں۔

ایک سال گزر گیا۔ جوانی کی رنگینیوں۔ حسن کی دلفریبیوں اور محبت کے اندھے نغموں میں معلوم بھی نہ ہوا۔ لیکن جب جذبات میں ناز کی گنجائش

نہر ہی شوق پرانا ہو گیا۔ ارمانوں میں کوئی لذت پیدا نہ ہو سکی۔ افسانوی زندگی روزمرہ ہو گئی تو تصویر کا دوسرا رخ سامنے آیا۔ لالہ فام اور آفتاب دونوں اپنی اپنی جگہ خود نما، مغرور آزاد اور بد مزاج ثابت ہوئے۔ محبت کا احترام اور ازدواجی عہد و پیمان کا ایسا نظر انداز کر دیا گیا۔

جو چیز جس قدر جلدی اور کم محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے اسی قدر ناپائدار بھی ہوتی ہے۔ لالہ فام اور آفتاب کے تعلقات میں بھی یہی کمزوری تھی۔ دوسرے عورت و مرد میں خواہ ان کا تعلق ازدواجی ہو خواہ محض دل لگی باہمی کشش کش کا سبب عورت کا جذبہ رشاک اور مرد کی محکمانہ خصلت ہے وہ اس کو کشش میں کہ مرد اس کا حلقہ بگوش غلام بن جائے اس کی جائز تفریحوں اور ضروری آزادیوں میں دخل دیے گنتی ہے اور جاسوس بن کر اپنا وقار نسائیت کھو دیتی ہے۔ اسی طرح مرد اس گمان میں کہ عورت اس کی زرخیز لونڈی اس کے عیش کا ایک آلہ اور اس کی محبت کے کھیلنے کا ایک کھلونہ ہے۔ اس کے جذبات کی پرواہ نہیں کرتا۔ اپنی جھوٹی برتری جتانے کے لئے اس کو اپنی اصلی سطح سے گرا اچا ہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طرفین میں مناقشت پیدا ہو جاتی ہے۔ مناقشت کے بعد فدا ورجب کام اس کو بھی بڑھ جاتا ہے تو فریقین اپنے اندر ایک قسم کی کیفیت احترام محسوس کرنے لگتے ہیں۔

لالہ فام اور آفتاب بھی اسی قسم کی محبت کا شکار تھے اور آخر کار نتیجہ بھی یہی نکلا کہ ہلکے ہلکے گناہ اور جھوٹی جھوٹی خطائیں ہونے ہونے ایک بڑے گناہ اور بڑی خطا کی نو بہت آگئی۔ رنجش بے جا بے بڑھتے بڑھتے مفارقت سے لے تیار کر دیا اور لالہ فام چند فکروں کا ایک خط آفتاب کے کمرے میں رکھ کر

اپنے وطن دہلی روانہ ہو گئی۔ بغیر اجازت۔ بلا اطلاع۔  
آفتاب لالہ فام کی روانگی کے کئی گھنٹے بعد جب گھر پہنچا تو ملازمین نے  
بیگم صاحبہ کے دہلی تشریف لے جانے کی اطلاع دی۔ کمرے میں گیا تو حفظ  
ملا..... لکھا تھا:-

آفتاب! اس وقت سے پہلے کہ ہماری محبت منافرت میں  
بدل جائے میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے گھر چلی جاؤں۔  
تمہاری بے اعتنائیاں مجھ سے برداشت نہ ہوں گی۔ در  
حقیقت ہماری جلد بازی کا نتیجہ ہے۔ میں تمہارے عیش  
میں مغل ہمتی۔ مجھ کو ہٹ جانا چاہیے تھا تاکہ تم بالکل آزاد  
ہو کر رہو۔ چنانچہ میں ہٹ گئی۔ اب تم بے روک ٹوک اپنی  
نفسانی خواہشات پوری کر سکتے ہو۔ تم مجھے بھول جاؤ۔ میں  
بھی کوشش کروں گی کہ تمہیں بھلا دوں۔

”لالہ فام“

آفتاب کے جذبہ خودداری کو ٹھیس لگی۔ لیکن اس قدر کہ وہ ایک گہرا  
سانس لے کر پلنگ پر جا لیٹا اور اپنے دل کو ٹوٹتا رہا۔ صبح کو اٹھا تو ایک  
انفعالی کیفیت کے سوا اس کے دماغ میں کچھ نہ تھا۔ لالہ فام کی رعنائیوں  
سے وہ ایسا سیر ہو چکا تھا کہ اس نے بیوی کی حیثیت سے بھی اس کی کوئی پروا  
نہیں کی اور اس خط کو لا پڑواہی سے میز کی دراز میں ڈال دیا اور اپنے  
معمولات میں مصروف ہو گیا۔

لاکھ فام اپنی کاوش پسندی اور سنوانی انداز کے ماتحت آفتاب کو الوداع کہہ تو آئی اور ریل میں بیٹھ کر اپنے گھر آ بھی گئی۔ لیکن پریشان بھی تھی اور پشیمان بھی۔ عورت ذات، پھر جوان بھی اور خوب صورت بھی۔ شادی شدہ بھی۔ اکیلی رہ کر دہلی والوں کے طعنوں سے کیونکر محفوظ رہ سکتی تھی۔ واقعہ طلب لوگوں کی بدگمانیوں سے کیونکر بچ سکتی تھی۔ دو چار دن تو اس نے اپنے اجڑے ہوئے مکان کی آراستگی میں رہ کر کاٹے۔ اس کے بعد وہ بھی اور اس کے پرآگندہ خیالات۔ افسوس اور اپنی غلطی کا احساس۔ کبھی تو وہ یہ خیال کرتی کہ میں نے کیوں اس قدر ناعاقبت اندیشی سے کام لیا اتنے دن کی رفاقت کو ایک دم سے ترک کر دیا۔ مجھ کو صرف اس یقین پر قانع رہ کر کہ انھیں مجھ سے محبت تھی مسرور رہنا چاہیے اور کبھی اس خوف سے کانپ اٹھتی کہ لوگ میرے اس طرح آنے اور آفتاب سے علیحدہ رہنے پر کیا کہیں گے۔ کتنی غیرت کی بات ہے۔ یہ پہاڑ سے دن اور یہ اندھیری راتیں آخر کیسے گزریں گی۔ باوجود خیالات کی ان کمزوریوں کے لاکھ فام اعتراف شکست بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کو کسی حالت میں بھی آفتاب کے سامنے جھکنا گوارا نہ تھا۔ وہ خوشی خوشی چلی جاتی اگر آفتاب دہلی آ کر اس کو لے جاتا۔ وہ ہزار مرتبہ اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتی اگر آفتاب مرتبہ آفتاب اس کا منہ چوم لیتا اس کے دل سے سارا غصہ جاتا رہتا۔ لیکن محبوب کی شان باقی تھی۔

غم غلط کرنے اور ایک مشغلہ کے طور پر لاکھ فام نے پھر انسانی خطوط کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور آفتاب کو متوجہ کرنے کے لئے اس کے نزدیک یہی ایک تدبیر تھی۔ چنانچہ دوسرے ہی خط کے بعد پریمی انسانہ میں

موجود تھے۔

شانتا! آج دو سال بعد زیارت نصیب ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان سے دلچسپ کوئی دنیا بھٹی۔ جس میں اتنے عرصہ تک آپ رہیں۔ کیوں؟ یہ آپ کے سانسوں سے بوئے سوز کیسی آرہی ہے۔ کیا میں آپ کے درد کا شریک بن سکتا ہوں؟..... اچھا تو آپ میرے درد کے شریک بن جائیں۔ کیا فرماتے ہیں ملہار دین..... میری محبت مایوس ہو کر آج پھر امید واری کے لئے تیار ہو گئی ہے۔ تزئین جہاں کی خدمت سپرد کر دیجئے۔ شاید حریفیں سمجھ کر آپ نے میرے سارے ارمانوں تمام آرزوؤں کو تشنہ تکمیل چھوڑ دیا تھا۔ کیا اب بھی میں حریفیں ہوں۔ آپ نے دیکھا کہ جیسا پریمی پہلے تھا ویسا ہی پریمی اب بھی ہوں اور رہوں گا بھی۔

ہمیشہ آپ کا  
پریمی

جواب تھا :-

پریمی! تقدیر بگڑتی ہے تو ہر چیز بگڑ جاتی ہے..... کیا کہوں محبت نے جو انگریزائی لی تھی وہ خمار آلود ثابت ہوئی۔ شباب کی شوخیاں کند ہو کر رہ گئیں..... بنگا ہیں بیباک تھیں دل بیتاب اور زبانی خاموش پھر پیغام..... ملاقاتیں..... اس کے بعد..... دن خوشی دس ورے

پر کیف ..... رہائیں انبساط و نشاط سے سرشار  
 ..... پھر حسن کا حسن سے تصادم ..... محبت سے  
 محبت کی ٹکڑے ..... بکمزوریوں کا کمزوریوں سے مقابلہ  
 ..... بے جا خود داریاں ..... آہ زندگی کا بکھا  
 ہوا ترنم موسیقی سے لبریز ساز خاموش ہو گیا۔ بھولنے  
 والے ..... بھلا دینے والے ..... یاد  
 فراموش ..... کچھ یاد ہے ..... اور ..... اور  
 ..... اب کیا کہوں -

”شانتا“

آفتاب یہ خط دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ اس کو اس آئینہ میں اپنی اور لالہ خاتم  
 کی تصویر پہلو بہ پہلو نظر آئی۔ مایوس لگا ہوں، اشک آلود آنکھوں سے ایک  
 دوسرے کو دیکھتی ہوئی۔ وہ دیر تک سوچتا رہا۔ آخر یہ شانتا کون ہے؟ اور  
 اس کا یہ رومان کیسا ہے؟ اگلی اشاعت میں اس کا پہلا خط نکلا۔

شانتا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو اور میں کیا سن رہا ہوں ..... ہر  
 افسانہ ایک ہی قسم کے جذبات کا خاکہ ہوتا ہے۔ لیکن اس  
 قدر واقعات اتحادی ان میں نہیں ہوتا۔ ہاں تو تم .....  
 میں سمجھتا ہوں ایک ناکام محبت ہو۔ میری طرح تمہاری محبت  
 کی قدر نہیں کی گئی ..... میں بھی تمہاری جیسی ایک حقہ تصور  
 نسائیت سے اعزاز کر چکا ہوں اور اس لئے پشیمان ہوں۔  
 اس سے بھی اور تم سے بھی۔ میرے جنسی تکبر نے مجھے بالکل

بے اعتبار کر دیا..... اقرار جرم کرنے کے بعد میں اب کس منہ سے وہ گیت سناؤں جو نوحہ بن چکا ہے۔ تم سونگی۔ لیکن وہ محبت نہ تھی محبت کا ایک ہیو لانا تھا۔ تمہاری محبت کے لئے ایک زیر مشق تھی۔ اگر تم یقین کرو۔ اگر تمہیں یقین ہو تو میں کہوں کہ میری محبت کی پیاس پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی اور یہ صرف تمہارے ہنگامٹ پر سمجھ سکتی ہے۔

”محبوب“

لالہ فام کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ اس خط کا مضمون وہی تھا جو وہ چاہتی تھی۔ اس کے دل میں آفتاب کی خود داری کو شکست دینے والے انتقام کی لہر اٹھی۔ اس نے اپنے شکار کو دو چار جھٹکے اور دیئے چاہتے لیکن کسی خیال سے لبرہ گئی۔ وہ اب زیادہ صبر نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے جواب لکھا :-

پریمی! تم اکتا گئے ہو گئے اس طویل داستان عشق اور روداد بجز کو پڑھتے بڑھتے گھر پڑھ لو یہ سمجھ کر کہ ایک مظلوم اور بے بس عورت یہی کر سکتی ہے۔ اسی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ وہ مستحق ہے اپنا درد دل کہنے کیلئے اور مرد سننے کے لئے مجبور۔ اس لئے کہ یہ درد مرد ہی کی امانت ہے..... کیسی کیسی قربانیوں کے بعد وہ ایک مرد کو اپنا بناتی ہے..... کیا اس لئے کہ اس کے نیاز مند انہ ناز کو ٹھکرا دیا جائے۔ اس کو بال پڑا ہوا مسکا سمجھ لیا جائے نہ رکھنے کے قابل نہ پھینکنے کے لائق اور بے توجہی کے ساتھ اس کو چھوڑ دیا جائے انگاروں پر لوٹنے کے لئے کانٹوں

پڑ پڑ پنہ کے لئے۔ تم نے ایک مرد ہوتے ہوئے بے رخی برتی مجھے اپنا افسانہ ختم کرنے سے پہلے چھوڑ دیا۔ دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ تمہاری شان مردانہ تھی۔ لیکن میں نے .... ایک عورت نے .... نرم دل، ضعیف عورت نے بھی تم سے بے وفائی کی .... تم کو حق تھا کہ تم اپنی محبت کے لئے کوئی دوسری جوانی تلاش کرتے۔ تم سمجھتے ہو گے کہ شانتا مر گئی! .... نامراد مرا نہیں کرتے۔ کیا واقعی تم کو میرے ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنا منظور ہے۔ اپنے چہروں میں ایک دم دینے والی خواہش ہے تو او اپنی کوٹھی کے قریب لارنس والے بنگلہ میں شانتا سے ملو۔ خدا کی کار سازی سے کیا بعید ہے کہ ہماری دوامی نسکین کا سامان پیدا ہو جائے۔

شانتا

یہ خط گل و بلبل کے ایڈیٹر کو بغرض اشاعت بھیج کر لالہ فام فوراً الہ آباد روانہ ہو گئی اور لارنس والے بنگلہ میں اپنی عارضی رہائش کا انتظام کر لیا۔ یہ بنگلہ ایک بیوہ میم کی ملکیت تھا۔ الہ آباد میں قیام کے زمانہ میں لالہ فام کی اس سے ملاقات ہو گئی تھی۔ بیوہ میم لالہ فام کی پردہ داری اور آفتاب سے علیحدہ کرا کے بنگلہ میں رہنے سے متعجب تو ضرور ہوئی لیکن منہ دستانوں کی طرح اس کی جستجو کو اپنا فرض نہیں سمجھا۔

گل و بلبل آتا ہے۔ آفتاب اسے کھولنا چاہتا ہے، ہاتھ کانپنے لگتا ہے دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ ورق الٹتا ہے "نثر میں شاعری" کے عنوان سے وہ خط نظر آتا ہے جس میں شانتا لکھا ہوا ہے۔ شوق کی خواہش ہے

کہ ایک نظر میں سارا مضمون دل میں اتر جائے لیکن آنکھیں جھپینی جاتی ہیں۔ خیالات میں حشر برپا ہے۔ آخر پڑھنا شروع کرتا ہے۔ ہر لفظ، ہر فقرے اور ہر سطر سے ایک نئی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ختم کرنے کے بعد اس کے جذبات اس کے کہنے میں نہ تھے۔ دماغ پچھلی محبت کو دوہرا رہا تھا۔ دل اندھا بنا ہوا ایک نئے افسانہ میں گم تھا۔ لالہ فام کی یاد اس کی محبت کا آغاز، انجام، پیمانہ، شکستہ شناسا کی مبہم تصویر، حسن پرستی کا ولولہ، ایک خوش آئند محبت کا ارمان یہ ساری باتیں اس کے خیالات کو یکسو ہونے نہیں دیتی تھیں۔ وہ برآمدہ کے ستون سے لگا ہوا جیسے حرکت خاموش کھڑا ہوا تھا۔

اتنے میں ملازم نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ جواب نہارد۔ پھر اس نے ذرا قریب آکر عرض کیا ”میاں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے“ اس آواز نے آفتاب کو خیالی دنیا سے مادی دنیا میں آنے کے لئے مجبور کیا۔ اس نے متفکر لہجے میں ”اچھا“ کہا اور جب لوکر جائے لگا تو اسے روکا ”دیکھو لارنس والی کوٹھی جانتے ہو۔ یہ کیا ہے جس میں وہ بڑھیا میم انڈے اور مرغیاں بیچا کرتی ہے وہاں چلے جاؤ۔ دریافت کرنا اس میں کوئی ہندوستانی مرد یا عورت آیا ہوا ہے اچھی طرح پوچھنا“

آفتاب ابھی کھانا ہی کھا رہا تھا کہ اس کا فرستادہ لارنس والی کوٹھی سے واپس آگیا ”کہو منیر کیا خبر لائے؟“

منیر:- ”میاں پہلے تو دروازے پر میم ملی۔ اس سے پوچھا۔ چڑیل نے یہ کہہ کر مال دیا۔ ہم نہیں جانتا ہم نے بنگلہ کرایہ پر دیا ہے تم خود معلوم کر لو۔ پھر ایک نوجوان مہری دکھائی دی شاید لوکر ہوگی۔ اس سے بات کرتے ہوئے میرا جی ہڈرا۔ آگے بڑھا تو برآمدہ میں خالسا ماں کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کو اشارہ

سے بلایا۔ کہنے لگا کہ ہماری بیگم صاحبہ نے ابھی تو بنگلہ کرایہ پر لیا ہے مگر وہ اسے مول لیں گی۔ ان کا نام شانتا ہے، بڑی خوبصورت ہیں، یہاں شادی کر نیو آئی ہیں۔ بس میاں وہ آنا ہی کہنے پایا تھا کہ اندر سے اس کا بلاوا آگیا اور وہ چل دیا۔

ہاتھ کا نوالہ دیا ہی آفتاب نے طشتری میں رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ جلدی جلدی ہاتھ دھوئے اور سیرھا کھنے پڑھنے کے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں مینر پھر لارنس والے بنگلہ میں تھا۔ اور لالہ فام کے نازک اور کانپتے ٹھٹھے ہاتھوں میں گلابی رنگ کا ایک معطر کاغذ تھا جس میں لکھا تھا۔

”ڈیر شانتا! میں اپنے پریشان خواب سے جاگ اٹھا ہوں۔ ارمان بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ اب انتظار کٹھن ہے۔ تم آؤ گی یا میں آؤں؟ کب کس وقت؟ میں تو چاہتا ہوں کہ آج ہی فیصلہ ہو جائے۔ بلکہ ابھی کیا رائے ہے؟“

”پریمی“

لالہ فام مسکرائی۔ ”کہہ دو جواب ملتا ہے چند منٹ ٹھہرو“  
آفتاب گھبرایا ہوا کپڑے پہن رہا ہے۔ کبھی شیروانی پہنتا ہے کبھی کوٹ۔ ٹائی باندھتا ہے۔ مگر وہ نہیں بگتی پھینک دیتا ہر بٹن لگاتا ہے۔ پورے نہیں لگتے۔ اوپر کا بٹن اور نیچے کا کاج خالی رہ جاتا ہے۔ تیل کی جگہ لونڈر سر میں اور لونڈر کی جگہ تیل روال پر ڈال لیتا ہے۔ شرابیوں کی سی حالت ہے۔ سامنے شگھار دان پر ایک کاغذ کھلا ہوا رکھا ہے۔ ہر دو منٹ کے بعد اس کو اٹھاتا ہے۔ پڑھتا ہے اور رکھ دیتا ہے۔ کیفِ مستی میں

ایک ساغر کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ کاغذ لالہ فام کی طرف سے تھا :-  
میرے پریمی! زیادہ محبت سے ڈر لگتا ہے۔ تم بھی اس جلد بازی  
کا خمیازہ بھگت چکے ہو اور میں بھی ..... شانتی سے کام  
لیتے تو اچھا تھا۔ مگر نہ تم میں صبر پہلے تھا نہ اب ہے ..... اچھا  
آجاؤ یا مقدر یا نصیب "

" شانتا "

لالہ فام پردہ کے اندر اور آفتاب باہر کر سیوں پر بیٹھے ہیں دونوں خاموش  
دونوں ساکت۔ دل دھڑکنے سے تھمے جسم کی لرزش جائے۔ سانس اپنے  
ٹھکانہ پر آئے دماغ اپنا کام کرنا شروع کرے تو زبانون میں حرکت پیدا ہو۔  
جب تصویر کے تصور پرے کا عالم مکدر ہونے لگا تو آفتاب نے خشک ہونٹوں  
کو تر کرتے ہوئے کہا :-

" کیا پردہ میں رہ کر آپ تبادلہ خیالات کریں گی ؟

" بے پردگی سے راحت نہیں ملی۔ نقاب اٹھنے کے بعد کیا چیز باقی  
رہ جاتی ہے جس کے شوق میں ارمالوں کی پردہ ریش کی جائے۔

" آپ نے یہ خوب بات کہی شانتا! میں مانتا ہوں۔ لیکن موجودہ تمدن  
میں یہ کچھ پسندیدہ چیز نہیں ہے "

شانتا :- نہ ہو۔ کیا آپ کو ذاتی طور پر بے پردگی کے متعلق کوئی خوشگوار تجربہ  
ہے۔ سچ کہنا پریمی!

پریمی :- نہیں! حقیقت تو یہ ہے کہ ملاقاتوں میں عریانی جذبات میں  
کوئی تشنگی باقی نہیں رہنے دیتی ..... مجھ کو تو ایسا تلخ تجربہ ہو چکا ہے کہ  
بس دل ہی جاتا ہے۔

شناٹتا :- پھر بھی آپ مجھ کو قبل از وقت بے پردہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ تلخ کے بعد تلخ تر تجربے کی خواہش ہے۔

یہ کہہ کر پردہ میں سے ہاتھ بڑھا کر لالہ فام پاؤں کی تھالی پیش کرتی ہے۔ آفتاب شناٹا کو پہچاننے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اس کا ہاتھ بھی نظر آیا۔ وہ سوچنے لگا کہ آواز بھی سنی ہوئی ہاتھ بھی دیکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کہاں یا وہ نہیں۔

شناٹتا :- کیا سوچ رہے ہو۔ کیا پردہ میں رخنہ ڈالنے کی فکر ہے؟  
پریمی :- سوچ کیا رہا ہوں تمہاری نسبت طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے ہیں۔

شناٹتا :- دُرے نہیں میں خوب عورت ہوں، جوان ہوں۔  
پریمی :- یہ بات نہیں بلکہ مجھے کچھ شبہ سا ہو رہا ہے۔  
شناٹتا :- "یعنی میں لالہ فام ہوں" آفتاب پردہ کی طرف متوجس ہو گا ہوں سے دیکھنے لگا۔ گویا وہ پردہ اٹھا کر اندر گھس جائے گا۔

پریمی :- آپ لالہ فام کو جانتی ہیں؟  
شناٹتا :- خوب اچھی طرح۔ وہ میری سہیلی ہیں۔  
پریمی :- اور ان کے حالات سے بھی واقف ہیں؟  
شناٹتا :- بالکل اسی طرح جیسے اپنے حالات سے۔ آفتاب کی پریشانی بتی جاتی ہے۔

پریمی :- سارے حالات سے؟  
شناٹتا :- ایک ایک دن کے۔ ایک ایک گھنٹہ ایک ایک منٹ کے۔ اچھے برے۔

پریمتی :- وہ آج کل کہاں ہیں ؟

شاننا :- کیوں خیریت ! پھر ادھر دل بھر بھرایا ؟  
اس فقرے سے آفتاب پر گھڑوں پانی پڑ گیا ۔ اس کے منہ سے بات  
نہیں نکلتی تھی ۔

شاننا :- کہیں خدا نخواستہ آپ آفتاب تو نہیں ہیں ورنہ لالہ نام سے آپ کو  
کیا دھچپی ؟

اب تو آفتاب بالکل ہی سرٹ پٹا گیا ۔ زبان لڑکھڑانے لگی ۔ بہت  
نہیں پڑتی تھی کہ شاننا کے سامنے بیٹھا رہے لیکن بھاگا بھی نہیں جاتا تھا ۔  
شاننا :- بولے کھو کیوں گئے ؟ افسانہ کے کاغذی باغ میں تو خوب چھکنا آتا  
ہے ۔ یہاں بھی تو کوئی بولی بولو . . . . . کیا آپ آفتاب ہیں ؟

پریمتی :- ہوں تو آفتاب ! لیکن آپ کو اس سے کیا ؟

شاننا :- میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ لالہ نام سے اب آپ کو کوئی تعلق نہیں ہے ؟  
آفتاب :- ہے ! تمہاری محبت کے سرگم نے لالہ نام کو سبست رت کی طرح  
ایک دفعہ پھر میرے سامنے لاکھڑا کیا ۔

شاننا :- پھر تم نے لالہ نام کی جستجو کی ! اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کا سارا  
کیا ؟

آفتاب :- نہیں ! افسوس نہیں ۔

شاننا :- اس کا سبب ؟

آفتاب :- پہلے ان کی بیوفائی پر غصہ رہا ۔ وہ ٹھنڈا ہوا تو اپنی بے اعتنائی  
پر شرمندگی رہی ۔ یہ کم ہو چلی تو تم نے میرے تصورات کو جذب کرنا شروع کر دیا ۔  
شاننا :- اب کیا ارادہ ہے ؟ یہ سوال آفتاب کے لئے نہایت اہم تھا ۔

آفتاب :- لالہ فام آج کل کہاں ہیں ؟ اس کا آپ نے جواب نہیں دیا ۔

شاننا :- آپ اپنا مطلب فرمائیے ؟

آفتاب :- کیا وہ مجھ کو معاف کر دیں گی ؟ میں اپنی غلطیوں پر نادم ہوں ۔

شاننا :- جہاں تک مجھ کو معلوم ہے لالہ فام نے اپنے گھر پہنچتے ہی تم کو معاف

کر دیا تھا ۔ وہ بھی اپنی فطرتی کمزوریوں سے شرمندہ ہیں ۔ اگر آپ ملاپ کے

لئے تیار نہیں تو اس خدمت کو میں انجام دے سکتی ہوں ۔۔۔۔۔۔ لیکن میری

محبت کا کیا حشر ہوگا ؟

آفتاب :- آپ اسی طرح میرے دل کی مالک رہیں گی ۔

شاننا :- واللہ ایک میان میں دو چھریاں ! معلوم ہوا کہ آپ کی انہی باتوں نے

لالہ فام کی محبت کو مجروح کیا ہے ۔

آفتاب :- آپ میرا مطلب غلط سمجھیں ۔ لالہ فام کی اور آپ کی محبت میں فرق

ہوگا ۔

شاننا :- یعنی ؟

آفتاب :- اگر لالہ فام نے بخوشی میرا شریک رہنا پسند کر لیا تو وہ ہمیشہ

کے لئے میری محبوب ترین بیوی اور آپ میری خواہر ۔۔۔۔۔۔

آفتاب اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ بجلی کی سرعت کے ساتھ کسی نے پردے

میں نے نکل کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔ آفتاب کی زبان سے لالہ فام

نکلا ۔ لالہ فام نے ہاں آفتاب کہا اور دونوں ہم آغوش ہو گئے ۔

بڑا عزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جگ ہو کر

شاننا اب حقیقی معنوں میں دیوی بن گئی ہے اور پریمی مادر ہند کا

سپوت بیٹا۔ نہ جذبات کو بھڑکانے والے انسانے ہیں۔ نہ روح کو مدہوش کرنے والے رومان۔ ایک سادہ بے تکلف منزلی زندگی ہے کہ گزرتی ہے۔

اشرف صبودھلوی

# چکر

تہہیل :- "موجودہ زمانہ کا اڈیٹر وہی حیثیت رکھتا ہے جو کسی زمانہ میں سلطنت روم کے بشپ اور پوپ کی تھی۔ ہم بھی اس فرض کے ماتحت رسالہ کی بارگاہ میں اپنی حماقتوں کا تذکرہ اور اپنے گناہوں کا (کنفشن) اعتراف کر کے گناہوں کے بار کو ہلکا نہیں کرتے لیکن تنہائی کے عذاب سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں فرق یہی ہے کہ اڈیٹر شائع کر دیتا ہے اور پوپ مخفی۔"

ابو طاہر  
ہندوستان میں لڑکے کے لئے شادی کا معیار یونیورسٹی ہے اور لڑکی کے لئے اس کے والدین۔ اس کے علاوہ طرفین کی ذاتی خصوصیات خارج بحث

ہیں۔ بالخصوص لڑکی کے متعلق جس قدر معلومات بہم پہنچتی ہیں وہ اسی نوعیت کی ہوتی ہیں جیسی کہ سرکاری سنسر شدہ خبریں جن میں مصلحت وقت کے لحاظ سے رنگ آمیزی ایک لادبی عنصر ہے۔ مثلاً معنوں نگار اور ادیب لڑکیاں وہ کہی جاسکتی ہیں جو اپنے بھائی کے لکھے ہوئے مضامین کی صحیح نقل کر سکیں۔ امور خانہ داری میں ماہر وہ لڑکیاں ہوتی ہیں جو کئی مرتبہ گزریا کے بیاہ کا انتظام خود بہ نفس نفیس کر چکی ہوں جن اور خوب صورتی آپ اضافی شے ہے، یعنی میری جد اپند ہے آپ کی ہے جد اپند اور اس لحاظ سے جو اکی سو فیصدی اولادوں کو فطرت کی ان آسانوں کے زیر اثر خوبصورت ہونے کا حق حاصل ہے بشرطیکہ ان کے حواس خمسہ صحیح حالت میں ہوں اور قانونی زبان میں صحت عقل اور درست ہوش و حواس پر رائے زنی نہ کی جاسکے۔ اب رہا عمر کا تعین سو اس کا معیار فی زمانہ بال دانستہ اور کھال نہیں کہے جاسکتے۔ کیونکہ قدرت اس چودھویں صدی میں اپنے دستور العمل میں بہت سرعت کے ساتھ ترمیم کر رہی ہے۔ بجلی کی روانی آپ میٹر میں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن عمر کی روانی آپ چہرے میں نہیں دیکھ سکتے۔ مقیاس الحارات بنا لینا آسان ہے لیکن مقیاس العمر بنانا مشکل اس لئے ثبوت کی عدم موجودگی میں آپ گواہوں کے بیان پر یقین کرنے پر مجبور کئے جائیں گے۔ اسی سلسلہ میں ریاضی کے مسلم الثبوت اصول بھی تبدیل کئے جاسکتے ہیں۔ یعنی کرہ ارض کے سورج کے گرد ایک گردش بعض اوقات  $365 \times$  دن لے سکتی ہے جس میں ان ایک غیر متعین عدد ہے جس کا صحیح یقین امتی جان کے فارمولے پر منحصر ہے۔ اس نظریہ کی رد سے اگر ایک لڑکی نے سن ۱۹۰۰ء میں پندرہویں سال میں قدم رکھا تھا تو

سلسلہ میں وہ پندرہ ہی سال کی رہے گی۔ اس ضمن میں چند خاص اصطلاحات ہیں جن کا مفہوم زبانِ انگلستان میں جدا ہے اور لڑکی کے لین دین میں جدا۔ مثلاً لاغر، نازک تن صاحب فراسٹ، موہان پان۔ الفربہ، بگداز۔ مدقوق، تنفکر۔ سد امریض۔ اختلاج قلب کی بیماری۔ سیاہ رنگ۔ پختہ رنگ۔ نادان، شرمیلی۔ زرد رو۔ کندی۔ پسید بال۔ نزلہ۔ کاحل۔ الوالعزم۔ نینی تال۔ میکہ۔ کالی کھانسی۔ نند۔ پلیگ۔ سسرال مہان۔ انیدھن۔ جہیز۔ رونمائی۔ روپیہ سود پر چلانا۔

ذات کی تحقیق و تدقیق بیکار شے ہے، کیونکہ ہر دس سال کے بعد مسلمانوں کے مختلف فرقے سید ہونے کی باقاعدہ رجسٹری کرا لیتے ہیں اور نجیب الطرفین ہونے کا کاپی رائٹ، اگر یہ رفتار اسی طرح جاری رہی تو ہم کو ڈر ہے کہ مبادا پٹھان اور شیخ ڈھونڈے سے بھی دستیاب نہ ہوں گے۔ اندریں حالات وہ نوجوان جو شادی کرنے کا نوٹس دے چکے ہیں۔ بیچر ممنون ہوں گے، اگر کوئی تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون سراغِ سانی کا ایک خفیہ ٹھکانہ کھول کر ان کی صحیح رہنمائی کریں گی اور شادیوں کے تھوک فروش ایجنٹ صاحبان سے گلو خلاصی۔ بعض تعلیم یافتہ حضرات کا خیال ہے کہ فوٹو کا تبادلہ کم از کم صورت کے مسئلہ کو حل کر دے گا۔ لیکن ان کو علم نہیں کہ کیمبرہ حسن و قبیح دونوں کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتا ہے کبھی کبھی کبھی کا مہنگامی طور سے معائنہ کے لئے جانا بھی بے سود ہے کیونکہ لڑکیاں بذاتِ خود کیمبرے کی پلیٹ ہیں۔ ان کا رنگ انسانی شعاعوں سے اڑ جاتا ہے اور اس کا رنگ سورج کی شعاعوں سے۔ اس کے علاوہ یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ راویوں کے بیان پر یقین لے آنا تفرقے کا موجب ہوتا ہے

اسلامی تاریخ آپ کی شہادت میں موجود ہے۔ آخری صورت یہی ہے کہ خود اپنی آنکھ سے دیکھا جائے۔ لیکن وہ باعزت طریقہ سے ناممکن ہے تاہم اخلاقی گناہ کا مرتکب ہو کر اس کوچہ مخصوص سے ایک مصنوعی برات نہ نکالی جائے یا ایک نمائشی ہنگامہ برپا نہ کیا جائے۔ میرے ایک دوست نے اس سوال کو اس طرح حل کیا تھا کہ اپنی منسوبہ کے والدین کو خود انہی کے ایک قریبی عزیز کی بیماری کا تار دیا تھا اور اس کے بعد اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کئی روز تک مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ لیکن ان کی لاشیماں سے ہم کو بچہ سہر دی ہوئی جب ہم کو یہ معلوم ہوا کہ وہ لوگ تعبیل کو مد نظر رکھتے ہوئے سڑک کے راستہ سے موٹر پر روانہ ہو گئے تھے۔

گو یہ دقیق ایک مخصوص وقت پر تمام نوجوان کو اول بار اور بوڑھوں کو آخر بار پیش آتی ہیں لیکن خصوصیت سے ہماری بی لے پاس والی برادری کو بہت زیادہ محسوس ہوتی ہیں۔ کیونکہ دماغ میں ”آئیڈیل وائف“ کی خیالی تصویر ہوتی ہے۔ زیر نظر ”آئیڈیل میرج“ پر فصیح و بلیغ خطبے اور دل کی گہرائیوں میں ”آئیڈیل ہوم“ کی بنیادیں۔ اس اصول پر کہ امیدیں بہت کم برآئی ہیں۔ ہم اپنے لطیف نازک اور حسین تجمل کو اس خوفناک حقیقت سے چکنا چور کرنے پر ذرا مشکل سے آمادہ ہوتے ہیں۔ کاش کہ ”بیٹھا رہوں فقور جاناں کئے ہوئے“ لیکن افسوس ہے اور مجبوری کہ اللہ میاں کی نظروں میں ہمارے پاس ایمان ہیں اور ابنائے وطن کا ہم پر اطمینان ہے۔ وہاں نازیں معرض تخفیف میں آ جاتی ہیں اور یہاں وقار — دگر نہ ہے شرط کہ ہم سب متحد ہو کر ایک پارٹی بنالیں اور سنیہ گرہ کر لیں یہاں تک کہ ہمارے تمام مطالبات منظور کر لئے جائیں۔

ستم ہے کہ مجروح آدمی نظروں میں کھٹکتا ہے جیسے پولیس کے لئے انقلابی پارٹی کا ایک رکن، جاسوس اس کے پیچھے اور وارنٹ اس کے سامنے جس طرح قیدی کا تمام بار مہانی سرکار اٹھاتی ہے اسی طرح داماد کا سسرال۔ اس سو بحث نہیں کہ اول الذکر کو تمام عمر چکی پینا پڑے اور آخر الذکر کو دانت۔ یہی نہیں بلکہ ایک طرح سے مجرم کو مجروح پر فوقیت ہے۔ وہاں سزا جرم کے بعد ہوتی ہے اور یہاں جرم سے پہلے۔ یعنی محض امکان جرم پر۔ ان خدائی فوجداروں سے بزعم خود جو شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلانے کے دعوے دار ہوتے ہیں۔ محض پیچھا چھڑانے کے لئے آپ کہہ دیجئے کہ "ملازمت نہیں ملتی" وہ فوراً بول اٹھینگے "شادی بعد کہئے" سردست روپیہ نہیں ہے۔ اطمینان سے کہئے کہ "شادی بعد کہئے" والدین راضی نہیں ہوتے۔ اس کا بھی خاموشی سے جواب دیں گے "شادی بعد" اور اگر براہ فرخندہ ہو کر کہہ دیجئے کہ لڑکی اچھی نہیں ہے — ستم ظریفی تو ملاحظہ فرمائیے میا ختہ وہی طوطے کا سارٹا ہوا فقرہ دہرا دیتے ہیں یعنی شادی ہم بھی مضمون ہو رہے تھے۔ ایسے ہی عنوان کے۔ سات آٹھ نمبروں میں سے کسی ایک پر نمبر لگانا عرف عام میں سٹہ یا لٹری کہا جاتا ہے اور حقیقت میں قیمت آزمائی۔ سرخی افسانہ دل کچھ اور عقلی واقعات کچھ اور — اس لئے ہم نے احتیاطاً مختلف مقامات پر اپنی خبر رساں ایجنسیاں قائم کیں اور معزز اخبارداروں کے پٹیشن یافتہ رپورٹروں کا تقرر۔ لیکن ہماری مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہم نے یہ دیکھا کہ من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید۔ ریل گاڑی کی دونوں متوازی پٹریوں کی طرح جو کبھی ایک دوسرے سے ملتی ہی نہیں۔ دور پورٹروں کے بیانات بھی ہمیشہ مختلف ہی رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اخبار دلچسپ ہوتے ہیں اور پبلک خشک۔ بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ فرس

املازمی کر کے اس امر کا تصفیہ کر لیں۔ لیکن عین اسی وقت ایک ضعیفہ زیر غور امید داروں میں سے ایک کی پیغا مہربن کر چارے پاس آئی۔ اس نے لڑکی کو حسن میں لوز جہاں۔ بہادری میں چاندنی بی، اخلاق میں نائٹ انجیل اور تقریر میں سر جہنی کے ہم پلہ بنا دیا۔ یقیناً ہم اس قدر کہنے کے لئے تیار ہیں کہ خود اس کی فصاحت و بلاغت سے اس طرح شکست کھا گئے کہ ہم نے متذکرہ مسئلہ پر مزید غور کرنے کے لئے ایک ہفتہ کی مہلت طلب کی۔ لیکن وہ تین ہی دن کے بعد ہم پر ایک مار واڑی مہاجن کی طرح آگے سوار ہو گئی اور قطعی فیصلہ کرنے کا انٹی میٹم دینے لگی۔ وہ بھی مجبور تھی کہ نہ کہ دن بدن مقابلہ سخت ہو رہا تھا اور امید داروں کی فہرست میں اضافہ۔ خود ہماری خوش قسمتی تھی کہ والدین ہمارے حق اولیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہماری جانب داری کرنے کے لئے تیار تھے۔ بشرطیکہ ہم اسی وقت اقرار کر لیں جو ہمارے لئے قریب قریب ناممکن تھا۔ اس لئے ہم نے اپنی مجبوریاں ظاہر کر کے تکلیف دہی کی معافی چاہی جو بخوشی منظور کر لی گئی۔ لیکن ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اس کے دوسرے ہی روز وہاں کے ایک ذمہ دار رکن تشریف لائے اور ہم کو مستقل قریب کا ایک مسلم الثبوت دانا و خیال فرما کر تاریخ نکاح کے اہم مسئلہ پر گفت و شنید کرنے لگے۔ اس دلچسپ مغالطہ سے ہم کچھ دیر تک تو لطف اٹھاتے رہے لیکن جب یہ حقیقت سچی کی حد تک پہنچ گئی تو ہم نے ان کے اس طرز عمل کی وجہ دریافت کرنے کی زحمت گوارا کی۔ جس کے جواب میں انھوں نے "ہائیں" کہہ کر تعجب کی اداکاری کو اس طرح مکمل کیا کہ ہم کو تشویش پیدا ہو گئی۔ فرمانے لگے کہ آپ نے ضعیفہ سے زبانی اقرار کر لیا ہے اس کو جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

”تو کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟“ میں نے دریافت کیا۔  
 ”بہت ممکن ہے“ انہوں نے اس طرح کہا کہ جیسے کشتی لڑنے کا وقت  
 آچکا ہے اور اس کے بعد وہ دامن جھٹک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک ہفت  
 کے بعد مجھ کو ایک خط ملا۔ جس میں مجھ کو ”عزیز از جان“ کے خطاب سے یاد کیا  
 گیا تھا اور نفس مضمون میں وہی مطالبہ تھا جس کی تہدید زبانی کی جا چکی تھی۔ میں  
 خاموش رہا۔ دوسرے ہفتے ایک دوسرا خط موصول ہوا۔ جس میں میرے  
 مفروضہ جواب کا حوالہ دیتے ہوئے میری ”سزائے موت“ کی تاریخ مقرر کر دی  
 گئی تھی اور اسی میں میری طرف سے بھیجی ہوئی رسمیں مٹھانی کی رسید بھی ملفوظ تھی  
 اس خط کے دو ہی دن بعد ہم کو ایک پارسل موصول ہوا۔ جس میں ہماری شادی  
 خانہ آبادی کے منظوم کارڈ رکھے ہوئے تھے جن کے کنارے مطلقاً اور عبارت  
 صبح اور مقفہ۔ ملفوظ خط میں ہم کو اطلاع دی گئی تھی کہ شہر کے عمائدین اور حکام  
 کو کارڈ تقسیم کر دئے گئے ہیں۔ بالآخر ہمارا پیانا صبر بھی لبریز ہو گیا اور ہم نے  
 ان کے کارڈ واپس کرتے ہوئے ان کو دھکی دی کہ اگر ان کا یہی طرز عمل رہا  
 تو ہم یہ معاملہ پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ اس کے جواب میں ہم کو ایک  
 حیرت انگیز تحریر موصول ہوئی جس میں لکھا تھا کہ ”آپ کی مجبوری کو مد نظر رکھتے  
 ہوئے ہم نکاح فی الحال ملتوی کئے دیتے ہیں یہ گویا یہ شاخسانہ تھا کسی  
 آئندہ اسکیم کا۔ بہر حال ہم نے ایک اطمینانی سانس لی اور بطور احتجاج شادی  
 کے خیال سے دست برداری۔“



کہ آگے لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ یہی تعریف ہر زمان  
 کی اور رومانی نقطہ نظر سے حضرت موسیٰ مذہبی لٹریچر میں بڑی اہم شخصیت تھو

ہیں۔ جو دلچسپی اور مسرت غیر متوقع اور خلاف امید واقعات کے پیش آنے سے ہوتی ہے وہ مدت العمر فراموش نہیں کی جاسکتی۔ رومانی تشنگی فطرت کے ماتحت ہے اس کی سیرابی قسمت کے ماتحت۔ یقیناً وہ لوگ قابل صد ہزار افسوس میں کہ جن کی زندگی کے تمام لمحے رومانی ضیا پائیبوں سے محروم رہے۔ اور ایسے ہی لوگوں میں ہمارا بھی شمار تھا۔ ہم محسوس کرتے تھے کہ ہمارے ذرات میں انقلاب روح کی گہرائیوں میں ارتعاش اور دل میں اضطراب ہو رہا ہے جس طرح پانی برسنے سے قبل ایک قسم کی امس ہوتی ہے اسی طرح ہمارے جذبات میں بھی براگھگھتی تھی۔ کیونکہ ہماری فطرت رومان کی متلاشی تھی۔ اور حسن اتفاق تھا کہ رومان اس پر پھٹ پڑا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم اپنے وطن سے نوسومیل کے فاصلہ پر تعلیمی سلسلہ میں ممبئی میں مقیم تھے، جہاں ہم سابق کے ناخوش گوارہ واقعہ کو فراموش کر گئے تھے اور ایک ایسے مقام پر سلسلہ جنباہی کر رہے تھے، جہاں ہمارے تمام نقطہ ہائے نظر کے مرکز کا امکان تھا۔ یقین تھا کہ مزید سچی و کوشش سے ہم کامیاب ہو جائے لیکن ہم کو ایک حادثہ پیش آیا جس نے اس گفت و شنید کے سلسلہ کو ایک قلم ختم کر دیا۔ وہ حادثہ ایک خط تھا۔ جس پر ایک مقامی ڈاک خانہ کی مہر تھی۔ لفافہ حسین تھا۔ ملفوفہ کا غد محوطہ تحریر میں استوائی جھلک اور مضمون میں نزاکت۔ خط میں ہمارے مضامین کی جو مختلف رسالوں میں شائع ہوتے ہیں تعریف کی گئی تھی اور خود کے لکھے ہوئے ایک مضمون کو صحیح کرنے کی فرمائش جس کی ہم نے اولین فرصت میں تعمیل حکم کر دی۔ دوسرا خط ذرا بے تکلف ہجہ میں موصول ہوا۔ جس میں خود پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ہم اپنی خوش بختی پر نازاں تھے کہ کالج کی ایک حسین اور آزاد خیال دوستیہ سے خط



..... مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ لیکن چونکہ میرا تجربہ مکمل ہو چکا ہے۔ اس لئے اس معاملہ کو دور کر دینا اپنا فرض اولین خیال کرتی ہوں دراصل واقعہ یہ ہے کہ میں نے ادب اردو میں ایسے عشقیہ خطوط کی کمی کو محسوس کیا جن میں سچی اور پاک جذبات کی حیثیت جاگتی نقویں ہوں۔ ایسے مجھ سے محو فرام کر کے لئے میرے کامیاب ذہن میں ایک ترکیب آئی جس پر میں نے عمل کیا اور آپ کو مسرت سے اطلاع دیتی ہوں کہ کامیابی بھی ہو گئی۔ میں نے مختلف ناموں اور پتوں پر اردو کے تیس ادیبوں اور شاعروں کے نام اسی قسم کے خطوط روانہ کئے تھے۔ ان میں سے پچیس کے جواب مجھ کو موصول ہوئے۔ بقیہ پانچ میں دو معذور تھے، اس لئے کہ ضعیف ہو چکے تھے اور تین شاید اس سے قبل کسی کامیاب تجربہ کے تحت مشق بنائے جا چکے تھے، اس لئے خاموش رہے۔ آٹھ بیسے کے عرصہ میں میرے پاس ادب اردو کے شاہکار جمع ہو گئے ہیں جن کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے انتظامات کر لئے گئے ہیں، عنقریب ایک کاپی آپ کی خدمت میں بھی بذریعہ وی۔ پی ارسال ہوگی جس کو وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ اطمینان رکھئے نام سب کے محفوظ ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو کبھی کبھی اپنی خیریت مزاج سے اطلاع دیتے رہے گا۔

ہم نے اس کے جواب میں ان کو مبارک باد کے ساتھ اطلاع دی کہ شکر ہے خدا کا ہم آپ کے پہلے تجربہ کی تکمیل میں کچھ مدد پہنچا سکے۔ اگر کسی تجربہ کی ضرورت لاحق ہو تو ہم اپنی خدمات کے ساتھ بخوشی تیار ہیں۔



امتحان ختم ہو چکا تھا اور اسی کے ساتھ بمبئی کی لطافتیں بھی ——— اس لئے ہم وطن واپس آ گئے لیکن شکستہ اور ناکام ——— آپ جانتے ہیں کہ سمندر کے اجزات بادل کی شکل میں اٹھتے ہیں اور گھٹاؤں کی شکل میں چھا جاتے ہیں یہاں تک کہ پہاڑ کے آغوش میں پہنچ کر برس پڑتے ہیں۔ بعینہ یہی حال جذبات کا بھی ہے ——— میرے دل میں گرجا تھی 'چمک تھی اور بھڑک تھی۔ محبت کی ایک چٹان خشک ہو چکی تھی۔ اس لئے روح بے چین تھی کسی دوسری ٹکڑے کے لئے ——— اب اس دوسری ٹکڑے کے واقعات بھی سنئے۔

شہر کے مرکزی مقام پر جلنے کے لئے ہم کو ایک نامعلوم کوچہ سے گزرنا پڑتا تھا۔ ایک روز ہم اس طرح جا رہے تھے کہ آنکھیں زمین پر تھیں اور خیالات دماغ میں۔ کہ ایسا کیا ہم کو محسوس ہوا کہ ہمارے سر پر ایک ہلکا سا پلندہ گرا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے گمراہی کا دن اٹھا کر اوپر دیکھا ——— آپ خود جانتے ہیں کہ ہندوستان میں پردے کے روایتی اصول کی بنا پر "عشق بیک نظر" ایک اہل اصول ہے اور ایک منہ و ستانی ہونے کے لحاظ سے ہم کس طرح متشنی ہو سکتے تھے۔ واقعی وہ صورت ملائکہ فریب تھی کہ ہم اس جگہ کی بارگی ٹھنک گئے۔ جس کو جانچنے کے لئے سائمنس کے آلات علی ضرورت نہیں بلکہ احساسات ہی بیک گراؤ دش چشمہ اس کی

موجودگی سے باخبر ہو جاتے ہیں چنانچہ باہم یک دگر نظریں مل گئیں اور ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ اس کے بعد ہم سڑک پر اکیلے کھڑے تھے اور اس بالاخانہ پر کوئی نہ تھا۔ چونکہ اکا دکا آدمی ادھر سے آ جا رہا تھا۔ اس لئے ہم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کاغذ کے پلندے کو جو ردی کے چند ٹکڑوں پر مشتمل تھا مال غنیمت سمجھتے ہوئے اٹھا کر چل دئے۔

ان میں کوئی خاص بات تو نہ تھی جن سے ہم کو کسی قسم کی مدد ملتی۔ وہ سب کے سب کسی رسالہ کے پھٹے ہوئے اوراق تھے، جن میں قیاس سے حکم لگایا جاسکتا ہے کہ بننے کے یہاں سے کوئی خیز بانڈھ کر لائی گئی ہوگی البتہ ایک امر تھا کہ جس کو میں اتفاق ہی سے تعبیر کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ ان میں میرے ایک مضمون کا پھٹا ہوا ورق بھی شامل تھا۔

فال نیک تھی اس لئے میں نے کئی روز وہاں کے چکر لگائے لیکن سوائے اس کے کہ چلن کے پیچھے کسی شے کی موجودگی کا احساس ہوا اور کچھ نہیں۔ البتہ میں وہاں پہنچ کر کالی کھانسی کا بیمار ہو جاتا تھا۔ کبھی میرا رومال گر جاتا تھا اور کبھی چھڑی۔ بعض اوقات میں مقابل کی سیڑھیوں پر اپنے جوتوں کے تسموں کو باندھ لگتا تھا، جو اتنے فاصلے کی مسافت میں اکثر ڈھیلے ہو جایا کرتے تھے۔ ایک روز میں بدستور ہاتھوں سے تسمے باندھ رہا تھا کہ یکایک چک کو حرکت ہوئی، اور میرے دل کو دھڑکن۔ لیکن میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ جس طرح شیر اپنی کپھار سے نکلتا ہے اسی طرح ایک بوڑھی عورت جاک اٹھا کہ سامنے کھڑی ہو گئی اور مجھ کو گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ یکایک میرا رنگ اڑ گیا اور میں نے اُٹا دیا ہی تھا کہ اپنے وجودنا مسعود کو اس خطرناک سرزمین سے تیزی اور سرعت کے ساتھ کسی گوشہ عافیت کی طرف منتقل کر دوں۔ لیکن اس

کے بیاختہ تہمتوں نے میرے قدموں کو زمین سے اس طرح چسپاں کر دیا جیسے گوند والے کاغذ پر پٹکی۔ اس کے بعد میری بدحواسی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ جب میں نے سنا کہ وہ میرا وہ نام لے کر پکار رہی ہے جو گھر کی چہار دیواری ہی تک محدود تھا۔ ہم سر پر پیر رکھ کر بھاگنے والے ہی تھے کہ وہ چند ہی منٹ میں ہمارے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ جب ہم نے اس کو قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ہمارے یہاں کی سابقہ ملازمہ تھی۔ چونکہ وہ ہم سے بہت بے تکلف تھی اس لئے ہم نے اس کو تمام کیفیت سے آگاہ کر دیا۔

اس نے ہنسنے ہوئے کہا کہ ”وہاں کوئی لڑکی ہی نہیں تھی۔“ مجھے غصہ آنے لگا۔ سوچ کر کہنے لگیں کہ ”ہاں دور در قبل تک تھیں“ — میرا دل دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر کہنے لگی ”وہی جو سرخ دوپٹہ اوڑھے تھیں، نازک سٹی — میں خوشی سے پھولنے لگا۔

”میاں وہ بڑی غصہ ور ہیں۔ وہاں داں نہ گلے گی۔“ میں مایوس ہونے لگا۔

”ان کے باپ بڑے غیرت دار ہیں ایک آدمی کو گولی مار دی تھی اسی جگہ میں تھر تھر کانپنے لگا۔

”ہاہ! بہو بیٹیوں کو تکنا بری بات ہے۔“ میں شرم سے پیسے پینے ہوئے لگا۔

اب ہم نے لیکچر دینا شروع کیا۔

”کوئی ہماری نیت خراب ہے۔“

”ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

”خود سے دیکھ کر کرنے میں کونسی برائی ہوگی۔“



ان دونوں کم بختوں کا نکاح کر دو۔ جو ان نے مشورہ دیا۔  
ہم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ضرور۔۔۔۔۔  
بزرگ نے سر ہلا دیا۔

اب ہم کو نہلایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد نکاح کے کپڑے پہنائے جا رہے تھے۔ اس کے بعد قاضی کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے بعد ہم کو باہر کے مکان میں لے جایا جا رہا تھا۔ آہ! یہ خواب تھا یا حقیقت! کیونکہ جس وقت ہم نے باسر قدم رکھا ہے تو مکان کو مہانوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا پایا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اتنی سرعت سے اس قدر مہانوں کا بندوبست کس طرح کیا گیا۔ جب جو اس ٹھکانے ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ تمام مہان ہمارے شہر کے عمارتیں ہیں اور ان میں سے بہت سے ہمارے دوست بھی۔ مسند پر بیٹھنے کے بعد ایک دوست جو ہم سے بہت بے تکلف تھے آکر شکایت کرنے لگے کہ تم نے اپنی شادی کا جھوٹا بھی تذکرہ نہ کیا اور سب کو کارڈ تقسیم کر کے۔ ہم ہی کو نہیں بلایا اور اس کے ثبوت میں وہ کارڈ نکال کر دکھانے لگے۔ اس کی جھلک دیکھتے ہی ہماری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ کیونکہ یہ تو وہی کارڈ تھے جو سیرنگ لفافہ کی طرح ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ لڑکی کا نام بھی وہی تھا، باپ کا نام بھی وہی تھا، تاریخ المیت تبدیل مگر دی گئی تھی اور جائے قیام بھی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

ہماری آنکھ کھلی ہے تو ہماری شادی ہو چکی ہے اور ہم اپنا سر رکھنے والے اسی کے زانو پر لیٹے ہوئے تھے جس نے ہمارے سر پر روئی کی گولی کا نشان بنایا تھا۔

موت اور شادی دونوں پر تلقین صبر کرنا چاہیے۔ کم از کم ہمارے حادثہ سے آپ کو ضرور ہمدردی ہوگی۔ لیکن چند ماہ کے بعد ہم کو معلوم ہوا کہ ہم واقعی خوش قسمت ہیں۔ ہمارے خسر نے اپنے خلاف تہذیب رویہ کی ہم سے معافی مانگی اور بیوی نے اپنے حسن اخلاق سے ہماری ان شک ستوں کی کردی۔ دراصل واقعہ یہ تھا کہ منہدوتان میں عالم طور سے اور مسلمان میں بھستو سے اگر جاہل ہو تو مشکل اور تعلیم یافتہ ہو تو مشکل۔ ہماری منکوحہ میٹرک تھیں اور اپنے والد کی اکوٹی صاحبزادی۔ لیکن خاندان کی فضا جاہل تھی۔ ان حضرات نے اس اصول پر کہ نہ خود کھاؤ نہ دوسرے کو کھانے دو اپنی دشمنی کا ثبوت اس طرح دیا کہ لڑکی کو بدنام کر دیا۔ اور اس کی شادی کو نامکن۔ ہم اپنے ایک دوست کے ہاں آتے جاتے تھے اور تعلیم کے متعلق اظہار خیالات کر چکے تھے۔

\_\_\_\_\_ وہیں لڑکی کے والد کی نگہ اتفاق سے ہم پر پڑی \_\_\_\_\_

اور جو چیز کہ جائز طور سے حاصل نہیں کی جاسکتی تھی عیاری اور زور سے کی گئی۔ رومی کی گولی کا نشانہ اسی لئے لگایا گیا تھا اور ہم کو ایک مہفتہ کے بعد اسی لئے بلایا گیا تھا تاکہ انتظامات کی تکمیل کے لئے وقت مل جائے۔ بہر حال ہر وہ حادثہ جس کا انجام اچھا ہو مبارک خیال کیا جاتا ہے۔



خوب صورت و خوب سیرت بیوی کے ساتھ عیش و مسرت سے گزارنے کا نام جنت ہے اور اس لحاظ سے ہم واقعی قابل مبارک یاد تھے۔ لیکن سلسلہ بھی اور دوسرے سلسلوں کی طرح منقطع ہوتا نظر آیا۔ کیونکہ ایک روز ڈاکیمنٹ نے ایک خط لکھ کر دیا جو ہماری بیگم کے نام تھا اور بیٹی سے آیا تھا۔ چونکہ مجھ کے کسی بیٹی کے عزیز یا دوست کا ابھی تک ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے میں نے

محض مذاق اور یافت کیا کہ یہ خط کس کا ہے۔  
میرے اس سوال پر میری بیگم کچھ گھبرا سی گئی اور فوراً ہی خود کو بٹھالتے ہوئے بولی کہ ”میری سہیلی کا ہے“ جن کا عقد بیٹی میں ہوا ہے۔ اس کے بعد میں نے اس کو پڑھنے کی اجازت طلب کی جس پر اس نے فوراً انھیں پھیر کر قطعی انکار کر دیا۔ ادھر میرا اصرار بڑھ رہا تھا اور ادھر اس کا انکار۔ یہاں تک کہ اس رسہ کشی میں وہ تو اپنی جگہ پر قائم رہی اور میں دوبارہ جا کر بیٹی میں گرا نیکیں تعلیم دوسرا مقصد تھا اور مکان سے دوری پہلا۔

(۶)

زندگی کے مغالطوں اور ستم ظریفیوں سے تنگ آ گیا تھا۔ بیگم کے خطوط میرے پاس آتے تھے لیکن میں جب کبھی دل چاہتا تھا رسمی طور سے جواب دیدیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ میرے لئے اور کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ البتہ میں اپنے بچس کے خطوط نکال کر پڑھ لیا کرتا تھا اور اس طرح اپنی مایوسیوں اور ناکامیوں کو پامال کر رہا تھا۔ آخر سنس جب مجھ میں یارائے ضبط نہ رہا تو میں نے ————— یارے چھڑ چلی جائے اسد —————

کے موصول پر اس خاتون کو ایک خط تحریر کر کے اپنے دل کی تمام کیفیات کا اظہار کر دیا۔ تقریباً دس روز کے بعد سلسلہ مراسلت دوبارہ شروع ہو گیا لیکن اب ایک دوست اور ناصح کی طرح سے۔ اس طرز عمل سے مجھ کو بے حد کوفت ہوئی۔ لیکن چارہ کار ہی کیا تھا۔ اس سلسلہ میں میں نے ایک مرتبہ ان خطوط کے مجموعے کی اشاعت کے متعلق بھی سوال کیا جس کے جواب میں مجھ کو انتظار کرنے کی فہمائش کی گئی۔

ایک روز مجھ کو اپنی بیگم کی طرف سے ایک نفاذ موصول ہوا جس کو

میں نے چاک کمر کے مٹوفہ خط کو نکالا۔ میں اس بات پر کس قدر متحیر ہوا ہوں کہ اس کی تحریر میری بیگم کے خط سے بالکل مختلف تھی۔ اور ہو بہو میسرے مرسلہ نگار خاتون سے ملتی جلتی تھی۔ خط کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ دراصل یہ خط بیگم کا لکھا ہوا نہیں تھا بلکہ اسی خاتون کا ہے تو وہ میرے وطن کس طرح پہنچ گئی لیکن مزید غور کرنے سے مجھے اپنی رائے بدلنا پڑی کیونکہ لفافہ کے اوپر میرا پتہ قطعی میری بیگم کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔

اب مجھ کو اس میں کوئی شک ہی نہ رہا کہ دراصل خاتون اور بیگم دو ہستیاں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ہیں اور اس عسلم نے میری رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ میں اب زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔

محض اس راز کے دریافت کرنے کے لئے میں یکا یک اپنی بیگم کے پاس پہنچا اور اس سے اس کی تفصیل کا سخت مطالبہ کیا۔ اس نے میرے خیال کی لفظ بلفظ تائید کی اور کھٹے الفاظ میں اقبال کر لیا کہ دراصل وہی مرسلہ نگار خاتون کا روپ بدلے ہوئے تھی۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ "کیوں اس نے مجھے اس قدر زبردست مخاطب کا شکار کیا؟"

"تاکہ آپ کے بڑھے ہوئے جذبات کی رو کو روکنے کے لئے ایک مضبوط چٹان کا کام دے سکے۔" اس نے مجھے جواب دیا۔

اور واضحی یہ درست بھی تھا۔ اگر خط و کتابت کے سلسلہ کی دلچسپی نہ رہتیں تو میں ضرور اپنا کیرئیر کھو چکا ہوتا اور انسانی ہوس پرستی کا شکار ہو گیا ہوتا۔ گو اس کا یہ فعل مجھ کو خود کے لئے محفوظ رکھنے کی نیت سے تھا لیکن تاہم میں نے اس کا شکر یہ ادا کیا۔

اس کے بعد میں نے اس بی بی سے آئے ہوئے خط کا راز دریافت کیا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ خط دراصل اس کی سہیلی جو بیگم کے خط وصول کر کے دوسرے لفافے میں رکھ کے پوسٹ آفس سے مجھ تک روانہ کر دیتی تھی اور اس طرح وہ مجھ میں اور مر اسلہ نگار خاتون یعنی میری بیگم میں ایک واسطہ کا کام انجام دیتی تھی۔ میں نے اس کے بعد اس سے مطالبہ کیا کہ شادی کے بعد ہی اس نے اس خاص راز کو دوسرے اور امور کے ساتھ کیوں نہ ظاہر کر دیا۔ اس کا اس نے یہ جواب دیا کہ میں دراصل یہ جاننا چاہتی تھی کہ آپ کو مر اسلہ نگار خاتون سے واقعی عشق ہے یا یہ خطوط محض ادبی سرگمزیں ہی تھیں میں ابھی تک کسی راز سے پر نہیں پہنچی۔ کیونکہ میری ایکم ابھی مکمل نہیں ہونے پائی تھی کہ راز طلشت از بام ہو گیا اور وہ اس طرح کہ میں نے دو خطوط تحریر کئے تھے۔ اور دونوں مختلف انداز تحریر میں اور اس کی مجھ کو کافی مشق ہے۔

ایک خط خاتون کی طرف سے اور دوسرا اپنی طرف سے۔ خاتون کا خط میں اپنی سہیلی کو روانہ کرنا چاہتی تھی تاکہ وہاں سے آپ کی طرف بھیج دیا جائے اور اپنا خط براہ راست آپ کو روانہ کرنا چاہتی تھی لیکن مجھ کو خود ایک شدید مغالطہ ہوا۔ اور وہ یہ کہ آپ کا خط اپنی سہیلی کے لفافے میں رکھ دیا اور خاتون کا خط آپ کے لفافے میں۔

شکر ہے کہ مغالطوں کا یہ لامتناہی سلسلہ ٹوٹ چکا ہے اور اب ہم ازدواجی زندگی کی مسرتوں کے مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ہم آپ کو رائے دیتے ہیں کہ آپ بھی کہیں منسلک ہو جائیے اور اپنی زندگی کو تنہا بسر کر کے مریض خطر میں نہ ڈالئے۔

سعید ابوطاٹ۔ بی۔ ایس۔ سی۔ لک

سید وحی اشرف چشتی مالک کتب خانہ علم و ادب نے دہلی نے  
یہ علمی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا









